

باز آؤ اور زندہ رہو

حنیف رامے

زندہ کتابیں

انفرادی، معاشرتی اور ملی مسائل پر مضامینِ نو کا ایک انبار
جو افراد، معاشرے اور ملت کو خلقِ جدید کی دعوت دیتا ہے

3.00

مکتبۂ جدید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باز آؤ اور زندہ رہو

" جس طرح نبوت مانگے سے نہیں ملتی ، خدا کی دین ہوتی ہے شاید سوچ کا سیلاب بھی انسان کے گھر غیب سے بھیج دیا جاتا ہے چنانچہ حنیف رامے کو بھی خیال کے گھیرے ، گونجتے ، خون آشام زمنوں میں سرگردان کر دیا گیا کہ میاں ! مزے سے تصویریں بناتے تھے اور آوارگی و عاشقی کے لذت کیش تھے ذرا رنج رائیگاں بھی کھینچو ؛ یہ سیر بھی دیکھو کہ جو کچھ ہے وہ کیا ہے اور ہونا کیا چاہیے تھا اور وہ ہوتا کیوں نہیں اور ہو کیسے سکتا ہے ۔

" کسانوں کے اس سادہ دل بیٹے نے ہل کی انی سے زمین شگافی کے بجائے قلم کی نوک سے کاغذ خراشی کرتے ہوئے ہمیشہ ایک درد محسوس کیا ہے ؛ اس لیے نہیں کہ اسے عرض ہنر میں خاک فائدہ نظر نہیں آتا ، اس لیے کہ خیال کی کھیتی اس ہٹ بیتے اصول کی بار بار نفی کرتی ہے کہ جو بوؤ گے سو کاٹو گے ۔ وہ بوتا کچھ ہے ، اُگتا کچھ ہے ۔ خیال کے بیجوں کا یہی مقدر ہے کہ اُن پر ان دیکھے نتائج کے پھول آتے ہیں جو حیران کر دیتے ہیں ، قدموں تلے کی زمین سرکا دیتے ہیں ، اندیشہ ہائے دور و دراز میں ڈال دیتے ہیں ۔

" حنیف رامے کی ہر تحریر اس کے لیے موت کا ایک سفر ہوتی ہے ۔ بس یہ امید اس کے لیے تازیانہ ہے کہ جس طرح موت کے ذائقے میں خلق جدید مستور ہے شاید اس کی واماندگی بھی کسی ہم سفر کے لیے تازہ دمی کا باعث بن جائے ۔"

محمد حنیف رامے

حکمت نے اپنا گھر بنا لیا
اُس نے اپنے ساتوں ستون تراش لیے
اُس نے اپنے جانوروں کو ذبح کر لیا اور اپنی مے تیار کر لی
اُس نے اپنا دسترخوان بھی چن لیا
اب اُس نے اپنی سہیلیوں کو بھیجا ہے
اور خود بھی شہر کی اونچی جگہوں سے پکارتی پھر رہی ہے:

جو سادہ دل ہے ادھر آ جائے
جسے دانش چاہیے ادھر آ جائے

وہ کہتی ہے:

آؤ میری روٹی میں سے کھاؤ
اور میری ملائی ہوئی مے میں سے پیو
اے سادہ دلو! باز آؤ اور زندہ رہو

(توراتِ مقدس — امثال)

حنیف رامے

باز آؤ اور زندہ رہو

کچھ زم گرم باتیں

مکتبۂ جدید ۔ لاہور

پہلی بار ——— ۱۹۶۵ء
ناشر ——— رشید احمد چودھری
طابع ——— مکتبہ جدید پریس، لاہور

اپنی صاحبہ:

سیّدہ شاہین کے نام

ترتیب

چاندنی کے بیج

دھوپ کا سائبان

پیش لفظ

۱۹۵۲ء میں اقتصادیات کا ایم اے کرنے کے بعد جب میں نے زندگی میں قدم رکھا تو یہ بات میرے جاننے والوں کے لیے تعجب انگیز تھی کہ میں نے کہیں ملازمت وغیرہ کرنے یا کاروبار کھولنے کے بجائے مصوّری کو اپنا کام سمجھا ہے حالانکہ مصوّری کی ابجد سے بھی میں شناسا نہیں۔ یُوں ایک آدھ سال پہلے تک مجھے بھی علم نہ تھا کہ میرا یہ انجام ہوگا۔ پچھلے تین چار سال سے میں لکھنے لکھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ لیکن جب مصوّری کا جنون سوار ہُوا تو مُوقلم کے آگے قلم نے گھٹنے ٹیک دیے۔ اس عرصے میں ایک بات یہ ہُوئی کہ مصوّروں میں بُرا بھلا پڑھا لکھا ہونے کی بناء پر فن کے بارے میں مجھ سے یہاں وہاں سوالات ہوتے رہتے تھے۔ پھر مجھے ہمیشہ سے احساس رہا ہے کہ مختلف فنون یا فنون اور علوم باہم کٹے ہوتے نہیں بلکہ ہم رشتہ ہیں۔ میری دوستی بھی مصوّروں کے مقابلے میں لکھنے لکھانے والوں سے تھی اور ان سے بھی زیادہ اُس انسان سے تھی جسے یہ سودا ابھی نہ تھا۔ میں کہیں یہ بھی کہہ چکا ہوں کہ مصوّری کی نسبت مجھے مُوسیقی اظہار کا زیادہ مُوثر ذریعہ محسوس ہوتی ہے۔ کچھ اسی ڈھب کی آزادہ روی نے مجھے یہ جرأت دلائی کہ جب مجھے ایک ادبی جریدے "سویرا" کی ادارت پیش کی گئی تو میں نے اسے حرام نہ سمجھا۔ "سویرا" کے اداریے ایک طرح سے میری پہلی تحریریں تھیں۔ اس سے پہلے، جب میں لکھنے

کے بارے میں سوچتا تھا، میں فسانہ طرازی کے ارادے باندھا کرتا تھا لیکن اب مجھے فن کے بارے میں اپنے خیالات کو تحریری قالب دینے کا موقع ملا تھا۔ یہ سلسلہ بعد میں ہفت روزہ 'نصرت' کے 'ماہنامہ' کے اداریوں کی صورت میں جاری رہا۔ فن کے مسائل سے متعلق یہ مضامین اس مجموعے میں شامل نہیں۔

اِس مجموعے میں وہ مضامین ہیں جو میں نے 'نصرت' کے مدیر کی حیثیت سے لکھے۔ اس میں دسمبر ۱۹۵۸ء سے جولائی ۱۹۶۲ء تک کے اداریوں کا انتخاب ہے۔ اس انتخاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں تمثیلی نوعیت کے مضامین ہیں، ان میں جانے اَن جانے طور پر ادب سے میری دلچسپی نے رنگ دکھایا ہے اور بات، جو بنیادی اعتبار سے انفرادی اور معاشرتی مسائل سے متعلق ہے، تمثیل کے رُوپ میں سامنے آئی ہے۔ دوسرے حصے کے مضامین میں، جو معاشرتی اور قومی مسائل سے متعلق ہیں، بات کو دلیل کی رفاقت میں پیش کیا گیا ہے۔ دلیل سے میری دلچسپی فن ہی کے وسیلے سے آگے چلی ہے۔ فن پر سوچتے سوچتے کچھ کچھ فلسفے سے رغبت ہوئی اور فلسفے نے دین کی راہ پر ڈال دیا۔ اس ضمن میں میرا مسلک یہ ہے کہ فنکار، فلسفی، بلکہ سائنسدان، سب ایک طرح سے دین ہی کے خدمتگار ہوتے ہیں کیونکہ یہ لوگ دیکھنے دکھانے، سوچنے سمجھنے اور چھاننے پھٹکنے کا کام کر کے خدا کی آیات ہی کی تشہیر کرتے ہیں۔

حنیف رامے

چاندنی کی سیج

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

(الحشر : ۲۱)

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِ أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا

(البقرۃ : ۲۶)

پہلا حصہ

عمل یا فریبِ عمل

صبح ہو رہی ہے۔
یک لخت آپ کے سرہانے رکھے ہوئے ٹائم پیس کی گھنٹی گونجتی ہے اور آپ رضائی جھٹک کر بستر سے نکل جاتے ہیں۔ نیند سے بوجھل آنکھیں ابھی کھلنا نہیں چاہتیں لیکن آپ کا ہاتھ جانتا ہے کہ موٹے شیشوں کی عینک کہاں پڑی ہے۔ دوسرے لمحے عینک آپ کے چہرے پر ہوتی ہے اور آپ غسل خانے کا دروازہ کھول رہے ہوتے ہیں اور ملازم کو آواز دے رہے ہوتے ہیں کہ ذرا پانی تو گرم کر دے۔ لیکن ساتھ ہی خیال آتا ہے کہ اتنے میں اخبار ہی دیکھ لیں۔ آپ ڈیوڑھی سے اخبار اٹھانے چل دیتے ہیں۔ باہر سُورج آپ کو اپنی طرف دیکھنے، متوجہ ہونے کی دعوت دیتا ہے لیکن آپ کی نیم بند آنکھیں اُس کی جانب نہیں دیکھتیں۔ اُس طرف دیکھنے کی ان میں تاب ہے نہ فرصت لیکن اخبار کی شہ سُرخی دیکھتے ہی یہ ایسے کھل جاتی ہیں کہ پھر رات گئے تک بند نہیں ہوتیں۔ اخبار کی سُرخیوں کے ساتھ ساتھ آنکھیں دوڑتی اور دل دھڑکتا رہتا ہے۔ اتنے میں ملازم گرم پانی کا مژدہ سُناتا ہے۔ آپ شیو کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اخبار اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ چہرے پر دو ایک چرکے بھی لگ جاتے ہیں لیکن آپ پروا نہیں کرتے۔ شیو ختم ہوتے ہی آپ اخبار میز پر پٹک کر غسل خانے میں گھس جاتے ہیں۔ پھر کپڑے بدلتے ہیں اور ناشتے

کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔میز پر آپ کی بیگم اور بچے بھی موجود ہوتے ہیں لیکن آپ اخبار ختم کرنے میں جُٹے رہتے ہیں، ساتھ ساتھ ناشتہ بھی چلتا رہتا ہے۔اچانک آپ گھڑی کی طرف دیکھتے ہیں تو نو بجنے میں نو منٹ باقی ہوتے ہیں (دفتر کا راستہ بیس منٹ کا ہے) اندر کا نوالہ اندر اور باہر کا باہر رہ جاتا ہے اور آپ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

سڑکوں پر سائیکلوں، تانگوں اور بسوں سے بچتے بچاتے جب آپ دفتر پہنچتے ہیں تو کمرے میں ملاقاتیوں کی قطار اور میز پر فائلوں کا انبار آپ کے منتظر ہوتے ہیں۔آپ ان میں ڈوب جاتے ہیں۔سورج پہلو بدل بدل کر کبھی اِس روشندان، کبھی اُس دروازے سے اندر جھانکتا ہے لیکن آپ کی مصروفیت ختم نہیں ہوتی۔آخر سورج بھی ڈوب جاتا ہے۔اب شام ہو رہی ہے۔آپ جلدی جلدی ساتھیوں اور ماتحتوں سے دو چار آخری باتیں کرتے ہیں اور گھر کا راستہ پکڑتے ہیں۔گھر پہنچتے ہیں تو آپ کی بیگم صاحبہ اطلاع دیتی ہیں کہ گول کمرے میں فلاں صاحب اور اُن کی بیگم تشریف رکھتے ہیں۔آپ وہیں کے وہیں اُن کے پاس جا بیٹھتے ہیں۔ یہ لاؤ، وہ لاؤ ہوتی رہتی ہے اور شام گہری ہوتی رہتی ہے۔یہ لوگ اُٹھتے ہیں تو کوئی اور صاحب تشریف لے آتے ہیں یا آپ کی بیگم صاحبہ کو خیال آتا ہے کہ ایک عرصے سے فلاں صاحب کے یہاں نہیں گئے، چلئے لگے ہاتھوں ان سے مل آئیں۔ وہاں سے پلٹتے ہیں تو بچے سو چکے ہوتے ہیں۔اب آپ کپڑے بدلتے ہیں چائے پی پی کر اگرچہ پیٹ میں گنجائش تو نہیں ہوتی لیکن آپ دو چار لقمے زہر مار کر ہی لیتے ہیں۔پھر چند ضروری خط لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔بیگم صاحبہ لیٹنے کے لیے کتنے کتنے

سو جاتی ہیں اور "آپ ابھی آیا" کہتے کہتے وہیں بیٹھے رہتے ہیں ـــ اور رات گہری ہوتی رہتی ہے۔

حرکت میں برکت ہوتی ہے۔

لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ صرف اسی حرکت میں برکت ہوتی ہے جو انسان کو آگے بڑھائے۔ وہ حرکت جو روزمرہ بن جائے، ایک دائرہ بن جائے وہ آہستہ آہستہ جمود کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے ـــ ویسے ہی جیسے یہ ہماری زمین ہر لمحہ حرکت کر رہی ہے لیکن ہمارے لیے اس کی حرکت کا احساس مٹ چکا ہے۔ مصروفیت بے عملی بھی ہو سکتی ہے۔ مصروفیت وقت کو آگے بڑھنے کا راستہ بنانے کے بجائے اُسے موت بھی بخش سکتی ہے، ایک نشہ بھی بن سکتی ہے۔

ایک شخص ممکن ہے دن بھر مصروف رہتے ہوئے بھی زندگی میں ایک قدم آگے نہ بڑھے، اُس کی شخصی تعمیر میں ذرّہ برابر فرق نہ آئے، اُس کے علم میں ذرّہ برابر اضافہ نہ ہو، اس کے کردار میں ذرّہ برابر روشنی پیدا نہ ہو۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ دن رات کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کے باوجود دس سال، سو سال بعد انھیں اچانک احساس ہوتا ہے کہ اس سارے عرصے میں کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ یہ بظاہر جو حکومتیں دن رات ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں تھیں، یہ بظاہر جو سینکڑوں ہزاروں افسر ملک کی خدمت کر رہے تھے، ہزاروں لاکھوں تاجر اور صنعت کار اور مزدور ملک کی آمدنی میں اضافہ کر رہے تھے، اس سب مصروفیت نے ملک کو ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھایا۔

یہ ٹھیک ہے کہ زندگی کے چند حصے انسانوں اور قوموں سے شب و روز

مصروفیت کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن محض مصروفیت سے سچے معنی میں عمل وجود میں نہیں آتا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک آہستہ رَو انسان دن بھر میں ایک ایسا کام ضرور کرے جو اس کی زندگی، اس کی قوم کی زندگی کے لیے کوئی معنی، کوئی قیمت رکھتا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک تیزرَو انسان انتہائی مصروفیت کے باوجود زندگی بھر ایک بھی ایسا کام نہ کرپائے جو اس کے لیے یا اس کی قوم کے لیے کوئی معنی، کوئی قیمت رکھتا ہو۔

ہر وقت تنے ہوئے رسے پر چڑھے رہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ زندگی جنت بھی بن سکتی ہے لیکن اس کے لیے آرزو، اپنے ذرائع کے صحیح صحیح اندازے اور ٹھوس عمل کی ضرورت ہے —— نری مصروفیت کی ضرورت نہیں —— فریب عمل کی ضرورت نہیں۔

غلطی کا تعاقب

صبح دفتر جانے سے پہلے، آپ نے اپنے کمرے کو تالا لگا دیا تھا لیکن جب شام ہوئی اور آپ گھر لوٹے تو چابی غائب تھی۔ آپ نے کوٹ کی تمام جیبیں دیکھ ڈالیں، پتلون کی تلاشی لی، قمیص کی جیب میں بھی جھانک لیا لیکن چابی نہ ملی۔ کپڑوں کی از سر نو چھان پھٹک کے بعد انھیں جھاڑ کر بھی دیکھ لیا لیکن چابی نہ ملی۔ اب آپ نے گھر کا جائزہ لینا شروع کیا، ایک ایک کمرہ، ایک ایک الماری، ایک ایک کونا، کھدرا ــــ سب چھان مارا، آپ تھک ہارے لیکن چابی نہ ملی۔

اب آپ کے پاس چابی ڈھونڈنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک تو یہ انتظار کہ شاید کبھی، لاشعوری طور سے، اچانک یاد آجائے گا کہ چابی کہاں رکھی تھی۔ لیکن اس طریقے پر بھروسا تو نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کو فوری طور سے کمرہ کھولنے کی حاجت ہو اور لاشعور سے چابی کی اطلاع شعور میں دو گھنٹے یا دو دن یا دو مہینے بعد پہنچے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کبھی نہ پہنچے۔ زیادہ قابلِ اعتماد صورت یہ ہے کہ آپ اطمینان سے بیٹھ کر یہ سوچیں کہ آپ دن بھر کیا کرتے رہے ہیں، کہاں کہاں گئے ہیں۔ اس کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ آپ اُلٹی طرف سے یاد کرنا شروع کریں کیونکہ اس طرح قریب کی باتیں پہلے اور بعد کی

باتیں بعد میں سلسلہ وار یاد آتی جائیں گی۔ چلئے ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔ آپ گھر میں داخل ہونے سے پہلے سائیکل پر سوار تھے۔ راستے بھر آپ کہیں نہیں رُکے، دفتر کے باہر بیٹھے ہوئے پان فروش سے آپ نے سگریٹ لیے تھے لیکن اس سے تو آپ کا حساب چلتا ہے اس لیے جیب میں ہاتھ ڈالنے، یا کچھ نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چلئے اب دفتر کے اندر چلیں۔ لیکن آپ نے تو صبح جاتے ہی کوٹ اُتار کر کرسی کی پُشت پر ٹانگ دیا تھا اور آتے ہوئے پہنا تھا، دن بھر تو اُسے چھُوا بھی نہیں۔ تو کیا گھر سے دفتر جاتے ہوئے کہیں رُکے تھے؟ — ہاں درزی کے یہاں رُکے تھے۔ اُس نے کئی روز سے کپڑے دینے کا وعدہ کر رکھا ہے لیکن دے ہی نہیں چکتا۔ تو کیا اُس کی دکان کے اندر گئے تھے؟ ہاں گئے تھے اور اس وقت چابی کی زنجیر آپ کے ہاتھ میں تھی، آپ اس سے کھیل رہے تھے۔ تو کہیں چابی درزی کی میز پر ہی تو نہیں رکھ دی؟ شاید نہیں ضرور۔ آپ نے آزمائشاً کچھ ٹنکے ہوئے کپڑے پہن کر دیکھے تھے اور درزی کی دکان سے نکلتے ہوئے میز سے چابی اُٹھانا بھول گئے تھے۔ اگر جلدی ہو تو ابھی وہاں سے دریافت کروالیں ورنہ صبح جاتے ہوئے خود ہی پُوچھ لیں، چابی مل جائے گی۔

یہ آپ کے ایک دن کی غلطی ہے اور آپ کے ذہن نے دن بھر کی تاریخ کا جائزہ لے کر، اس غلطی کا تعاقب کر کے، آپ کو اس سے آگاہ کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر آپ اپنی پوری زندگی کا جائزہ لیتے رہیں، اپنا احتساب کرتے رہیں کہ آپ کہاں سے چلے اور کہاں کہاں گئے تھے تو ہو سکتا ہے آپ کو اپنی بہت سی غلطیوں سے آگاہی ہو جائے اور آپ آئندہ ایسی صورت پیدا نہ ہونے دیں۔

ہم نے زندگی بھر جو کھویا ہے اس کے پیچھے چھوٹی بڑی غلطیاں پوشیدہ ہیں ۔ حافظے کی غلطیاں ، طرزِ عمل کی غلطیاں ۔ آئندہ کے استقلال کے لیے اپنی زندگی کے تاریک پہلوؤں سے شناسا رہنا نہایت ضروری ہے ۔ اگر ہم زندگی کے راستے میں کوئی موڑ غلط مُڑ گئے ہیں تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ اس غلطی سے واقف ہوں تاکہ منزل تک پہنچنے کے لیے موجودہ راستے میں مناسب ترمیم کر لیں ؛ اور اگر اس میں اب ترمیم ممکن نہیں تو پھر سے اپنا سفر شروع کر دیں ۔ یہ بجا ہے کہ ہماری غلطیاں بعض اوقات خود بخود ہم پر آشکار ہو جاتی ہیں لیکن چابی ڈھونڈنے کی طرح یہاں بھی یہ طریقہ قابلِ اعتماد نہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ ہم ایسے موقع پر اپنی غلطی سے آگاہ ہوں جب اس غلطی کی وجہ سے ہم خوب نقصان اُٹھا چکے ہوں ۔ اس لیے بہتر راستہ یہی ہے کہ ذہن کی مدد حاصل کی جائے اور اپنے راستے کا جائزہ لیا جائے کہ کہاں سے چلے اور کہاں کہاں گئے تھے ۔

یہی کیفیت قوموں کی ہے ۔ قومیں بھی اپنی زندگی میں غلطی کرتی ہیں اور ایسی ایسی غلطی کہ بڑی سے بڑی قوم پر تنزل اور گمنامی کے اندھیرے چھا جاتے ہیں ۔ اپنی غلطیوں سے آگاہی کے لیے قوم کے پاس بھی یہی ہتھیار ہے کہ وہ اپنی زندگی کی تاریخ سے آگاہ رہے ——— پھر یہ حوصلہ بھی ہونا چاہیے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا جائے اور اگر منزل تک پہنچنے کے اعتبار سے اپنے موجودہ راستے میں تبدیلی کی ضرورت ہو تو یہ تبدیلی اختیار کر لی جائے ۔ اور اگر یہ علم ہو جائے کہ موجودہ راستہ ایک اندھی گلی ہے ، اس راستے پر چلتے ہوئے منزل ہاتھ نہ آئے گی تو اُسے یکسر بدل دیا جائے ، از سرِ نو سفر کا آغاز کرنے کی ہمت کی جائے ۔

ہر شخص بچپکے سے یہ تو کہہ دیتا ہے کہ انسان غلطی کا پُتلا ہے لیکن اپنی غلطی ڈھونڈنے کی کوشش کم ہی کرتا ہے اور اگر غلطی ڈھونڈ بھی لے یا اُسے اس کا علم بھی ہو جائے تو اس کی درستی کرنے کی خواہش اس سے بھی کم ہوتی ہے۔ قوم کا مسئلہ اور بھی ٹیڑھا ہے۔ پُوری کی پُوری قوم بہت دیر میں اپنی غلطی، بے راہ روی سے واقف ہوتی ہے۔ اور راستہ بدلنے کا مسئلہ تو دشوار تر ہے لیکن اس کے بغیر منزل تک پہنچنے کا کوئی اور چارہ بھی نہیں۔

تاریخ کا نشہ

بوڑھے میاں بستر پر گاؤ تکئے کے سہارے نیم دراز ہیں۔ آنکھیں کھلی کم اور بند زیادہ ہیں، ایک ہاتھ میں حقے کی نے ہے، دوسرے سے چائے کی پیالی تھام رکھی ہے۔ اُن کے گرداگرد کرسیوں پر تین چار مصاحب نما حضرات براجمان ہیں۔ کمرے میں بجلی کی انگیٹھی لال انگارہ سی دہک رہی ہے، خشک میووں کی ریل پیل ہے۔ بوڑھے میاں ماضی کے اوراق پلٹ رہے ہیں:

"تو جنابِ عالی، پھر یوں ہوا کہ بوڑھے جرنیل نے موقع کی نزاکت بھانپ کر ایک بھرپور وار کرنے کی ٹھانی۔ وہ سیماب صفت گھوڑے پر شیرِ نر کی طرح چوکنا ہو کر بیٹھ گیا، آنکھیں چاروں طرف گھوم رہی تھیں، ایک ہاتھ میں ننگی تلوار تھی، دوسرے سے گھوڑے کی باگ تھام رکھی تھی۔ گرداگرد جانباز سینہ سپر تھے۔ سورج کی گرمی سے زبانیں لٹک رہی تھیں۔ مجاہدوں کے منہ میں روزہ تھا..."

بوڑھے میاں اچانک رُک جاتے ہیں۔ مصاحبوں کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے، وہ کمرے سے نکل جاتے ہیں۔ بوڑھے میاں آہستہ آہستہ اپنے گرد لپٹی ہوئی رضائی کی تہیں کھولتے ہیں اور فرش پر قدم دھرتے ہیں، پلنگ کے نیچے رکھے ہوئے برتن کو باہر کھینچتے ہیں، اُس کا ڈھکنا اُٹھاتے ہیں، پیشاب کرتے ہیں، ڈھکنا واپس رکھتے ہیں، برتن اپنی جگہ پہنچاتے ہیں اور بستر پر سوار ہو جاتے ہیں۔

مصاحبین کو دوبارہ یاد کیا جاتا ہے، کمرے میں داخل ہوتے ہی بوڑھے میاں کو داد دی جاتی ہے کہ اُنھوں نے اچھا کیا ورنہ سردی میں گول کمرے سے غسل خانے تک جانے میں خواہ مخواہ گرم سرد ہونے کا اندیشہ تھا - بوڑھے میاں اس داد کو شرفِ قبول بخشتے ہوئے اپنی بات کا سرا تلاش کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں ۔۔
" تو جناب عالی، پھر یوں ہوا کہ بوڑھا جرنیل . . . . "

ہم یہ سنتے اور دیکھتے آئے ہیں کہ انسان عجیب عجیب نشوں میں مدہوش رہتے ہیں۔ شراب، افیم، چرس، بھنگ، بدنام نشوں میں یہ جانے پہچانے ہیں کچھ زیادہ دلچسپ نشے بھی ہیں، مثلاً طاقت کا نشہ، دولت کا نشہ، جوانی کا نشہ، آنکھ کا نشہ ۔ لیکن ہمارے بوڑھے میاں کو ایک اور ہی طرح کا نشہ ہے ۔۔ اس کا نام ہے تاریخ کا نشہ۔ یہ نشہ کچھ انھی کی دریافت نہیں ہے، لاکھوں افراد بلکہ قوموں کی قومیں اس کی اسیر ہیں اور کچھ قوموں نے تو اسی میں مستقل جائے امان ڈھونڈ رکھی ہے۔

یہ بجا ہے کہ زندگی میں ایسے واقعات ضرور ہوتے ہیں جو دوسروں کے لیے رشک اور ہمارے لیے فخر کا باعث ہوں لیکن زندگی میں ایسی غلطیاں اور لغزشیں بھی ضرور ہوتی ہیں جو بے شک دوسروں کی آنکھ سے اوجھل ہوں لیکن یا تو ہمارے علم میں ہوتی ہیں یا ضرور ہونی چاہئیں تاکہ زندگی کا سفر ہمیں بے راہ نہ کرے۔ اپنی تاریخ سے واقفیت کے ذریعے جہاں ہمیں اپنی کامرانیوں پر خوش ہونے کا موقع ملتا ہے اور کامرانیوں کی وجہ ہمارے سامنے آتی رہتی ہے وہاں ناکامیوں پر پشیمانی اور اُن کی وجہ ڈھونڈنے کی خواہش بھی پیدا ہوتی ہے۔

یہی کیفیت قوموں کی ہے۔ اگر تاریخ کا مطالعہ افراد یا اقوام کے لیے لے دے کر محض یہ رہ جائے کہ ہم اپنی تاریخ کے اُن واقعات کو تو حرزِ جاں بنالیں جن پر فخر کیا جا سکتا ہے اور یہ بھول جائیں کہ اگر ہم کامیاب ہوئے تھے تو کیوں، یا ہمیں یہ یاد نہ رہے کہ ہم ناکام بھی ہوئے تھے اور ہماری ناکامی کی وجہ کیا تھی تو یہ تاریخ دانی ہے نہ تاریخ فہمی نہ تاریخ سے دلچسپی بلکہ یہ تاریخ کا نشہ ہے ـــ تاریخ کا سراسر ناجائز استعمال۔

اِس نشے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انفرادی طور سے جس شخص نے زندگی میں کبھی کوئی بھلا کام کیا ہوتا ہے وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور باقی عمر اپنے اس کارنامے کی داد وصول کرنے یا اس مزے کو یاد کرنے میں صرف کر دیتا ہے جو اس کام سے وابستہ ہے۔ کسی نئے کام میں اس کا جی ہی نہیں لگتا۔ اُسے بس اشارہ چاہیے اور وہ حال اور مستقبل کو خیرباد کہہ کر اپنے درخشاں ماضی کی دُھند میں کھو جاتا ہے۔

اِسی طرح جس قوم نے کبھی انسانی تاریخ کا کوئی صفحہ اپنی جدوجہد سے روشن کیا ہوتا ہے وہ تاریخ کے نشے کے تحت بآسانی آئندہ کے لیے اپنے پُرانے کارنامے پر تکیہ کر لیتی ہے اور اس مزے میں ایسی گُم ہوتی ہے کہ مستقبل کی تاریخ میں اس کے ماضی کا وہ صفحہ یُوں گُم ہو جاتا ہے جیسے وہ تھا ہی نہیں۔

تاریخ یقیناً مزے کی چیز ہے لیکن اس کا مزہ نشہ کم، کڑوی دوا کی طرح ہے ـــ دوا جو افراد اور اقوام کی لغزشیں بھی عیاں کرتی ہے اور عمل کی دعوت بھی دیتی ہے۔

ہنستا ہُوا توا

ماں روٹیاں اُتار رہی ہے۔ بچے اس کے گرد اگرد بیٹھے ہیں۔ سب کی نظریں توے پر جمی ہیں۔ نئی روٹی اُترتے ہی کھانے والوں میں جوش کی نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے روٹی لقمہ لقمہ ہو جاتی ہے۔ دوسری روٹی میں ابھی وقفہ ہوتا ہے کہ پہلی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن بھوک جو شروع شروع میں مٹتی ہی نہ دکھائی دیتی تھی، آہستہ آہستہ رام ہونے لگتی ہے اور ہاتھ سُست پڑ جاتے ہیں۔ اب اندر ہی اندر انتظار ہونے لگتا ہے کہ کوئی بس کہنے کی ہمت کرے تو باقی بھی اپنی بہت ہی زیادہ بھوک کے دعوے سے دست بردار ہوں۔ ماں اصرار کرتی رہ جاتی ہے کہ کیا کھایا ہے تم نے، ذرا ذرا سے تو پھلکے تھے لیکن ایک ایک کر کے چھوٹے بڑے سب میدان چھوڑ جاتے ہیں — میدان تو چھوڑ جاتے ہیں لیکن باورچی خانہ اب بھی نہیں چھوڑتے۔ ابھی انھیں ایک تماشا دیکھنا ہے: توے کا تماشا۔

جب ماں سب کے لیے روٹی پکا چکتی ہے تو توے کو آگ سے اتار کر چُولھے کے سرہانے دیوار سے لگا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ توے کا مُنہ دیوار کی طرف اور کالک سے اَٹی ہُوئی اس کی پُشت سامنے کی طرف ہے۔ اس کالک پہ روشن روشن چلتی چنگاریوں نے ایک میلہ سا لگا رکھا ہے۔ کبھی یہ ایک طرف کو چلنا شروع ہو جاتی ہیں تو کبھی دوسری طرف کو، کبھی یہ پھیلتی چلی جاتی ہیں تو کبھی ایک جگہ سمٹ جاتی

ہیں۔ ایک کہتا ہے، اندھیری رات میں یہ کسی کی برات جا رہی ہے جو اگر راستے سے بھٹک جاتی ہے تو باہم مشورہ کر کے پھر سے اپنا سفر شروع کر دیتی ہے۔ دُوسرا کہتا ہے، یہ تو آسمان پر کہکشاں ہے۔ تیسرا کہتا ہے، یہ ستارے ہیں جو آپس میں کھیل رہے ہیں، کیوں ماں! کیا کھیل رہے ہیں یہ — آنکھ مچولی؟ اب ایک نئی بحث شروع ہو جاتی ہے کہ ستارے کیا کھیل رہے ہیں۔ ہر کوئی جا ہتا ہے کہ سہرا اسی کے پسندیدہ کھیل کے سر رہے۔ آخر ماں فیصلہ کرتی ہے کہ یہ کوئی کھیل وِیل نہیں ہو رہا بلکہ توا ہنس رہا ہے۔ بچّوں میں ابھی معصومیت باقی ہے وہ سوال پُوچھنے سے ڈرتے نہیں۔ چُنانچہ ماں کو بتانا پڑتا ہے کہ توا کیوں ہنس رہا ہے۔

توا اس لیے ہنس رہا ہے کہ وہ خوش ہے۔ وہ اس لیے خوش ہے کہ اس پر روٹی پکتی ہے، روٹی اس لیے پکتی ہے کہ ماؤں کے بچے کھائیں اور پھولیں پھلیں۔ جب توا یہ دیکھتا ہے کہ اس کی محنت ٹھکانے لگ رہی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اور ہنستا ہے۔ توا ہنسے تو سمجھو دُنیا میں خوشحالی ہے، امن ہے، چین ہے، لوگ رات کو بھُوکے نہیں سوتے اور اگر کبھی توا نہ ہنسے تو ڈرنا چاہیے۔ اللہ سے دُعا کرنی چاہیے کہ اپنی مخلوق پر اپنی رحمت کا سایہ رکھے۔

بچّے توا ہنسنے کا سوال پُوچھ کر، اس کا جواب سُن کر، مطمئن ہو کر سونے کے لیے چل دیتے ہیں لیکن ماں کے دل میں ایک اور ہی سوال، اندھیری رات میں راستے سے بھٹکی ہُوئی برات کی طرح پھیلتا اور سکڑتا ہُوا سوال سر اٹھا رہا ہے اور سونے نہیں دے رہا کہ آخر یہ توا کبھی کبھی ہنسنا کیوں بند کر دیتا ہے؟ ——— کبھی روٹی کیوں نہیں پکتی اور روٹی پکتی بھی ہے تو کبھی کھانے میں مزہ

کیوں نہیں ملتا، کھانے کو جی کیوں نہیں چاہتا۔ کھاتے بھی ہیں تو کبھی وہ جزوِ بدن کیوں نہیں بنتی۔ وہ جزوِ بدن بنتی بھی ہے تو کبھی ہم بحیثیت انسان آگے کیوں نہیں بڑھتے۔ ہم آگے بڑھتے بھی ہیں تو کبھی بھائی بند ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیتے۔ بھائی بند ہمارا ساتھ بھی دیں تو کبھی غیر کیوں راستہ روکتے ہیں۔

یہ سوال اس ایک ماں ہی کا سوال نہیں، یہ دُنیا بھر کی ماؤں بلکہ ہم سب انسانوں کا مسئلہ ہے۔ انسان نے گھر کی بنیاد امن، سُکھ، دردمندی اور نشوونما پر رکھی تھی۔ جب گھر ان نعمتوں سے خالی ہو جاتا ہے تو اس میں جان نہیں رہتی، معنی نہیں رہتے، گھروں میں پلنے اور بڑھنے والی زندگی مُرجھا کے رہ جاتی ہے ــــ پوری کی پوری قوم مُرجھا کے رہ جاتی ہے۔

نوے کا کیا ہے وہ تو اب بھی ہنستا ہی رہتا ہے لیکن بھوکے، ناخوش اور بے منزل بچوں کی ماں کو ہنستا ہوا تو ابھی روتا ہوا معلوم ہوتا ہے، زہر معلوم ہوتا ہے اور توے پہ جلتی ہوئی جگر گر برات اس کے لیے بھٹکتا ہوا جنازہ بن کر رہ جاتی ہے۔

روتے ہوئے توے کو مسکراتے ہوئے، ہنستے ہوئے توے میں بدلنے کی کوئی صُورت ممکن ہے؟ بھٹکتے ہوئے جنازے کو برات میں بدلنے کی کوئی صُورت ممکن ہے؟ بھوک کو فراوانی، ناخوشی کو مسرت اور ادھورے پن کو تکمیل میں بدلنے کی کوئی صُورت ممکن ہے؟

ہم سب ان باتوں کو اپنا مسئلہ سمجھیں یا نہ سمجھیں، اس ہماری ماں کو تو آج یہی فکر کھائے جا رہی ہے۔

باپ کا نوکر

اِس سال دفتر کے اوقات سرما میں بھی وہی تھے جو گرما میں تھے ۔ مُنہ اندھیرے اُٹھنا پڑتا تھا ۔ پھر جب سے مارشل لاء لگا تھا بڑے بڑے صاحب خاص طور سے بہت پابند ہو گئے تھے اور جب صاحب لوگ وقت پر پہنچتے ہوں تو بیچارے کلرکوں کے لیے کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ دیر سے آئیں ۔ برسوں سے عادت پڑی ہوئی تھی کہ دس بیس منٹ دیر سے آتے تھے ۔ اب سختی ہونے لگی تھی تو وقت پر تو آجاتے تھے لیکن گھنٹوں ذہن میں اس جلدی آنے کی بنا پر ایک کوفت سی غبار بنی چھائی رہتی — اب ایک نئی عادت ڈالنی پڑی تھی، آتے ہی چپراسی کو حکم دیا جاتا کہ ذرا گرم گرم چائے لے آؤ ۔ خیال ہوتا کہ اس طرح طبیعت کا انتشار ذرا دب جائے گا اور فائلوں کا ڈھیر کھانے کو نہ دوڑے گا ۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ چائے تو دودِ حاضر میں شہد کے مصداق ہے ۔ اس کی خوشبو سے آس پاس کے کئی ہم کاریوں کھنچے چلے آتے تھے جیسے مکھیاں ۔ یہ نہیں کہ یہ لوگ چائے کے بھوکے ہوتے تھے ، چائے تو ایک گونہ بے خودی فراہم کرتی تھی ۔ وہ جو صبح صبح سب نے اِدھر اُدھر سے کسی نہ کسی اخبار پر نظریں دوڑائی تھیں ، اب وہ نظریں گفتگو کی پیاسی زبانوں کی آبیاری کرتیں اور باتوں کا ایک بے ربط سلسلہ اُونچے نیچے سُروں میں جاری ہو جاتا ، جاری رہتا ، جاری رہتا ۔

پھر جھپکے سے ایک لمحہ آتا کہ بڑے بابو کی نظروں میں سنگینی آجاتی۔ دفتر میں کارندوں کے علاوہ مختلف لوگ منڈلاتے نظر آنے لگتے اور میزوں پر دھرے رجسٹر مُنہ پھاڑے مطالبہ کرنے لگتے کہ ہم پر بھی نظر ہو۔۔۔ پھر جھپکے سے دفتری اوقات کے بعد کے پروگرام بنتے اور چائے کے برتن اٹھانے کے لیے چپراسی کو حکم دے دیا جاتا۔

فائلوں کو اپنے قریب اور کرسی کو میز کی جانب گھسیٹ کر اس نے قلم اُٹھایا اور ایک ایک کر کے فائلیں دیکھنی شروع کیں۔ تین چار فائلیں دیکھ ڈالیں۔ قلم بے چارہ کاغذ کے لمس کو ترستا رہ گیا لیکن حرف ڈالنا اسے نصیب نہ ہوا۔ کیس ہی ایسے پیچیدہ تھے۔ اس نے دو فائلیں اُٹھائیں اور اپنے ایک ہم کار کے پاس جا پہنچا جو سست تو تھا لیکن نسبتاً پرانا ہونے کی بنا پر بہت سے معاملات کی اس سے بہتر سمجھ رکھتا تھا۔ کوئی ایک گھنٹہ اس سے بحث ہوتی رہی۔ آخر ایک فائل کے بارے میں کچھ طے ہو گیا کہ اس پر رپورٹ لکھی جائے گی۔ اس خوشی میں ہاف سیٹ چائے کا نیا آرڈر دیا گیا، آدھا گھنٹہ سگریٹ پی پی کر چائے کا انتظار کرتے رہے اور اس دوران میں دفتر کی سیاسیات پر ایک اجمالی نگاہ ڈالنے کی کوشش بھی ہوتی رہی۔ چائے پیتے پیتے آدھا گھنٹہ مزید لگ گیا۔ دونوں نے دفتر کے کلاک کو دل ہی دل میں گالی دی۔ ابھی چھٹی میں پورے تین گھنٹے تھے۔

وہ واپس اپنی میز پر آ گیا۔ ایک اور سگریٹ سلگایا اور رَف کاغذ نکال کر اس پر طے شدہ مفہوم کی عبارت لکھنے لگا۔ لکھتے لکھتے سگریٹ ختم ہو گیا۔

چلتے چلتے قلم رک گیا۔ ڈبا خالی ہو چکی تھی۔ چپراسی کو بلایا، سگریٹوں کے لیے پیسے دیئے اور سگریٹ کا انتظار ہونے لگا۔ چپراسی کو دیر لگی تو بے قرار ہو کر ساتھ والے سے ایک سگریٹ مانگا۔ اسی لمحے اس کا بھی کوئی مرحلہ طے ہوا تھا، اس نے دعوت دی کہ سگریٹ پینا ہے تو یہاں آکر پیو۔ اونگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ، وہاں جا بیٹھے۔ اب ظاہر ہے باتوں کا چشمہ پھر پھوٹ بہا اور کرکٹ، ہاکی، آسٹریلیا کے مقابلوں سے ہوتا ہوا فلمی دنیا تک جا پہنچا — وہاں جا پہنچا جہاں سے واپس آنا کسی طلسم خانے کی بھول بھلیاں سے واپس آنے کا درجہ رکھتا ہے۔ چپراسی سگریٹ لے کر آیا تو ذہن سے نکل چکا تھا کہ سگریٹ ختم کس موڑ پر ہوئے تھے — آخر جب ہمسائے کو بڑے بابو کی طرف سے بلاوا آیا تو وہ اٹھا اور ایک مرتبہ پھر اپنی میز پر جا بیٹھا۔

جب قسمت خوب کوسی جا چکی کہ ہم نے بھی کیا زندگی پائی ہے، کام سے دو منٹ کی مہلت بھی میسر نہیں تو سامنے پڑے کاغذ کی فریاد اس کے کانوں میں پڑی۔ ایک مرتبہ پھر سگریٹ سلگا کر اس نے قلم پکڑا اور آگے چلا۔ بارے عبارت ختم ہوئی اور سکھ کا ایک لمبا سانس اس کے حلق سے نکل کر دفتر کی فضا میں گھل مل گیا۔ یوں بھی اب سکھ کی گھڑی قریب آ رہی تھی۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی بات باقی تھی۔

اس نے کاغذ اٹھایا اور دفتر کے سب اکاؤنٹنٹ ایک کمرے میں جا پہنچا۔ یہ صاحب ذرا پڑھے لکھے واقع ہوئے تھے اور دفتر کے نوجوانوں کے "پیر استاد" بنے بیٹھے تھے۔ جب بھی مشکل پیش آتی وہ اپنی عبارتوں کی انگریزی درست کرانے ان کا رخ

کرتا۔ پہلے تو وہ ذرا نخرے کرتے، پھر مان جاتے اور دو چار لفظ ادھر سے اُدھر کرکے کاغذ نوجوان کے ہاتھ میں پکڑا دیتے۔ اُس نے بھی کاغذ پکڑا اور رستے میں دو چار میزوں کی جانب فقرے اُچھالتا ہوا واپس اپنی میز تک جا پہنچا۔ اب فائل کھولی اور عبارت کو خوش خط لکھنا شروع کیا۔

لکھتے لکھتے چپراسی کئی اور فائلیں میز پر رکھ گیا۔ دل ہی دل میں اُسے دو چار گالیاں دیں، اُسے کیا دیں، نچلے کلرکوں کو دیں، سالے دن بھر میں بیسیوں فائلیں نکال دیتے ہیں ہاتھ سے۔ عبارت مکمل ہوئی تو اُس نے احتیاطاً اسے دوبارہ پڑھا تاکہ کہیں غلطی وغلطی نہ رہ گئی ہو، بڑے بابو غلطیوں پر بہت تنبیہ کرتے تھے، مذاق اُڑاتے تھے۔ دفتر میں کئی ہم کاروں کے نام ہی ان کی مشہور غلطیوں پر رکھ دیئے گئے تھے۔ چنانچہ عبارت کو غور سے دیکھا تو کئی جگہ کا، کی چھٹا ہوا تھا۔

اتنے میں چپراسی فائلوں کا ایک اور پلندہ لے آیا۔ اب کے اس سے نہ رہا گیا۔ آخر زبان کھل ہی گئی "سالوں کو کچھ ہوش بھی ہے، اتنی فائلیں بھیجے جا رہے ہیں، کوئی یہاں اُن کے باپ کا نوکر بیٹھا ہے۔" پھر اُس نے قریب والوں کی جانب رحم طلب نگاہیں دوڑائیں مگر وہ جا چکے تھے۔ کلاک کی جانب دیکھا، تین منٹ اُوپر ہو چکے تھے۔ اُسے سخت کوفت ہوئی، ایک وہی بے وقوف تھا جو یوں گدھوں کی طرح کام کرتا تھا۔ اُس نے فائل بند کی اور اسے زور سے میز پر پٹخ دیا۔

خاص پیغام

دادی جان، داداجان، ابّاجان، امّی جان، بھائی جان، آپا جان —
یا اللہ خیر! یہ آج اس برخوردار کو کیا سوجھ رہی ہے، پگلایا پگلایا پھر رہا ہے،
کبھی اس کا دماغ چاٹ رہا ہے کبھی اُس کا۔ نہ جانے کس نے اُس کے بھیجے
میں یہ بات ڈال دی ہے۔ اُس کے تو پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے۔ چلو،
مجھ سے تو اُس نے یہ گپ اس کر لی۔ اب بھلا دادا دادی سے بھی یہ کوئی کرنے
والی بات تھی۔

چار پانچ روز ہوئے صاحبزادہ اپنے کسی دوست کے یہاں بیٹھا گپیں ہانک
رہا تھا کہ کسی نے ترقی ورقی کا ٹنٹا چھیڑ دیا۔ اب یہ گھر آیا تو سب کو گھیر گھیر کر
بھاگ جھوڑنے لگا۔ بھائیوں اور باپ سے تو ایسی باتیں کرتے ہیں تم اسے
اکثر دیکھا تھا لیکن اُس روز تو وہ میرا، اپنی بہنوں اور دادی دادا کا بھی سر کھا رہا
تھا۔ اب ہم عورتیں اور یہ بچارے بڑے بوڑھے اس ترقی کے بخار میں کسی کی کیا
مدد کر سکتے تھے۔ میں نے تو اس سے کہا بھی کہ برخوردار کچھ عقل کی لو، کیا کہے جا رہے
ہو، اب یہ بھلے گھر کی لڑکیاں بازاروں اور دفتروں میں کام کرتی پھریں اور تیری
ماں بھی کوئی دکان وُکان کھول لے اور دادی دادا بھی محنت مزدوری کیا کریں؟
ہمارے مرد کام کرتے ہی چلے آئے ہیں۔ تمھارے دادا ساٹھ سال کی عمر تک

دفتروں میں جھک مارتے رہتے ہیں، اب اگر وہ دو دن آرام کے کاٹ لیں گے تو کیا یہ اُن کا حق نہیں ــــ باپ کو دیکھو، صبح جاتے ہیں اور رات کو آتے ہیں ــــ اور کیا چاہتے ہو۔

پہلے تو وہ ادھر اُدھر کی منطق بھاڑتا رہا ــــ دیکھیے نا یہ، دیکھیے نہ وہ، لیکن جب اُس نے میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو روٹھا سا ہو کر میرے پاس سے اٹھ کر دادی کے پاس جا بیٹھا۔ اب میں اپنی جگہ زمین میں گڑی جاتی تھی کہ اُلّو جیسا، دادی دادا سے بھی ایسی جھک جھک کرے گا اور وہ سمجھیں گے شاید ماں باپ نے سکھایا ہے کہ دادی دادا چونکہ بیکار پڑے روٹیاں توڑتے ہیں اس لیے انھیں کھو کہ کچھ کیا ویا کریں۔ الگ بیٹھنے سے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ میں بھی پاس جا بیٹھوں۔

"ہاں تو بھئی کیا کہتا ہے تمھارا صدر"

"دادی جان! صدر کہتا ہے، لوگوں کو ترقی کے منصوبوں میں میری مدد کرنی چاہیے"

"تو بھئی لوگ کریں۔ ہم تم کیا کرسکتے ہیں جن کے پاس دولت ہے وہ کارخانوں میں لگا دیں، جن کے پاس زمین ہے وہ اس پر محنت کریں، جو کام کرسکتے ہیں وہ دیانت سے کام کریں ــــ تم ماشاءاللہ سے جوان جہان ہو، کرو، شوق سے کرو، ہم تمھیں روکتے ہیں۔ لیکن یہ ہم بڈھے اب کیا کرسکتے ہیں ــــ اپنے باپ سے کہو، وہ اگر کچھ اور کرسکتا ہے تو وہ بھی کرے ــ بھائیوں سے کہو۔ پھر بیٹے! یہ تمھیں اس عمر میں دولت کی ایسی لگن کیوں لگ گئی ہے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل

رہا ہے۔ اب تم کتنے ہو کر سب کمانے دھمانے ہی پر جُٹ جائیں۔"

"نہیں دادی جان، میں یہ تھوڑی کہتا ہوں کہ صرف دولت کما کر ہی ہم مدد کر سکتے ہیں۔ البتہ گھر کی آمدنی بڑھنے سے ملکی دولت بھی تو بڑھے گی اور جب یہ خرچ ہوگی تو کئی لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ مثلاً اگر آپ کے پاس جو رُپے جمع ہیں آپ انھیں سیونگ بنک میں جمع کرا دیں تو آپ کی رقم محفوظ بھی رہے گی اور یہ ملکی کاموں میں خرچ بھی ہوتی رہے گی اور اس میں اضافہ بھی ہوتا رہے گا۔ اسی طرح دادا جان بڑی آسانی سے کوئی عمارت بنوا سکتے ہیں۔ اس سے کچھ کرایہ آئے گا، کسی بے گھر کو رہنے کے لیے مکان مل جائے گا، مزدوروں اور کاریگروں کو کام مل جائے گا"

"اچھا چلو، میں نے تیری بات مان لی۔ میرے پاس دو ہزار رُپے لینے جمع ہیں تو کل انھیں بنک میں رکھوا آنا۔ تیرے دادا سے بھی میں کہوں گی کہ پرسوں سے زمین کا پلاٹ خریدا پڑا ہے اس پر مکان بنوا دیں۔ لیکن یہ تیری ماں اور بہنیں کیا کریں ـــــ سارا دن تو بیچاریوں کو گھر کے کام ہی سے فرصت نہیں ملتی اور تو خود اور تیرا باپ اور بھائی لوگ کیا کریں گے۔ باپ تیرا تو پہلے ہی کام کا غلام بن چکا ہے"

"اُن کی آپ فکر نہ کریں دادی جان، ابّا تو یہ کریں گے کہ اپنا کام جاری رکھیں گے اور ہم لوگوں کو کسی کام سے نہیں روکیں گے۔ اچھے کام میں رکاوٹ نہ ڈالنا بھی اچھا کام ہے۔ رہے بھائی لوگ تو ہم تینوں نے سوچا ہے کہ کالج سے واپس آکر رات کو ٹیلیفون کے دفتر میں جزوقتی ملازمت کریں گے اور

اس طرح جو رقم ملا کرے گی اسے آپ کی طرح سیونگ بنک میں جمع کراتے رہیں گے۔ ایسے ہی میں نے حساب لگایا ہے، اگر میں تین سال اس طرح کام کر لوں تو خود میرے اپنے پاس اتنے روپے ہو جائیں گے کہ میں ولایت جاکر ایک آدھ سال پڑھ آؤں، یا دُنیا کا چکر لگا لوں۔"

" اور تیری بہنیں اور ماں —" اس کی دادی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ امّی جان، میری بات ہی نہیں سُنتیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ جو ابھی سے بہنوں کے لیے جہیز خرید خرید کر گھر بھر رہی ہیں، اس روپے کو آپ کی طرح سیونگ بنک . . . . "

"یہ کیا سیونگ بنک، سیونگ بنک لگا رکھی ہے تم نے . . . سیونگ بنک سیونگ بنک . . ." مجھ سے نہ رہا گیا۔

"ارے بھئی" اُس کی دادی نے بات شروع کی "تو اس میں حرج بھی کیا ہے میں تو خود تم سے کہنے والی تھی کہ دُلھن بی بی، یہ جو تم ابھی سے چیزیں خرید رہی ہو، اس میں فائدہ نہیں۔ موقع آئے گا تو خریدنا، آج کل تو آئے دن فیشن بدل جاتے ہیں، کیا پتا یہ آج کی چیزیں کل کوئی پسند بھی کرے گا کہ نہیں۔ اب اتنی ڈھیر روپیہ اگر کسی کام میں لگ جائے اور وقت کے وقت واپس مل جائے تو کیا حرج ہے۔"

برخوردار نے دادی کی شہ پائی تو وہ شیر ہو گیا۔ "ہاں امّی جان، واقعی۔" اب میں آخر کیا کہتی — کھسیا کر کہا: "اور تیری بہنیں غریب کیا رکھیں سیونگ

بنک میں . . . "

"انھیں سیونگ بنک میں کچھ رکھنے رکھانے کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں اُنھیں یہ چاہیے کہ وہ مل جُل کر محلے میں ایک سکول کھول لیں اور غریب بچّوں کو پڑھایا کریں۔ جتنے لوگ پڑھیں گے اتنا ہی صدر کا کام ہلکا ہو گا۔"

"یہ صدر تمھارا کیا لگتا ہے؟ تم تو یُوں آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہو جیسے اُس نے تمھیں خاص پیغام بھجوایا ہے کہ میاں میری مدد کرو۔"

"خیر امّی جان! خاص پیغام تو نہیں بھجوایا لیکن میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر کوئی یہی سمجھ کر چُپکا بیٹھا رہے کہ ہمیں کون سا صدر نے خاص پیغام بھجوایا ہے تو آپ ہی سوچیئے کوئی بھی تو کام نہ ہو —"

مجھے اپنے کئی کام یاد آ گئے، میں اُٹھ آئی — پتا نہیں وہ اور اس کی دادی کیا کیا تجویزیں گانٹھتے رہے۔ آئے بڑے ترقی پسند۔

"ڈرمت"

ابجد سیکھنے کے بعد اُس نے سب سے پہلے جو فقرے پڑھے تھے اُن میں 'اب جا'، 'کل آ'، کے ساتھ ایک فقرہ یہ بھی تھا : 'ڈرمت'۔ اس وقت اس ننھّے سے فقرے کا مطلب اُس کے ننھّے سے ذہن میں کچھ اس طرح کا تھا کہ کتّے سے نہ ڈرنا چاہیے، شیر سے نہ ڈرنا چاہیے، بھُوت سے نہ ڈرنا چاہیے۔ جُوں جُوں وہ بڑا ہوتا گیا اس چھوٹے سے، بظاہر بے معنی سے فقرے کا مفہوم اُس کے پھیلتے ہوئے ذہن میں پھیلتا ہی چلا گیا اور اب تک پھیلتا چلا جا رہا ہے۔

سکول ہی کے دنوں کی بات ہے : درجے کے اُستاد نے چار ذہین لڑکوں سے کہا کہ وہ شہر میں ہونے والے ایک تقریری مقابلے میں سکُول کی طرف سے حصّہ لیں۔ ان میں وہ بھی شامل تھا۔ چاروں لڑکوں نے یہ عُذر پیش کیا کہ امتحان سر پر ہے اس لیے وہ اس مقابلے میں حصّہ نہیں لینا چاہتے۔ اُستاد نے یہ معاملہ ہیڈ ماسٹر کے سامنے رکھ دیا۔ دوسرے دن صُبح کی دُعا کے بعد ہیڈ ماسٹر نے ان لڑکوں کو طالب علموں کی صفوں سے باہر آنے کے لیے کہا۔ ہمارے سکولوں میں اُستاد ہی کیا کم ہوتے ہیں، ہیڈ ماسٹر کی مار سے تو خُدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے' لڑکوں کے دل دھکڑ پکڑ کرنے لگے۔ ہیڈ ماسٹر نے کڑک کر پُوچھا کہ مقابلے میں

کون حصّہ نہیں لے گا؟ سب چُپ رہے۔ اب باری باری خطاب کیا گیا۔ تین لڑکوں نے کہہ دیا کہ وہ تو حصّہ لیں گے۔ صرف دُبلے قصّاص نے اب بھی یہی کہا کہ وہ مقابلے میں حصّہ نہیں لینا چاہتا۔ بھرے سکول میں ہیڈ ماسٹر نے استاد کے سامنے "نہ"، اور اپنے سامنے "ہاں" کہنے والے تینوں لڑکوں کو وہ مار ماری جو کالے چور کو بھی کسی نے نہ ماری ہوگی۔ عام خیال یہ تھا کہ ان سے اگر یہ سلوک ہُوا ہے تو پوچھتے کے تو پُرزے پُرزے ہی اُڑ جائیں گے لیکن عجب حادثہ ہُوا کہ یہ تماشا نہ ہُوا ——— اُسے مُعاف کر دیا گیا۔ اس کے دل نے اُسے وہی پرانا چھوٹا سا، بظاہر بے معنی سا' فقرہ سُنا دیا تھا: 'ڈرمت'۔

اسی دن وہ امتحان کے سلسلے میں تاریخ کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں برسوں سے سر اٹھاتا ہُوا ایک سوال خود بخود حل ہو گیا۔ جب کبھی وہ پڑھتا تھا کہ ایک شخص نے میدانِ جنگ میں یُوں دادِ شجاعت دی کہ موت کے مُنہ میں بے خطر کود پڑا تو اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر اکثر و بیشتر ایسے ہی لوگ کیوں فتح یاب ہوتے ہیں۔ اُس دن ایسے لوگوں کے دنوں کو بھی اُس نے اُسی پُرانے چھوٹے سے، بظاہر بے معنی سے، فقرے کی تال پر دھڑکتے محسوس کیا 'ڈرمت'۔ اُس پر یہ حقیقت کُھل گئی کہ جو کوئی جس چیز سے ڈرتا نہیں وہ خود بخود اس کے راستے سے ہٹ جاتی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ بس آگا پیچھا دیکھے بغیر، نیک و بد سوچے بغیر اوکھلی میں سر دے دیا جائے یا یہ نعرہ لگاتے رہیں کہ آ بیل مجھے مار۔ اس نے تو محض یہ سیکھنے کی کوشش کی تھی کہ جب کسی بات کا موقع آ ہی جائے تو مَیں

کتنے کی طرح دُم دبا کر بھاگ جانے یا نادان کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے کام نہیں چلتا۔ اُس وقت ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ آدمی اپنی پُوری صلاحیت سے جلد از جلد اس موقع کی معنویت اور للکار کا اندازہ کرے اور پورے ایمان سے اُس کا سامنا کرے۔

اُس نے لوگوں کو ہفتوں یہ سوچتے دیکھا تھا کہ فلاں شخص سے ملنے جائیں یا نہ جائیں، اِس تذبذب میں گرفتار دیکھا تھا کہ اگر ملنا لازم ہی ہے تو آج جائیں یا کل جائیں یا پرسوں (بلکہ دل ہی دل میں یہ دُعا کرتے دیکھا تھا کہ کوئی ایسی بات ہو جائے کہ جانا نہ پڑے ـــ بارش ہو جائے، سیلاب آجائے، اُس کی یا خود اپنی ٹانگ ٹوٹ جائے)

پھر اُس نے حاضرین کے خوف سے تقریر کرنے والوں کی گھگی بندھی ہوئی دیکھی۔ اُس نے سامعین کے خوف سے گانے والوں کی آواز کو حلق میں ڈوبتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے راستہ بھُولے ہوؤں کو کسی سے راستہ پُوچھتے ہوئے شرمندہ دیکھا۔ فون کرتے ہوئے لوگوں کو ممیاتے سُنا۔ سیدھے سادے آدمیوں کو برجستہ اور تیز وطرار فقرے دانتوں تلے دباتے دیکھا کہ لوگ کہیں گے لومڑے نے بھی کفن پھاڑا۔ عقلمندوں کو گھروں میں بھی تنے ہوئے رہتے پر سوار پایا کہ کہیں اُن کے مُنہ سے کوئی بے وقوفی کی بات نہ نکل جائے۔ اس نے بڑے بڑے جان نثار عشاق کو ایک قدم بڑھ کر خود بخود ٹپک پڑنے والے پھل کو گو چینے سے گریزاں پایا۔ اُس نے بڑے بڑے دلیروں کو برسوں اس شش و پنج میں مبتلا دیکھا کہ شادی کے سلسلے میں والدین کو اپنی پسند سے

کیونکہ اطلاع دیں ۔۔۔ یہاں تک کہ وہ ساحل سے مانندِ موج سر پٹکتے رہ گئے اور اغیار 'اُس' کو کشتی میں بٹھا کر لے گئے۔

اُس نے دیکھا کہ اچھے اچھے کھلاڑیوں نے ٹیم کا کپتان بننے سے انکار کر دیا، لوگوں نے اچھی سے اچھی ملازمتیں قبول نہ کیں۔ اُس نے تو یہ تک دیکھا کہ لوگوں نے اپنے اندر خوبصورت اور روشن دماغ عورتوں سے شادی کی ہمّت نہ پائی۔

اُس نے محسوس کیا کہ ڈر وہ امر بیل ہے جو انسانی زندگی کے درخت کو اُوپر اُٹھنے ۔۔ حکمت و دانش سے ہم کنار ہونے ۔۔ نیچے اُترنے ۔۔ ذات اور جماعت کی بنیادوں کو ٹٹولنے اور دائیں بائیں پھیلنے ۔۔ چاروں پھیلی ہوئی کائنات سے ہم آہنگ ہونے سے روکتی ہے۔ اُس نے محسوس کیا کہ ڈر کی بنیاد بے یقینی پر ہے، یہ اپنی ذات اور انسانیت پر ایمان کے فقدان کا نتیجہ ہے، خالقِ اکبر کے وجود اور اس کے نظامِ نشو و نما پر ایمان کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ ڈرے تو وہ جسے اپنی ذات، انسانیت اور خالقِ اکبر پر بھروسا نہ ہو؛ جو اپنی، انسانیت کی اور خالقِ اکبر کی عزّت نہ کرتا ہو۔ کیونکہ زندگی اور اس کی للکار سے ڈرنے، زندگی اور اس کے امکانات سے ڈرنے کا مطلب ہے موت کی خواہش رکھنا، جہنم کی آرزو کرنا ۔۔۔ جہنم ہی تو وہ جگہ ہے جہاں انسان آگے بڑھ کر وہ نعمتیں نہیں پا سکتے جن کا حصول ان کے لیے ممکن تھا ۔۔ بلکہ لازم۔

اپنا حق

گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے اور گہرے کالے سمندر کا سینہ پھٹا پڑتا ہے۔ ایک چھوٹی سی کشتی میں دو بھائی سوار ہیں اور کشتی سمندر کی سنگین موجوں کے تھپیڑوں میں بے مایہ خس و خاشاک کی طرح محصور و پابند ہو گئی ہے۔ دونوں بھائی اپنی اپنی جگہ یہ جان گئے ہیں کہ اس چھوٹی سی کشتی میں اب اتنی سکت ہرگز نہیں کہ ان دونوں کو سمندر کی اس بلا خیزی سے محفوظ رکھ سکے — ان میں سے ایک کو اپنی جان سمندر کے سپرد کر دینی ہوگی تاکہ دوسرے کی جان بچنے کا امکان باقی رہے۔ ان میں سے ایک نوجوان ہے اور ابھی اُسے زندگی کی ذمہ داریوں سے کوئی خاص علاقہ نہیں۔ دوسرا ادھیڑ عمر ہے، اُس کی بیوی ہے، بچے ہیں، پھر بوڑھے ماں باپ ہیں اور وہ گھر بھر کے لیے ذمہ دار ہے۔ اس وقت وہ دونوں ایسے حالات میں گھرے ہیں کہ فیصلے کا لمحہ مزید طویل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اُن میں سے ایک بھائی اچانک اُٹھتا ہے اور سمندر میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ آپ کے خیال میں یہ کون سا بھائی تھا — یا یہ کون سا بھائی ہونا چاہیے تھا؟

جب تک آپ کسی فیصلے پر پہنچیں ایک اور واقعہ سُنئے، ایک مرتبہ ایک بہت بڑا عالمِ دین اپنے سفر کے دوران میں ایک شہر سے گزرنے والا تھا۔ جب وہ شہر کے قریب پہنچا تو دریا کا پُل طغیانی کی شدت سے تباہ ہو چکا تھا۔

مجبوراً اُسے دریا کے ادھر ہی پڑاؤ کرنا پڑا۔ اُدھر حاکم شہر کو اس سے ملاقات کا بے حد اشتیاق تھا۔ جب کئی دن تک طغیانی کا زور کم نہ ہوا تو حاکم نے ایک نہایت مضبوط کشتی میں اپنے نمائندوں کو اُسے لانے کے لیے بھیجا۔ عالمِ دین نے چلنے سے صاف انکار کر دیا۔ حاکم کے نمائندوں نے لاکھ جتن کیے، ہر طرح یقین دلایا کہ کشتی طغیانی کا بخوبی مقابلہ کر سکتی ہے جس کی سیدھی سی مثال یہی تھی کہ وہ لوگ اسی کشتی میں دریا عبور کر کے آئے تھے۔ لیکن عالمِ دین نے ایک نہ سُنی بلکہ یہ تجویز پیش کی کہ اگر حاکم کو مجھ سے ملنے کا اتنا ہی شوق ہے تو وہ یہاں میرے پڑاؤ پر آ کر مل لے۔ میں تو اپنی جان خطرے میں ہرگز نہ ڈالوں گا، میرے خیال میں میری جان حاکم کی جان سے زیادہ قیمتی ہے۔

شاید اب تک آپ کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہوں اور وہ نتیجہ یہ ہو کہ جس بھائی نے سمندر میں چھلانگ لگائی تھی وہ چھوٹا بھائی تھا اور اسی کو چھلانگ لگانی چاہیے تھی تاکہ بڑا بھائی، جس کی جان نہ صرف اس کے اپنے لیے بلکہ پورے گھر کے لیے ضروری تھی، بچ سکے۔ ساتھ ہی ساتھ شاید آپ اُس عالمِ دین کی جرأت کو بھی سراہ رہے ہوں، جو علم کی خاطر، علم کی بقا اور حفاظت کی خاطر حاکمِ شہر کو خاطر میں نہ لایا۔

کم قیمتی چیزوں کی خاطر زیادہ قیمتی چیزیں قربان نہیں کرنی چاہئیں اور قربانی کا مفہوم یہ نہیں کہ اگر ہم خود زیادہ قیمتی بھی ہوں تو اپنی جان کو اُن لوگوں کی خاطر قربان کر دیں جو کم قیمتی ہیں۔ قربانی کا صرف ایک مقصد ہے کہ بہتر کی خاطر کمتر کو قربان کر دیا جائے۔ اور اگر اتفاق سے ہم کسی ایسی صورتِ حال میں گھرے

ہوں کہ ہم بہتر ہوں یا ہمارا حق افضل ہو تو ہمیں خواہ مخواہ اپنے آپ کو قربان کرنے یا اپنا حق نہ لینے سے بچنا چاہیے۔

اسی لیے تو ان ماؤں سے بڑھ کر بچوں کا کوئی دشمن نہیں جو اکثر بے جا اپنی جان کو مصیبت میں ڈال ڈال کر بچے پالتی ہیں اور اکثر بلاوجہ اُن کی خاطر پریشان رہتی ہیں اور اکثر بلا ضرورت اپنا حق ان کی خاطر قربان کرنے کی دھن میں رہتی ہیں۔ یہ مائیں جہاں اپنی مسرت کی دشمن ہیں، اپنی ذات کی دشمن ہیں وہاں ان کی یہ بے کار توجہ بچوں پر ایک بوجھ بن جاتی ہے اور اُن کی رُوحوں کے رس کو چوس لیتی ہے۔ اُنھیں جائز بغاوت کرنے اور اپنے حالات کے مطابق نئی روش اختیار کرنے کے ناقابل بنا دیتی ہے — اُنھیں آزاد نہیں ہونے دیتی۔

اسی لیے تو ہمارے اُن دوستوں سے بڑھ کر ہمارا کوئی دشمن نہیں جو ہم پر بلاضرورت اپنی جان چھڑکتے پھرتے ہیں اور بلا چون وچرا اپنے حقوق سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ دوست ہیں جو ہمارے اعصاب پر سوار رہتے ہیں اور جن کی موجودگی کے احساس سے ہماری روحیں خواہ مخواہ اپنے آپ کو پابند محسوس کرتی ہیں۔ یہی عالم اُن بیویوں کا ہے جو اپنے خاوندوں کی خدمت کرنے میں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ بلاضرورت اپنی جان تباہ کر لیتی ہیں۔

ہو سکتا ہے ہم خود بھی بعض اوقات اسی رجحان کے شکار ہو جاتے ہوں اور خواہ مخواہ اپنا حق کسی کم مستحق شخص کے لیے یا کسی مستحق شخص کے لیے بلاضرورت قربان کر دیتے ہوں۔ ہمیں یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہیے کہ ہم خود بھی ایک انسان ہیں اور ہماری بھی ایک اہمیت ہے۔ اگر ہم یہ خیال تو رکھیں کہ ہمارے بھائی بند

خوش رہیں اور اُن کی نشو و نما ہو اور ہم اپنی خوشی اور نشو و نما کو ہر مرتبہ (اکثر بلا ضرورت) ملتوی کرتے چلے جائیں تو کیا ہم ایک انسان (جو اس صورت میں ہم خود ہیں) کی خوشی اور نشو و نما نہیں چھین رہے؟ کیا ہم اس شخص کی بہتری کے دشمن نہیں، اپنے دشمن نہیں؟ اگر ہم اپنی جان کو کچھ نہیں سمجھتے؛ دوسروں کے حقوق کا تو خیال رکھتے ہیں لیکن اپنے حق کو نہیں پہچانتے یا اسے حاصل کرنے کی بے باکانہ تجاویز نہیں رکھتے تو پھر ہمیں اُس بھڑ کو بھی نہیں مارنا چاہیے جو ہمیں کاٹ کر خوش ہوتی ہے۔ اُس سانپ کو بھی نہیں مارنا چاہیے جو ہمیں کاٹ کر خوش ہوتا ہے۔ اُس چور کو بھی نہیں پکڑنا چاہیے جو ہماری چوری کر کے خوش ہوتا ہے۔ اُس قاتل کو بھی نہیں پکڑنا چاہیے جو ہمیں قتل کر کے خوش ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی آزادی کے ان غاصبوں کے لئے بھی آواز نہیں بلند کرنی چاہیے جو ہمیں غلام بنا کر خوش ہوتے ہیں۔

اپنا حق بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کسی دوسرے کا بلکہ اگر دوسرا کم مستحق ہے تو آپ کا حق افضل ہے۔

تفریح اور تہوار

وہ ذکر کر رہا تھا کہ آپ کو ورزش کا شوق ہے۔ ہونا ہی چاہیے۔ آپ بہت اچھا کرتے ہیں کہ نہانے سے پہلے ہر روز کچھ ورزش کر لیتے ہیں۔ سو پچاس ڈنٹر بیٹھک — کیا کہا، اتنے نہیں، بس دس پندرہ — کیوں؟ ہاں ٹھیک ہی تو ہے دس پندرہ مرتبہ آدمی ایک ہی حرکت کرے تو خاصا تھک جاتا ہے۔ پھر آپ کو کوئی پہلوان تو بننا نہیں، آپ تو محض خون کی گردش میں ہمواری کے لیے ذرا ہاتھ پاؤں ہلا لیتے ہیں۔ لیکن ایک بات ہے: اس اپنے برخوردار کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو برقی پریس میں کام کرتا ہے، وہی آپ کے بھائی صاحب کا چھوٹا بیٹا۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ وہ صبح سے شام تک مشین کے آگے کھڑا مشین کے منہ میں کاغذ دیتا رہتا ہے۔ ایک گھنٹے میں بغیر رُکے تقریباً ہزار ڈیڑھ ہزار مرتبہ اُسے کاغذوں کے انبار سے ایک کاغذ جُدا کرنا ہوتا ہے، اُسے سیدھا پکڑنا ہوتا ہے، اسے مشین کے پیٹ میں مقررہ مقامات پر جمانا ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ خیال کرنا ہوتا ہے کہ ہاتھ صحیح سلامت مشین کے منہ سے نکل آئیں اور اتنی دیر میں مشین نیا کاغذ مانگنے کے لیے نیا چکر شروع کر چکی ہوتی ہے اور اس کے ہاتھ کاغذوں کے انبار سے نیا کاغذ اُٹھانے چل دیتے ہیں۔ ہر کاغذ کے ساتھ اس کی کمر ایک مرتبہ جھکتی اور سیدھی ہوتی ہے۔ بس ایک ٹانگیں اپنی جگہ قائم رہتی

ہیں اور آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ آدمی کتنی دیر آرام سے ایک ہی جگہ بغیر ہلے جُلے بیٹھ سکتا ہے۔ ذرا اندازہ کیجیے کہ اگر آپ کو دن میں سات گھنٹے مشکل کا کھانا کھائے بغیر سات یا دس ہزار مرتبہ ہاتھوں اور کمر سے مسلسل ایک ہی حرکت کرنی پڑے تو آپ کس قدر راحت محسوس کریں گے ؟

کپڑا بننے کے کارخانوں میں، جُوتے بنانے کے کارخانوں میں مزدوروں کے دستے کچھ اسی قسم کا کام ہوتا ہے۔ پھر کارخانے کے مزدوروں ہی پر بس نہیں ذرا اُس راج مستری کو دیکھیے جو صبح سے شام تک زمین سے منزلوں اُونچے ایک کم عرض سے تختے پر بیٹھا اینٹ پر اینٹ جمائے چلا جا رہا ہے۔ یا اُس دکاندار کو دیکھیے جو صبح سے گھری شام تک اپنی چار گز لمبی تین گز چوڑی دکان سے بندھا بیٹھا ہے اور مُنہ اُٹھائے گاہکوں کا انتظار کر رہا ہے یا اُن کے ایک ہی طرح کے سوالوں کے ایک ہی طرح کے جواب دے رہا ہے۔ کیا یہ لوگ محنت کی اس یکساں رفتار سے تھکتے نہیں ؟ کیا انھیں کسی ایسی دلچسپی کی ضرورت نہیں جو ان کے اعصاب اور جسم کو آرام دے، انھیں اس تکان کو بھلانے میں مدد دے؟

آپ کو تاش اور شطرنج سے نفرت ہے تو جُوا کرے آخر یہ لوگ کیا کریں؛ سگریٹ پئیں، حقہ پئیں، شراب پئیں، بھنگ یا چرس پئیں، کسی طرح اُنھیں اپنی اس محنت کی تکان اور کوفت تو دُور کرنی ہی ہوتی۔ اگر تفریح کا شریفانہ یا مہذبانہ اہتمام غائب ہو یا اس تک پہنچ اس لئے مشکل ہو کہ عام آدمی کی مہینے بھر کی کمائی ایک دن کی تفریح میں اُڑ جائے تو لازماً تفریح کے سستے اور عامیانہ ذرائع ہی اختیار کیے جائیں گے۔ آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہے کہ دیکھیے! یہ ہمارے مزدور

اور نوکر پیشہ لوگ، کڑکڑاتی دھوپ ہو یا چلچلاتی سردی، گھٹیا فلمیں دیکھنے کی خاطر چھٹی والے دن چار چار گھنٹے پہلے سے سینماؤں کے آگے قطاریں باندھے کھڑے رہتے ہیں لیکن آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ پُورا ہفتہ ان لوگوں نے کیا کیا ڈنٹر بیٹھک پیلے ہیں؟ اب اگر آپ نے ان کے کام کو توضروری سمجھ لیا اور ان کی تفریح کا انتظام کرنا بھول گئے ہیں تو وہ آخر کیا کریں۔ یہ تو افراد کی بات ہوئی۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ جب روزمرّہ زندگی کے تسلسل کا چکّر انھیں ایک بلے عرصے تک جکڑے رکھتا ہے تو وہ بھی کسی ایسے ذریعے کی متلاشی ہوتی ہیں جو ان کی تکان اور کوفت کو بُھلا دے — صدیوں کے انسانی نظام معاشرت نے تہواروں کی صورت میں انسانوں کی اسی ضرورت کو تو پُورا کرنا چاہا ہے۔

لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم جہاں نئے دَور کے تقاضوں کے تحت پُرانے معاشرتی نظام میں تبدیلیاں ناگزیر سمجھتے ہیں وہاں بعض نہایت مُفید اداروں کو بھی اسی رَو میں غیر ضروری اور بیکار سمجھ کر ردّ کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ تہوار نہ صرف ہمارے کلچر کے نمائندہ ہوتے ہیں، یہ تو کلچر ہی کی طرح ایک بنیادی انسانی ضرورت کو پُورا کرتے ہیں۔ تہوار کے موقع پر پُوری کی پُوری قوم یا پُورے کا پُورا معاشرہ روزمرّہ زندگی کی پٹی ہوئی راہوں سے ہٹ کر اپنے اندر کی آزاد اور خلّاق زندگی کا جو اظہار کرتا ہے وہ معاشرے کی جذباتی، ذہنی اور روحانی زندگی کی صحت کے لیے بے حد اہم ہے۔ ہمیں تہواروں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اس طرح بہت روپیہ اور وقت برباد ہوتا ہے۔ میلوں ٹھیلوں، کھیل تماشوں، پتنگ بازی، آتش بازی وغیرہ پر جو روپیہ اور وقت اُٹھتا ہے اس کا تو ہمیں بہت غم رہتا ہے۔

لیکن دنوں اور چہروں کی مُردنی دُور کرنے میں یہ" لہو ولعب" کیا کچھ بھی حصّہ نہیں لیتا۔ تفریح اپنی جگہ حرام نہیں۔ اسے اگر اعتدال پر رکھا جائے تو یہ کام کے لیے تازیانہ بن جاتی ہے — یعنی آگے بڑھیں گے دم سے کے۔ یہ بجا ہے کہ اب کچھ تہوار نئے دَور میں محض رسم بن کر رہ گئے ہیں لیکن ہمیں زندہ تہواروں کو عقل پسندوں سے بچانے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے اور اگر کچھ تہوار اب ہمارے لیے اپنے اندر کشش نہیں رکھتے تو ہمیں نئے تہواروں کی فکر کرنی چاہیے۔ ورنہ اس کا مطلب یہی ہوگا کہ ہم زندگی کے ڈھرے پر مشین کے کل پُرزوں کی طرح رواں رہنا چاہتے ہیں، زندہ رہنے کی ہم میں کوئی امنگ باقی نہیں اور اس کا ردِعمل یہ ہوگا کہ ہم عمومیت اور سُوقیت کی رو میں بہ جائیں گے۔

اُداسی کا نخلستان

آپ بھی سوچتے ہوں گے۔ یہ اُداسی کا نخلستان، بھلا کیا ہوا۔ اُداسی کا صحرا ہوتا تو کچھ معنی بھی تھے —— اُداسی تو ایک مُصیبت ہے، اسے نخلستان کی ٹھنڈی چھاؤں اور میٹھے پانی کے چشمے سے آخر کیا علاقہ۔

آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ کل تک وہ بھی یہی سمجھتا تھا۔ اُداسی اُسے بھی برسوں ڈراتی رہی ہے، اُس کا پیچھا کرتی رہی ہے۔ پہلے پہلے تو اُس کے یہاں اُس کی بہت ہی فراوانی تھی۔ کچھ اداس اداس سا رہنا اُسے بڑا اچھا لگتا تھا۔ اُس کے ہر معاملے کا انجام اُداسی ہوتا کیونکہ اُس میں اُسے کچھ خوشی سی محسوس ہوتی تھی۔ لوگ پُوچھتے، میاں! بتاؤ تو سہی، آخر بات کیا ہے، کیوں یُوں دل گرفتہ رہتے ہو؟ یہ سُن کر اس کا دل اندر ہی اندر کھِل سا اُٹھتا اور اُداسی کے اس کرشمے پر اُس کا ایمان بڑھتا ہی چلا جاتا کہ دیکھو اداس رہ کر کیسے ہر شخص کی آنکھوں میں کھُبا جاتا ہوں۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ یہ اُس کے پردے میں کسی کھوئی کھوئی، اداس اداس، پریدہ رنگ نرگسِ بیمار پر فقرے بازی ہے۔ ایسا نہیں ہے (اور یُوں اگر ایسا ہو بھی تو یہ کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں)

بہرحال —— جلد ہی یہ دن بیت گئے اور ٹھوس زندگی خام خیالی کے قلعوں کی فصیلیں توڑ توڑ کر اُس کے وجود کے مرکز پر حملے کرنے لگی اور اب نئے نئے

حقیقی صدموں سے اس کی جان ناتواں رہنے لگی۔ اُس کے خوابوں کا ہر جانا نگر ایک ایک کر کے زندگی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا اور اُس کی یاد اُس کی آنکھوں کے آگے ایک ترمراسا بن گئی، دل میں اُداسی کا ایک لق و دق صحرا پیدا کر گئی۔ ان ترمروں کو، ان لق و دق صحراؤں کو ایک عرصہ وہ زندگی کا جلیل سمجھتا رہا، انہی میں گھرا رہا ۔۔۔ کھویا کھویا، اُداس اُداس۔

پھر ایک دن اُس کے دل میں ایک چور داخل ہوا ۔۔۔ آرزو کا چور (وہ اوّل اوّل اُسے چور ہی سمجھا تھا، بلکہ سچ پوچھئے تو اُس وقت اُسے محسوس ہوا تھا جیسے اچھے بھلے پھل میں کیڑا پڑ گیا ہے) ۔ ہاں تو اس آرزو نے اندر ہی اندر دل و دماغ کے پرانے گھروندے کو ڈھا کر اُس کی صلاحیتوں کے اینٹ گارے سے ایک شہر تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ شہر بن گیا تو اُسے آباد کرنے کی فکر ہوئی لیکن خالی شہر میں کون بھٹکتا ہے۔ وہ پھر اُداس رہنے لگا۔ اُسے یہ بات بھی اُداس کر رہی تھی کہ دیکھو کسی بھلے مانس کو خبر ہی نہیں کہ وہ ایک شہر کا خالق ہے۔ جب دُور دُور کوئی نظر نہ آیا تو وہ اپنے اس شہر کی وسعتوں پر کسی کٹے ہوئے پتنگ کی طرح ادھر سے اُدھر پریشان ڈولتا اُڑنے لگا۔ پھر اچانک اس اندھیرے نگر میں محبت کی کرن داخل ہوئی اور اس کا شہر زندگی کی تال پر دھڑکنے لگا اور پیار کی جیتی جاگتی صورتوں سے آباد ہو گیا۔

اب اس کے پاس چھوٹی موٹی شہرت تھی، زندگی کی ضروری آسائشیں تھیں، محبت کی بے کراں کرم فرمائیاں تھیں لیکن اُس کے لیے اب بھی سکون نہ تھا۔ اب اُداسی کی وہ پہلی سی فراوانی تو نہ تھی لیکن دل و دماغ اب بھی مستقل طور سے آسودہ

نہ تھے۔ زندگی کے سمندر میں اب بھی اکثر اداسی کا جہاز تیرتا محسوس ہونے لگتا اور ہر نعمت کی موج کو چیرتا ہوا وہ دل و دماغ پر حملے کی نیت سے آگے ہی آگے بڑھتا چلا آتا۔ محبت کی حرارت اور روشنی کے بعد اُسے یہ توقع تھی کہ اب دل و دماغ کا دامن بھر جائے گا اور ان کی خانہ ویرانی ختم ہو جائے گی لیکن جب اداسی کے جہاز مسلسل اُس کے ساحل پر لنگر انداز ہوتے ہی چلے گئے تو آخر ایک دن اُسے سوچنا ہی پڑا کہ ان ناگہانی بلاؤں کو کیسے ٹلے۔ اب اس نے اپنے شہر پر نظر کی تو اس میں دوستی کی جگہ خالی دیکھی۔ اُس نے دوستوں کے لیے شہر کے دروازے کھول دیئے۔ اس کے شہر کی خوشبو دُور دُور پھیل گئی اور دُور دراز کے شہروں کی خوشبو اس کے دل و دماغ تک آنے لگی اور یوں دوستوں کے ملنے کا سامان پیدا ہو گیا۔ اب اس کے شہر کی رونق دوبالا ہو گئی اور وہ محبت کی حرارت اور روشنی کے ساتھ ساتھ دوستی کی صداقت اور آزادی سے بھی معمور ہو گیا۔

لیکن اُداسی نے اب بھی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔ یہ بجا ہے کہ اب زندگی کے سمندر میں وہ پہلی سی شورید گی نہیں لیکن اب بھی کبھی کبھی سمندر کے پُرسکون فق سے اُداسی کا جہاز سر اٹھاتا ہے اور اس کے دل و دماغ کے ساحل پر لنگر انداز ہو جاتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اب وہ اس جہاز کی آمد سے خوف زدہ نہیں ہوتا بلکہ اُسے تسکین سی محسوس ہوتی ہے ۔۔ کچھ اسی قسم کی تسکین جو تپتے صحراؤں کے مسافر کو کوئی نخلستان دیکھ کر ہوتی ہے۔

روزمرّہ زندگی ایک صحرا ہے جس میں اصولوں، عادتوں، خیالات اور محسوسات کی گرم گرم ریت بھی ہوتی ہے اور اُداسی اس صحرا میں ٹھنڈی چھاؤں اور میٹھے

بانی کی نوید ہے۔ اُصول، عادتیں، خیالات اور محسوسات مسلسل استعمال سے فرسودہ ہو جاتے ہیں اور روزمرّہ زندگی کا سمندر بے موج ہو جاتا ہے، موت کا ہم معنی ہو جاتا ہے۔ اچانک اُداسی کا جہاز اُفق سے کسی تابناک ستارے کی طرح اُبھرتا ہے اور زندگی کے کارواں کو دو منٹ ٹھہرا کر اُسے سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ شہر میں جہاں جہاں مرمّت کی ضرورت ہے، جہاں جہاں نئی تعمیر کی ضرورت ہے اُسے اُس سے آگاہ ہونے کا موقع مہیا کرتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ اُداسی کا ہر جہاز اس کے دل و دماغ کے لیے اَن جانے دیسوں سے ایک نہ ایک تحفہ لاتا ہے۔ اداسی اب اُسے بُری نہیں لگتی، بر اس کے لیے ایک نعمت بن گئی ہے، ایک نخلستان بن گئی ہے جہاں چند لمحے سکون سے سوچنے کے بعد وہ اپنی زندگی کو موت کے مُنہ میں جانے سے بچا کر اس کا راستہ بدل سکتا ہے۔ بہتر اور وسیع تر زندگی کی طرف۔

ہو سکتا ہے ہم اُس جیسے خوش قسمت نہ ہوں، ہم ابھی آرزو، محبّت اور دوستی ہی سے محروم ہوں لیکن یہ بات اپنی جگہ قائم ہے کہ اُداسی سے ڈرنے اور بچتے پھرنے کے بجائے اسے اپنے وجُود کی تعمیرِ نو کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ خالق اکبر نے شاید اُداسی کے ذمّے یہی کام لگا رکھا ہے کہ انسان دو منٹ رک کر یہ سوچے کہ کہیں اس کے یہاں کوئی کمی یا خرابی تو واقع نہیں ہوگئی یا زندگی کے سفر میں اس کے زادِ راہ میں ابھی کن چیزوں کی کمی ہے اور یوں وہ نئی زندگی، نئے سفر کی ابتدا کر سکے۔

میٹھی تلخیاں

یہ نہیں کہ اس سے کسی کو خدا واسطے کا بَیر تھا یا وہ ماں باپ کا پیارا نہ تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ گھر میں وہ اکیلا نہ تھا، اس کے چار بہن بھائی اور بھی تھے پھر باپ کوئی ایسا بڑا ساہوکار نہ تھا کہ روز روز گھر میں عید کا سماں بندھا رہتا۔ بس کبھی کبھار کوئی موسمی پھل آ جاتا، آٹھویں دسویں مٹھائی منگوالی جاتی، دُوسرے تیسرے کوئی عام پسند چیز پک جاتی۔ ایک جیب خرچ تھا جو تقریباً ہر روز ملتا تھا۔

جیب خرچ ہی کہنا چاہیے، باپ باہر جاتے ہوئے ہر بچے کو دو دو آنے دے جاتا، کبھی اُسے جلدی جانا ہوتا تو بیوی کو دے جاتا کہ بچوں میں تقسیم کر دے۔ لیکن ابھی اُوپر آپ نے جو ایک لفظ پڑھا ہے — تقریباً — تو مہربانی سے اُسے بھُولیے گا نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ اس جیب خرچ میں بھی ناغہ پڑ جاتا تھا۔

اس کا معمول تھا کہ ایک آنہ صبح سکول جاتے ہوئے اور ایک آنہ شام کو سکول کے بعد گھر آتے ہوئے خرچتا۔ گرمیوں میں صبح کے آنے سے وہ فالسے، شہتوت، جامن یا اسی طرح کی کوئی سستی سی تازہ تازہ اور خاصی دیر چلنے والی چیز خریدتا کہ سکول گھر سے پُورا ایک میل دُور تھا اور یہ میل بھر کا فاصلہ آتے جاتے اُسے پیدل ہی طے کرنا ہوتا تھا۔ سردیوں میں صبح کے آنے سے ریوڑیاں یا نمکین

پچنے خریدے جاتے اور کڑکڑاتی سردی کو کڑکڑاتی ریوڑیوں یا زردگرم چنوں کے سپرد کر دیا جاتا۔ البتہ گرمیاں ہوں یا سردیاں شام کا آنہ بڑے بازار کی لائبریری سے جنّوں پریوں کی کہانیوں، جاسوسی ناولوں اور حیرت انگیز داستانوں پر اُٹھ جاتا۔ ایک آنہ ایک دن کے حساب سے ایک کتاب کے لیے کچھ زیادہ نہ تھا۔ پھر بھی کوشش یہی ہوتی کہ کتاب ایک دن میں ختم ہوجائے۔

سکول کے ہنگاموں، ساتھیوں کی ننھی ننھی سازشوں، مسابقتوں اور مقابلوں کی اپنی جگہ خاصی اہمیت ہوتی لیکن ان سب کے باوجود ان دو آنوں کی یاد بار بار ذہن میں اُبھرتی اور دل کو گرم کرتی۔ شام آئے گی تو نئی کتاب لاؤں گا۔ اب دل کتاب کے کرداروں کے ساتھ ساتھ اُڑنے سا لگتا۔ کئی کتابیں تو اُس نے چھ چھ سات سات مرتبہ پڑھ ڈالی تھیں۔ جب کسی من پسند مصنف کی نئی کتاب کی لائبریری میں آمد ہوتی تو شام کو کئی کئی بار لائبریری کا طواف ہوتا کہ آگئی یا نہیں اور وہ صبح کا آنہ، عجب عجب مزے زبان پر تیرسے جاتے، دل خوشی سے بھر سا جاتا کہ صبح ہوگی اور یہ مزے جو اَب ہاتھ نہیں آرہے لیکن منہ جن کی یاد سے پانی پانی ہوا جارہا ہے وہ زبان سے ہم کنار ہوں گے۔ ایک طرب ناک پھریری سارے بدن سے آر پار ہوجاتی۔ کئی مرتبہ وہ گھر میں کسی بات پر اُداس بیٹھا ہوتا یا سکول میں کسی چھوٹی موٹی بات پر دل برداشتہ ہوجاتا تو اچانک ان دو آنوں کی یاد کہیں سے اندھیری رات میں بجلی کی طرح چکاچوند مچاتی ہوئی نمودار ہوتی اور ساری برگشتگی، ساری کدورت ڈھل جاتی۔

لیکن اچانک ایک دن آنا کہ وہ سکول جاتے ہوئے ماں کی طرف دیکھتا

تو اس کا ہاتھ ان دو آنوں سے محروم رہ جاتا۔ "بیٹے، آج تمھارے بابا کچھ نہیں دے گئے"

"تو ماں! تم اپنے پاس سے دے دو نا۔"

"میرے لال! آج تو میرے پاس بھی کچھ نہیں۔ بس چار آنے تھے، وہ سب میں ایک ایک کر کے بٹ گئے۔ میں نے سوچا تم تو میرے بہادر بیٹے ہو، بُرا نہیں مانو گے۔"

وہ چپ چاپ سکول چل دیتا۔ شروع میں تو اُسے یہ بات بہت عجیب طرح سے تکلیف دہ محسوس ہوا کرتی کہ آخر مجھ پر یہ ستم کیوں ڈھایا جاتا ہے لیکن پھر اُسے چند دنوں میں پتا چل گیا کہ اس کے بھائی بہن بھی گاہے گاہے اس ستم کے شکار ہوتے رہتے ہیں۔

کبھی کبھی اُس کی ماں اُسے یہ دو آنے دے کر پھر واپس لے لیتی کہ بیٹا آج مجھے ان کی ضرورت ہے، مجھے دے جاؤ۔ کبھی کبھی اُس کے یہ دو آنے کسی دوسرے بھائی بہن کو دلوا دیئے جاتے کہ اُنھوں نے یہ یا وہ چیز لینی ہے۔ یہ بجا ہے کہ خود اس کی خاطر کئی مرتبہ اس کے بھائی بہن اپنے جیب خرچ کے بغیر سکول گئے لیکن وہ چند دن جب وہ اس عیش سے بہرہ ور نہ ہوتا اس کے ذہن میں ایک خلش سی چھوڑ جاتے، تلخی سی پیدا کر دیتے۔ وہ جوں جوں بڑا ہوتا گیا اُسے حیرت ہوتی کہ آخر یہ بھی کیا ہوا کہ بعض اوقات گھر میں چند آنے بھی نہیں ہوتے۔ پھر آنوں ہی کی بات نہ تھی۔ کبھی کبھی اُسے اپنے حصّے کی مٹھائی یا کھلونے کسی مہمان بچّے کے لیے چھوڑنے پڑ جاتے، نئے جُوتوں کے لیے مہینوں انتظار کرنا پڑتا، کپڑوں کا بھی

یہی عالم تھا، کسی کو مل گئے، کسی کو نہ ملے۔ کچھ اسی ڈھب سے وہ بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی کی سرحدوں میں داخل ہوا۔ کبھی شادکام لیکن کبھی دوسروں کی خاطر اس شادکامی سے محروم۔ اس ساری ڈھب کُڈھب زندگی کے باوجود ایک بات عجیب تھی، ان بھائی بہنوں میں بلا کا پیار تھا اور سب کے سب ماں باپ پر جان دیتے تھے۔

اب برسوں ہوئے اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کے اپنے تین بچے ہیں۔ ایک تو پُورا جوان ہے، دُوسرا جوان ہو رہا ہے اور دونوں کے درمیان ایک لڑکی ہے۔ لیکن اُس کا دل یہ دیکھ دیکھ کر بیٹھ بیٹھ جاتا ہے کہ ان تینوں میں اینٹ کتے کا بَیر ہے۔ تینوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں۔ اُن میں کوئی بھی تو مل بیٹھنے کی خواہش نہیں رکھتا۔ تینوں ایک دوسرے سے جلتے ہیں۔ جہاں تک روپے پیسے کا تعلق ہے وہ بہت خوشحال ہے، اپنے ماں باپ کی نسبت بہت زیادہ۔ پھر اسے اپنی پُرانی ننھی ننھی محرومیاں یاد تھیں، اُس کی کوشش یہی رہی کہ اس کے بچوں کے سب ارمان پُورے ہوں، وہ جو مانگیں انھیں مل جائے اور یُوں اُس کے بچّوں کو ایک دوسرے کی خاطر چھوٹی چھوٹی قربانیاں کرنے کا کوئی موقع نہ ملا، انھیں یہ نہ سکھایا جا سکا کہ زندگی میں انسان کی ہر خواہش پُوری نہیں ہو سکتی، اُسے اپنی مبہم مبہم اور منتشر منتشر خواہشوں میں سے انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ اب ابھی سے وہ ایسے بے تعلق اور خودغرض ہیں، جب زندگی کی سنگینی کا سامنا کرنا پڑے گا تو کیا ہوگا۔ زندگی کو، زندگی کی ہر نعمت کو اپنا حق سمجھنے والے بچے جب زندگی کی للکار اور کبھی کبھی کی ناکامی

سے دوچار رہوں گے تو سرِ بازار وحشی جانور کی طرح حیران اور ششدر کھڑے نظر آئیں گے —— بے منزل، بے زادِ راہ۔

اسے اب رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ اس کے ماں باپ کے گھر کی محرومیوں میں تلخی کے باوجود کتنی حقیقت تھی، صداقت تھی، مٹھاس تھی اور وہ جینے کے لیے کتنی لازم تھیں۔

کسی کی پہچان

وہ نہا دھو کر، بن سج کر آئینے میں آخری مرتبہ جھانکتی ہے اور بیٹھک کے دریچے میں تیز برقی روشنی کے مقابل آ بیٹھتی ہے۔ دن بھر کے سوئے سوئے، اجڑے اجڑے بازار میں چہل پہل کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ ارد گرد کی اکثر بیٹھکیں روشنی سے جگمگا رہی ہیں اور محلّے بھر کی ہر رونق سنگار خانے سے نکل کر تازہ تازہ اپنے اپنے دریچے میں پہنچ رہی ہے۔ دیکھتے دیکھتے بازار بھانت بھانت کے لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا ہے۔ کچھ لوگ پان سگریٹ کی دکانوں پر جمگھٹوں کی صورت میں کھڑے ہیں۔ کوئی پان لے رہا ہے کوئی سگریٹ، کچھ ویسے ہی کھڑے ریڈیو سن رہے ہیں لیکن اصل میں ہر کوئی دریچوں کی رونق کو نظروں ہی نظروں میں جانچ تول رہا ہے کہ رقم کا سب سے اچھا استعمال کون ہے۔ اُدھر وہ سوچ رہی ہے کہ دیکھیں آج کا دن کیسا رہتا ہے۔ اللہ کسی نیک کا مُنہ دکھائے۔

کسبی کو کسب کے غم میں گھرا رہنے دیجئے — اس شہر کی بہت بے شمار بیبیاں بھی آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہیں۔ چلئے اسی کوٹھی میں داخل ہو جائیے۔ رات جو لمبی چوڑی دعوت یہاں دی گئی تھی اس کا ساز و سامان ہر طرف بے ترتیب پڑا ہے، نوکر چاکر آدھی رات تک کام کرتے کرتے تکان سے چور ہو کر بے سُدھ

پڑے ہیں لیکن مُنہ اندھیرے جاگنے کی عادی بیگم صاحبہ کبھی کی مسہری میں کروٹ سے کروٹ بدل رہی ہیں۔ انھیں خود احساس ہے کہ ملازموں کو آج اس وقت جگانا زیادتی ہے لیکن ان کا ہاتھ اب بار بار گھنٹی کی طرف بڑھنے سے رُک نہیں سکتا۔ تھوڑی دیر میں خانساماں دروازے پر کھڑا آنکھیں ملتا ہُوا پوچھتا ہے کہ فرمائیے کیا حکم ہے۔ محکم پینے کے بجائے اُسے اندر خواب گاہ میں یاد کیا جاتا ہے۔ خانساماں کی نیند سے بوجھل آنکھیں آپ ہی آپ پوری کھُل جاتی ہیں۔ ڈھیلی ڈھالی شفاف ریشمیں پوشاک میں بیگم صاحبہ کا تیر عیاں نیم نہاں گورا چٹا جان دار بدن سمٹتے، کسمسانے، اُبھرنے اور ڈوبنے میں مصروف ہے اور بیگم صاحبہ معذرت چاہتے ہُوئے درخواست کر رہی ہیں کہ مہربانی سے اُنھیں ذرا چائے کا ایک پیالہ مل جائے۔ اب خانساماں یا تو حواس باختہ ہو چکا ہے یا اس کے حواس اتنے بیدار ہو چکے ہیں کہ نیند کوسوں دُور بھاگ چکی ہے۔ بہرحال وہ بیگم صاحبہ کی فرمائش کا سامان کرنے چل دیتا ہے۔

آپ کہتے ہیں یہ اونچے طبقے کے ڈھنگ ہیں۔ چلئے یہ قریب ہی کپڑے کا بازار ہے جہاں سیکڑوں پردہ دار بیبیاں ملیں گی۔ یہی ہمارے آگے آگے جو خاتون خوب کس کسا کر برقع اوڑھے چل رہی ہیں میرا اندازہ ہے کہ یہ بھی کپڑا خریدنے ہی کی نیت سے گھر سے نکلی ہیں۔ جی ہاں، مُڑی تو اسی طرف ہیں۔ آپ زیادہ اِدھر اُدھر نہ دیکھیں، اسی خاتون کو نگاہ میں رکھیں۔ لیجئے وہ ایک دکان پر رُک گئی ہیں اور کپڑا دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ ان کا نقاب کبھی ایک طرف سے، کبھی دُوسری طرف سے سرکنا شروع ہو گیا ہے۔ اب مول تول

کی نوبت آگئی ہے ۔ وہ رعایت چاہتی ہیں لیکن دکاندار مان ہی کے نہیں دے رہا۔ آپ زیادہ حیران نہ ہوں، اکثر ایسا ہوتا ہے ــــ اب اُن کا نقاب پُورے کا پُورا اُلٹ چکا ہے ۔ کھُلے چہرے کی زیبائش، جھُکی جھُکی آنکھیں جو اچانک دکاندار کی آنکھوں سے چار ہو جاتی ہیں، اور کسی دوسری دُکان پر تشریف لے جانے کی میٹھی میٹھی دھمکیاں دیتی ہوئی زبان، آخر دکاندار کا دل پسیج جاتا ہے اور وہ دس روپے کا کپڑا ساڑھے نو روپے میں خرید کر ایسی خوش خوش گھر لوٹ رہی ہیں کہ انھیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اُن کے چہرے پر نقاب پڑا ہوا تھا ــــ آپ فکر مند نہ ہوں اُن کا گھر قریب آئے گا تو انھیں نقاب ڈالنا ضرور یاد آجائے گا۔

لیکن دیکھئے آپ اس معاملے میں کوئی رائے قائم کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیں ۔ کوٹھی والی بیگم صاحبہ اور کپڑے والی خاتون کسبیاں نہیں ہیں ۔ وہ تو محض وقتی طور سے موقع موقع پر ایسی بن جاتی ہیں ۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ ان کے پاس اُن موقعوں کے لیے اجازت نامہ نہیں ہوتا اور انھیں کوئی کسبی کہتا بھی نہیں ۔ یُوں بھی اگر آپ کی بات مان لی جائے کہ جو عورت اپنے جسم، زیبائش یا ادا کی قیمت وصول کرتی ہے، وہ طوائف یا کسبی ہے تو پھر وہ لاکھوں کروڑوں بیاہتا عورتیں بھی کسبیوں کے زمرے میں شامل ہو جائیں گی جو کسی طور نہ مانتے ہوئے خاوندوں سے اپنی جائز و ناجائز، اہم یا غیر اہم فرمائشیں پُوری کرانے کے لیے اُن کے گلوں میں بانہیں ڈال دیتی ہیں اور پیار کے ہنگامے میں وعدہ وعید لے لیتی ہیں بلکہ ان خطوط پر کچھ اور آگے بڑھا جائے تو وہ خاوند بھی طوائفیں ہی ہیں جو اپنے

اقتصادی اور معاشرتی فیصلوں کو تسلیم کرانے کے لیے بیویوں کو جسمانی پیار کی ڈوری دے کر ان سے ہر بات منوا لیتے ہیں اور وہ مرد بھڑوے ہیں جو بیویوں، بہنوں اور لڑکیوں کو سماجی مرتبہ یا مالی فائدہ حاصل کرنے کے لیے آگے کرتے ہیں: کوئی بی بی پُورا سنگار کر کے کسی سرکاری دفتر میں کسی درخواست کا فیصلہ کرانے تشریف لا رہی ہیں، کوئی بی بی فون پر شیریں سخنی کا ثبوت دیتے دیتے میاں کے دوست کو دس بیس چھوٹے موٹے کام بھی کرنے کے لیے کہہ رہی ہیں، کسی بی بی کا کسب یہ ہے کہ وہ بزم آرائی کریں، کسی بی بی کا کسب یہ ہے کہ وہ میاں کے افسروں سے ہنسا بولا کریں۔ لیکن کسب کے باوجود یہ بیبیاں کسبیاں نہیں — پُوچھ کر دیکھ لیں۔ کسبی تو وہی ہے جو بازار میں بیٹھتی ہے۔

نیکی کا شوق

وہ نہ جانے کب سے پڑھتا اور سُنتا چلا آیا تھا کہ نیکی کرنی چاہیے۔ بات بھی ٹھیک تھی، واقعی اگر کوئی نیکی کر سکے تو اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ بچپن بس اُس نے بیسیوں بلی کے بچوں کو کھلنڈرے لڑکوں کے پنجوں سے بچایا جو ان کے گلے میں رسی باندھ کر انھیں بے دردی سے بازاروں میں گھسیٹتے پھرتے تھے۔ اُس نے کتنے ہی مرے ہوئے کبوتروں اور چڑیوں کو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے ننھی ننھی قبروں میں اتارا۔ اُس نے کئی کئی دن ایسے گزارے کہ گھر میں چڑیوں کے گھونسلے سے بے بال و پر بچے فرش پر گر رہے ہیں اور وہ انھیں اٹھا اٹھا کر واپس گھونسلے میں رکھ رہا ہے۔ اِدھر وہ سیڑھی سے اُترتا اُدھر بچے پھر نیچے آ رہتے۔ اسی طرح ایک مرتبہ اُن کا کتا بیمار ہو گیا تو وہ اُسے خود گود میں اٹھا کر کتوں کے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور پھر کئی دن اس کی تیمارداری کرتا رہا اور راتوں کو اس کے لیے دُعا مانگتا رہا۔

اس کی ماں اور بہنیں اس کی ان باتوں پر پھولے نہ سماتی تھیں۔ ہر آئے گئے سے ذکر ہوتا کہ دیکھیے کتنا نیک دل لڑکا ہے۔ اُسے ان باتوں میں ایک دلکشی اور لطف محسوس ہوتا۔ پھر آہستہ آہستہ اُس نے نیک دلی کا باقاعدہ اہتمام کرنا شروع کر دیا۔ بس نیک دلی کے اظہار کا موقع ہونا شرط ہے اور وہ حاضر موجود پایا جاتا۔ کئی

مرتبہ اُس نے کسی دُور کے عزیز کی بیماری کا سُن کر دس پندرہ میل سائیکل چلائی۔ کئی مرتبہ وہ کسی ہم جماعت کے کام آنے کے لیے اپنے کام سے گیا۔ اُسے اکثر اندھوں کو سڑک پار کراتے اور فقیروں میں جیب خرچ بانٹتے دیکھا جاتا۔ اب اس کے نیکی کے شوق میں والدہ یا بہنوں یا عزیزوں کی داد و تحسین کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی ممنون و متشکر نگاہیں بھی اطمینان اور طمانیت کا باعث ثابت ہونے لگی تھیں جن سے وہ نیکی کرتا تھا۔ بلکہ کئی مرتبہ اُس نے محسوس کیا کہ اگر اس کے حسنِ سلوک کے جواب میں کسی نے اُس کا ڈھنگ سے شکریہ ادا نہیں کیا تو وہ کچھ بدمزہ سا ہو جاتا ہے۔

بہرحال اسی طرح دن پر دن گزرتے چلے گئے اور وہ نیکی کی راہ پر خاصا دُور نکل گیا۔ گھر میں، دفتر میں، عام معاشرتی زندگی میں — جہاں بھی اسے موقع ملتا وہ اپنے اس پرانے دستور کے مطابق اپنی نیک دلی کا اظہار کرنے سے نہ چوکتا۔ گھر میں اگر ملازم نے برتن توڑ دیئے ہیں اور والدہ یا بہن یا بیوی نے اُسے ڈانٹ دیا ہے تو وہ ملازم کی طرف داری کرتا: کیا ہے چینی کے برتن آخر ٹوٹتے ہیں، خود آپ سے پرسوں ایک پیالی نہیں ٹوٹ گئی تھی۔ ملازم کی آنکھوں میں اپنے لیے تشکر سے اُسے جو نشہ سا چڑھتا وہ اُسے دوبالا کرنے کے لیے اکثر اس کے کمرے میں بھی چلا جاتا۔ باتوں ہی باتوں میں اس سے گھر والوں کی بدمزاجی کا تذکرہ کرتا کہ یہ لوگ خاص طور سے گھر کی عورتیں تو ملازموں کو انسان ہی نہیں سمجھتیں، تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہیے، جانے دو، غصہ تھوک دو۔

دفتر میں کسی کلرک کو افسر سے جھاڑ پڑتی تو اس سے ہمدردی کا اظہار کرنے

میں بھی اکثر وہی پہل کرتا۔ دفتر میں اُس کا مرتبہ دوسرے سب سے بڑے افسر کا تھا۔ بڑے صاحب کے خلاف ہیڈ کلرک سے چپراسی تک کے مُنہ سے بکواس اور اپنی خوش اخلاقی کا تذکرہ سُن کر اُسے بڑا ہی سرور آتا۔ یہ اُس کا روزمرہ کا طریقہ تھا کہ صبح دفتر میں ہر کسی کا نام لے کر اُسے سلام کرتا اور مزاج پُوچھتا۔

کچھ یہی طریقہ عام زندگی میں برتا جاتا۔ کئی چوروں، اچکّوں اور زانیوں کو اُس نے یُوں اپنے پروں میں سمیٹ لیا جیسے مُرغی اپنے بچّوں کو سمیٹتی ہے۔ کسی کی تھانیدار سے سفارش کر دی، کسی کی تحصیلدار سے، کسی کی ڈپٹی کمشنر سے۔ جدھر سے نکل جاتا، دو چار لوگ جُھک کر، باچھیں کھلا کر سلام کرتے۔ "بھئی آدمی دیکھا ہے تو یہ۔ بڑا مرد آدمی ہے۔ بڑا ہی شریف۔ بھاگوان!"

لیکن اس بھاگوان، شریف، مرد آدمی نے شاید ایک بات کبھی نہیں سوچی کہ اس کے اس شوق کے ہاتھوں اس کے گھر کے ملازم کس حد تک بدتمیز ہو گئے ہیں اور دفتر کی کارکردگی پر کتنا بُرا اثر پڑا ہے اور محلّے اور شہر میں کتنے بے گناہوں کی لُٹیا ڈُوب گئی ہے اور کتنے معصُوموں کی عزّت پر حرف آ چکا ہے۔ اُسے تو بس نیکی اور حُسنِ سلوک ہی سے فُرصت نہیں ملتی کہ وہ یہ بھی دیکھے کہ ان کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ بہر حال اس کی نیّت نیک ہے اور اللہ نیّت ہی دیکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نیّت میں نیکی شراب کے نشے کی طرح لہریں لیتی رہتی ہے اور اسے شرابیوں کی طرح غٹ رکھتی ہے۔۔۔ نتائج و عواقب سے بے خبر، بے تعلّق۔

آم کی گھٹلی

اب یہ بھی کوئی عُمر تھی ایسی باتیں سوچنے کی ۔لیکن اُس کے دل میں تو کچھ ایسی کھُد بُد لگی ہوئی تھی کہ عُمر دم کی پھر کسے خبر رہتی ہے ۔یہ نہیں کہ اس کے ماتھے پر محراب کے ٹیکے نے پاؤں پسار لیے تھے ، یا ہاتھوں کی انگلیوں کو خلوت کے ساتھ ساتھ جلوت میں بھی ۳۳ دفعہ یہ اور ۳۴ دفعہ وہ دُہرانے کی عادت ہو گئی تھی ۔وہ تو سادا آدمی تھا ، اسے ان اسرار و رموز کی کیا خبر تھی کہ کیا کریں یا پڑھیں تو اتنا یا اُتنا ثواب حاصل ہوتا ہے بلکہ اُس نے تو شاید اس انداز سے سوچا بھی کبھی نہ ہو ۔اُسے تو زندگی کے منظر نے کبھی کسی ایسی جگہ چھیڑا تھا کہ اب اُس کی آنکھیں اور کان وہ پہلی سی آنکھیں اور کان ہی نہ تھے کہ زندگی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہے جاتے ـــــ دیکھنے سُننے کے لیے دو گھڑی بھی نہ رُکتے ' اور دل و دماغ وہ پہلے سے دل و دماغ رہے ہی نہ تھے کہ زندگی کو جیسے کیسے گزرنے دیتے ـــــ سوچنے سمجھنے کے لیے دو گھڑی بھی نہ رُکتے ۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب پانی پینے کے ساتھ صبح ہوتی ہے اور پانی پیتے پیتے رات ہو جاتی ہے ۔پسینہ تو پسینہ پیشاب تک نہیں آتا ۔دن میں بیس بائیس سبُو پانی پی جائیے ، نہ جانے وہ کہاں گم ہو جاتا ہے ۔کمرے تنور بنے ہوتے ہیں اور دن بھر آپ کا بُھرتا بنتا رہتا ہے ، پانی تو پانی رگوں سے عرق غائب ہو جاتا

ہے۔ اُسے علم تھا کہ ایسے کمرے بھی ہوتے ہیں جہاں لوگ ایسے میں بھی سوٹ بوٹ ڈاٹ کر بیٹھتے ہیں کیونکہ ان کا درجۂ حرارت سرما نظیر ہوتا ہے، کبھی کبھی اس کا ان کمروں میں گزر بھی ہوتا تھا، لیکن اس کا اپنا کمرہ تنور صفت ہی تھا، شام کو جب اُس کا قالب خشک خشک بلکہ خستہ خستہ ہونے لگتا تو وہ سائیکل اُٹھاتا اور دفتر سے گھر کا رُخ کرتا۔ دن بھر کے جھلسے ہوئے مکانوں اور مکینوں کی منتشر لیکن گھنی گھنی بونھتوں سے ٹکراتی۔ سڑکوں پر لید اور گوبر سے بھری ہوئی بوجھل اور خوابیدہ ہوا کپڑوں، چہرے اور سر کے بالوں سے کھیلتی، آنکھوں میں گھستی، کانوں میں گھستی، آنکھیں دیکھنا نہ چاہتیں، کان سننا نہ چاہتے، ٹانگیں انتظار کرتیں کہ گھر آئے تو وہ بھی دراز ہوں۔ مگر کیا کیا جائے۔ گھر بھی تو بڑے شہروں میں اتنے دُور دُور ہیں۔

اور آج تو گھر اور بھی دُور ہو گیا تھا۔ مہینہ بھر ہو چلا تھا ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے وہ اپنی بہن سے ملنے نہ گیا تھا۔ بہن کو بھی نہ جانے کیا سوجھی تھی، اتنی دور گھر بنوایا تھا کہ دفتر سے اس کے یہاں جاتا تو یہی محسوس ہوتا کہ ابھی وہ دفتر ہی میں ہے اور گھر جانا باقی ہے۔ بہرحال سائیکل نے بہن کا گھر دیکھ رکھا تھا، اُسے تو جیالا نہیں تھا کہ ٹانگیں وہاں پہنچیں گی لیکن پہنچ ہی گئیں۔

کیسے تھے اور کیسے ہیں کے بعد بہن جلدی جلدی ٹھنڈا پانی لائی اور اُس نے باپ کے سکھائے ہوئے آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تین سانسوں کے بجائے ایک ہی سانس میں پانی کا گلاس حلق کے پار کر دیا۔ حواس ٹھکانے ہوئے تو بہنوئی سے باتیں ہونے لگیں۔ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ بہن پلیٹ میں نئی بہار کا ایک

بڑا سا آم کاٹ کرلے آئی اور پلیٹ اُس کے ہاتھ میں تھمادی۔

اُسے یاد آیا: کتنے بہت سے دن ہو گئے ہیں کہ گھر جاتے ہوئے وہ بیوی بچّوں کے لیے کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں لے گیا۔ جب سے مالٹوں کا موسم گیا ہے گھر والوں نے پھل کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ شہتوت، فالسے آلوچے شام تک یہ بک بکا جاتے ہیں اور دوسرا کوئی پھل ابھی چلا نہیں۔ آم ہیں تو لیکن مہنگے۔ ابھی حوصلہ ہی نہیں ہوتا ان کی طرف دیکھنے کا۔ برف میں لگے ہوئے آم کی پلیٹ اُس کے ہاتھوں میں زہر خند بن کر رہ گئی۔ بہن نے دیکھا کہ اچھا بھلا ٹھنڈا آم پڑا پڑا اُبل رہا ہے تو اُس نے کھائیں نا کے ذریعے توجّہ دلائی۔ ستم بالائے ستم آم مزے دار تھا، جُوں جُوں حلاوت اور رکھلاوٹ کا احساس جسم میں سرسراتا توں توں پشیمانی کی کاٹ گہری ہوتی جاتی ــــ اتنا اچھا آم میں اکیلا کھا رہا ہوں۔ شاید اُسی پشیمانی کو مٹانے کی خاطر اُس نے اب کے قاش کے بجائے گٹھلی اٹھالی تھی۔ اندر ہی اندر وہ جانتا تھا کہ نئی بہار کا آم ہے گٹھلی سے کھٹا ہوگا۔

واقعی پشیمانی کا نشہ گٹھلی کی تُرشی نے اُتار دیا، اُس کے ذہن نے ایک پٹڑی بدلی۔ آج کے دن سے وہ ایک اور دن کے منظر میں اُتر گیا۔ وہ دن جب لوگ فرداً فرداً دلوں کے مالک کے سامنے جائیں گے، کوئی کسی کو پہچانے گا نہیں کوئی کسی اور کے لیے نہیں صرف اپنے ہی لیے پشیمان ہوگا ــــ اس دن کیا ہوگا، ــــ اس دن کیا ہوگا؟ ــــ اس دن کیا ہوگا جب سب رشتے ٹوٹ جائیں گے اور مرد اپنی صاحبہ کو اور عورت اپنے کوکھ جنوں کو بھول جائے گی۔

— گٹھلی جو ہاتھ سے پھسلی تو حلق میں اٹک گئی۔ بہنوئی نے اُس کی آنکھیں باہر آتی دیکھیں تو جلدی سے اُٹھ کر اُس کی پُشت پر مُکّے مارے۔ گٹھلی حلق سے باہر آئی تو وہ کمرے سے نکل آیا اور دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا— باہر سے دھندلا دھندلا، اندر سے رویا رویا۔

بہن نے میاں سے مخاطب ہو کر کہا: "کتنی تکلیف ہوئی بھائی کو۔ اور میاں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا، بات ہی ایسی تھی— ہمارے یار کو آم کھانا بھی نہ آیا تھا۔

شہر کی بپتا

دُور دُور تک پھیلے ہُوئے ملک کے ایک گوشے میں مستقبل کا ایک شہر ابھی محوِ خواب تھا۔ اس کی زمین گھنے درختوں سے ڈھکی تھی اور گھنے درختوں کے گھنے سایے انسان کو قریب آنے کے بجائے دُور دُور رہنے کا اشارہ کرتے تھے۔ لیکن انسان روزگار کے چکر میں کچھ ایسا پھنسا ہے کہ وہ عناصرِ فطرت کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے ان کی بات کو ٹالتا بلکہ نظر انداز کرتا رہتا ہے۔ یہ گھنے درخت اور ان کے گھنے سایے انسان کے لیے خوف کے بجائے کشش کا باعث ثابت ہوئے۔ اُس نے جنگل کے ایک سرے پہ اپنی کُٹیا کی بناء رکھ دی اور جنگل کی لکڑی سے کھڑکیاں، دروازے، شہتیر اور کڑیاں بنالیں۔ لگے ہاتھوں چُولھا گرم کرنے کا سامان بھی ہو گیا۔ لیکن ایک آدھ دن ہی میں اس پر یہ بات کھُل گئی کہ چُولھا گرم رکھنے کے لیے صرف لکڑی ہی نہیں، ہنڈیا اور توے کی بھی ضرورت ہے بلکہ ہنڈیا میں پکنے کے لیے گوشت اور ترکاری کی ضرورت ہے اور توے کے لیے آٹے کی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اُس نے سوکھی سوکھی لکڑیوں کا ایک گٹھا تیار کیا اور دُور کی ایک منڈی میں لے گیا جہاں اُسے اُس کے عوض کچھ رقم مل گئی جس سے اُس نے آٹا دال، لون تیل — فوری ضرورت کی چیزیں خریدیں اور گھر لوٹ آیا۔

اب اس کے منہ کو لہو لگ چکا تھا۔ آئے دن منڈی کے لیے زادِ سفر تیار کرتا اور بھری جیبوں کے ساتھ گھر لوٹتا۔ لیکن کیا دوسروں کی آنکھیں نہیں تھیں کہ اُسے اتنی آسانی سے دولت سمیٹتے دیکھتے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے۔ ان کی کھلی آنکھوں کے سامنے وہ اپنی پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھا کر منڈی لاتا رہا تھا اور اب اُس کے پاس تین بیل گاڑیاں تھیں اور چھ ملازم اُس کے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ بڑی بات تو یہ تھی کہ جنگل کوئی اُس کے باوا کا تو تھا نہیں چنانچہ سال دو سال میں اس کے گھر کے پاس دس بیس اور گھر بھی دکھائی دینے لگے اور منڈی کے راستے پر اُس کی بیل گاڑیوں کے آگے پیچھے دس بیس اور بیل گاڑیاں بھی آتی جاتی نظر آنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کا یہ سرا اچھے خاصے گاؤں میں ڈھل گیا اور جوں جوں اس گاؤں کے مکینوں کے پاس سونے چاندی کی ریل پیل ہوتی گئی گاؤں کا نقشہ بدلتا چلا گیا۔ گاؤں قصبے میں بدلتا چلا گیا۔

اتفاق ملاحظہ فرمائیے کہ جہاں یہ قصبہ وجود میں آیا تھا وہ جگہ زمین کے کئی نشیب و فراز کا سنگھم تھی۔ کتنے ہی راستے اور کتنی ہی ندیاں وہاں ایک دوسرے کے استقبال کے لیے جمع تھیں۔ لوگوں نے آہستہ آہستہ محسوس کر لیا کہ بہت سی دُور کی منڈیوں کے بجائے یہ قصبہ کہیں اچھی منڈی ثابت ہو گا کیونکہ یہاں پہنچنے کے لیے زمین خود بخود راستے مہیا کر رہی تھی۔ دنوں میں دُور دُور سے لوگ یہاں کاروبار کے لیے پہنچنے لگے اور یوں یہ قصبہ پھیل کر، پھُول کر شہر کی صورت اختیار کرنے لگا۔

جس زمین کی بدولت لوگوں کو پہلے لکڑی، گندم اور کھانے پینے کی دوسری

ضروریات مہیا ہوتی تھیں وہ آہستہ آہستہ شہر کی عمارتوں، گلی کوچوں، بازاروں اور سڑکوں میں بٹ گئی۔ پھر بھی زمین ایک عرصہ خاصی عام رہی اور انسانوں کو ایک دوسرے سے دشمنی مول لینے کی حاجت نہ پیش آئی۔ لیکن زمین کا معاملہ زن اور زر کی طرح ہمیشہ جھگڑے کی جڑ رہا ہے۔ زمین کی کمی کے ساتھ ساتھ لوگوں میں رقابت، حسد اور چپقلش نے سر اُٹھایا اور یوں ان مصیبتوں کے ازالے کے لیے شہر کی انتظامیہ وجود میں آئی — شہر اب خوش تھا۔ نہ تو وہ دن تھے کہ دُور دُور تک آدمی کی صورت نظر نہ آتی تھی اور فطرت کی طاقتوں کے خلاف آندھی، سیلاب اور آگ جیسے موقعوں پر کسی طرف سے نصرت کی توقع نہ ہوتی تھی اور نہ ابھی وہ دن آئے تھے جو بعد میں آ ہی گئے۔ ابھی تو لوگ دوسرے لوگوں کے معاملات سے، ان کی صورت شکل سے، اُن کی عادات سے، ان کے اطوار سے واقف تھے۔ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے تھے اور ایک دوسرے کی غمی خوشی میں شریک ہوتے تھے۔ انتظامیہ قائم ہونے کے بعد تو جھگڑے بالکل ہی کم رہ گئے تھے۔ باقی جہاں دو برتن رکھے ہوں وہ آپس میں کھنکتے ہی ہیں؛ چھوٹے موٹے جھگڑے تو شہر کی زندگی میں گرم مصالحے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بڑی بات تو یہ تھی کہ ہر کوئی یہ جانتا تھا کہ خرابی کی جڑ کون ہے؟ دو چار دن میں اُس شخص کی نشاندہی ہو جاتی اور وہ شہر بدر ہو جاتا۔ شہر کی روح شہر کے جسم میں رہتی تھی کیونکہ شہر والے اس جسم کی حفاظت کرتے پاک رکھتے تھے۔ لیکن شہر کی یہ کیفیت زیادہ دن زمانے کو راس نہ آئی۔

زمانہ بدلا اور شہر کی صورت بھی بدل گئی۔ فصلوں کی طرح اُگتے ہوئے انسانوں

کے لیے بیش از بیش مکانیت کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ستم بالائے ستم زندگی کا معیار بھی بدل گیا۔ لوگوں کی خواہشیں پھولنے لگیں اور ان کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا۔ اُنھیں پورا کرنے کے لیے روپے کی ضرورت تھی اور روپیہ پیدا کرنے کے لیے شہر میں رہنے کی۔ چنانچہ سارا بوجھ شہر کے سر پر آ پڑا۔ گلی، کوچے، بازار، سڑکیں لوگوں سے اَٹ گئیں۔ گھروں میں لوگ ٹھُس گئے۔ جب شہر کسی کیڑوں پڑے بدن کی طرح اپنے ان کیڑوں کو اپنے اندر جگہ نہ دے سکا تو یہ کیڑے جسم کے آس پاس منڈلاتے پھرنے لگے۔ اُنھوں نے شہر کے باہر مضافات میں نئی نئی بستیاں بنانی شروع کر دیں۔ وہی ضرورت جو ایک مرتبہ پہلے بھی ایجاد کی ماں ثابت ہوئی تھی اُس نے چند معماروں کو یہ بات سُجھا دی کہ موجودہ مکانوں کے اُوپر نئی منزلیں بھی تو بنائی جاسکتی ہیں اور نئے مکانوں کو ایک یا دو کے بجائے چار پانچ یا دس بیس منزلوں تک بھی تو اُوپر اٹھایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ شہر کچھ پھیلا اور کچھ اُوپر اٹھا لیکن کہاں تک؟ لوگوں کو لوگوں ہی سے روزانہ کام پڑنا ہے اور ایک دوسرے سے ملنے کے لیے آخر کس حد تک فاصلہ طے کرنا ممکن ہے؟ گھروں نے آبادی کے دباؤ سے دڑبوں کی صورت اختیار کرلی، کابکوں کی صورت اختیار کرلی۔ یہاں تک تو خیر تھی لیکن ہوا یہ کہ اتنے لوگوں کے ہجوم میں کوئی شخص یا شہری دوسروں سے بخوبی واقف نہ ہو سکتا تھا۔ وہ جو پہلے بُرائی کی جڑ کا جھٹ پٹ پتا چل جاتا تھا اب وہ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی تھی۔ روپے کے چکّر میں لوگ اس طرح اسیر تھے کہ اپنا ہی ہوش نہ تھا، دوسروں کی کیا خبر رکھ سکتے تھے۔ اور جس شہر میں لوگ لوگوں کو جانتے نہ ہوں، اُس کی رُوح مرجاتی

ہے یا پھر کہیں اور چلی جاتی ہے -
اب شہر کی لاش کو اَن گنت شہری کیڑوں کی طرح کھاتے رہتے ہیں اور شہر کی رُوح بلبلاتی رہتی ہے -

سوچ کو لگام

اپنا اپنا ڈھنگ ہوتا ہے نا سوچنے کا، بہتر ادہ سوچ کو لگام دیتی لیکن زبان پکڑی جا سکے تو پکڑی جا سکے، سوچ کو بھلا کون پکڑ سکتا ہے۔ سوچ کے دھارے کا رُخ تو سوچ ہی کا کوئی دوسرا دھارا موڑ سکتا ہے۔

موت کا خیال زندگی کے ساتھ ہی جنم لیتا ہے بلکہ یُوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ بھی موت ہی کی منزل تک پہنچانے کا وسیلہ ہے۔ زندگی، زندگی نہیں موت کا راستہ ہے — ایک موت سے دوسری موت تک۔ موت کا خیال اس کے دل و دماغ کی تنہائیوں کا رفیق تھا۔ جوانی میں زندگی کا جتنا زور ہوتا ہے اتنا ہی اس عمر میں تنہائی کا زور بھی تیکھا ہوتا ہے اور اتنے ہی زور سے موت کا خیال وجود کی تاریکیوں سے اچانک اُبھرتا ہے — زندگی کی جوان گھٹا پر موت کی بجلی، لمحہ بھر ہی کو سہی، چمکتی ہے تو دیر تک آنکھوں اور کانوں کو اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

لیکن ایک بات ہے، اُس کی سوچ کا دھارا اپنی ہی جان کی جانب مرکوز نہ تھا، موت کا خیال آہستہ آہستہ اس کی اپنی جان کی حدود پھاند کر ارد گرد کی جان کا منظر ٹٹولنے لگا تھا۔ اپنی موت کے خیال نے اسے اس بات کا احساس دلا دیا تھا کہ بھرے گھر میں سے جب کوئی اچانک موت کی رفاقت اختیار کر لیتا ہے تو زندوں

پر کیا بیتتی ہے۔ وہ سوچتی کہ میں مرجاؤں تو میرے بچوں کا کیا بنے گا؟ میاں کی ویرانیوں کا کیا ٹھکانا ہوگا ۔۔۔ پھر خیال آتا کہ میاں مرجائے تو کیا ہوگا ۔۔۔ کسی بچے کو خدانخواستہ کچھ ہو ہوا جائے تو! بہرحال اب وہ اس بات سے بخوبی واقف تھی کہ موت چلتے پھرتے بچوں، جوانوں اور جواں ہمت بوڑھوں کو اپنے گھر بلا لیتی ہے تو بھرے گھروں میں کیسے خاک اُڑنے لگتی ہے۔

وہ سنتی کہ فلاں شہر میں سینما گھر کی چھت گر گئی اور پچاس آدمی مر گئے تو وہ سوچتی، آج اس شہر کے پچاس گھروں میں موت کے تاریک اور سرو سایے کیسے کیسے ان لوگوں کے دنوں کو مٹھی میں لیے ہوں گے۔ وہ سنتی کہ فلاں دریا میں کشتی اُلٹ گئی اور بیس آدمی ڈوب گئے تو وہ سوچتی، آج اس کشتی کے مسافروں کے انتظار میں بیس گھرانے رات بھر نہ سوئے ہوں گے اور جب انھیں اس حادثے کی خبر ملے گی تو اُن کی آنکھیں کیا کیا دریا نہ بہائیں گی۔ آئے دن کہیں زلزلہ آتا اور ہزاروں جانیں پلک جھپکتے اپنی لاکھوں کروڑوں اُمیدوں اور آرزوؤں کے ساتھ شہر کی لاش کا حصہ بن جاتیں۔ آئے دن کہیں دبا پھُوٹتی اور سیکڑوں جانیں بیماری کے راستے موت کے گھاٹ اُتر جاتیں۔

زندگی سے چھٹے ہوئے سوگواروں کی سوگواری اخبار کی خبر کی وساطت سے اس کے دل و دماغ میں ایک گہرا سایہ اُبھارتی اور وہ کچھ دیر کے لیے اپنی آنکھیں اس خبر سے ہٹا نہ سکتی۔ اکثر ایسا ہوا کہ اُس نے مختصراً ساری بات سمجھ لی لیکن ایک عجیب طرح کی ذمّہ داری کے تحت وہ اپنے آپ کو مجبور سا پاتی کہ ساری خبر ۔۔۔ لفظ بہ لفظ ۔۔۔ پڑھے۔ اُسے محسوس ہوتا کہ دیکھو اتنے ڈھیروں لوگ مر گئے ہیں

اور ہیں اتنا بھی نہیں کر رہی کہ خبر ہی پڑھ لوں حالانکہ اُن کے لیے آج اتنی جانیں غم بجاں ہوں گی۔ اُسے شرم سی آتی تھی کہ وہ ایسی کسی خبر کو نظر انداز کر دے۔

خبر تو وہ بھی اسی نوعیت کی تھی لیکن اُسے پڑھ کر غصہ آگیا۔ اُس نے ہمیشہ دیکھا تھا کہ ایسی خبریں اخبار میں یوں درج ہوتی تھیں جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں۔ پچاس آدمی مر گئے، سو آدمی مر گئے، یہ بات اخبار والوں کے لیے گویا معنی ہی نہ رکھتی تھی۔ کہیں اندر کے کسی صفحے پر ساڑھے تین سطری خبر چپکا دی جاتی تھی۔ بہت ہُوا تو شروع کے صفحے پر ننھا سا چوکھٹا بنا دیا لیکن آج جو اُس نے اخبار کی شہ سُرخی دیکھی تو اس میں ذکر تھا کہ فلاں مُلک میں فساد ہو گیا اور دو آدمی مارے گئے۔ مانا کہ دو آدمیوں کا مارا جانا کوئی معمولی بات نہیں لیکن آخر آج اخبار والے اس واقعے پر بھلا اتنے کیوں مہربان ہو گئے۔ اپنے مشرقی پاکستان میں چالیس آدمی ایک کارخانے کی دیوار گرنے سے ہلاک ہو گئے تھے تو یہ خبر چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی خبروں کے جلے میں دکھائی نہ پڑتی تھی۔ کوئٹہ میں ایک "پُراسرار" مرض ہر روز بیسیوں جانیں ہڑپ کر جاتا تھا اور اُس کی خبریں چھپی چھپی ڈھکی ڈھکی ہوتی تھی جیسے خطرہ ہو کہ کوئی دیکھ سُن نہ لے۔

دن بھر وہ دل ہی دل میں اس دھاندلی پر کھولتی رہی۔ رات کو میاں دیر سے آنے والا تھا، بچوں کو سُلا کر اُس نے ریڈیو جو کھولا تو کوئی صاحب مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ محرم کے دن تھے، وہ باادب بیٹھی سُنتی رہی سُنتی رہی، پھر سوچ کا ایک دھارا ایسا چھُوٹا کہ اُسے کچھ خبر نہ رہی کہ وہ ریڈیو سُن رہی تھی اور ریڈیو سے آواز اُٹھ رہی تھی۔ اُس نے سوچا ہمارے حضرت حسینؓ کو بھی تو موت آئی تھی اور یہ

موت ایسی ہے کہ آج بھی جب دس محرم آتی ہے تو ہمارے اخباروں کی سُرخی ہوتی ہے کہ مُلک بھر میں حسینؓ کی یاد منائی گئی۔ اس ایک موت کو آخر ہم آج تک کیوں نہیں بھُولے۔ یہ ایک موت آج بھی کروڑوں مسلمانوں کو کیوں ہر سال اتنے زور سے یاد آتی ہے۔ جب سے حسینؓ اللہ کو پیارے ہُوئے کروڑوں انسان زندگی سے موت تک کا سفر کر چکے ہوں گے مگر اُن کی موت کسے یاد ہے، آج کسے رُلاتی ہے؟

ہائے تو کیا موت موت میں بھی فرق ہے — فرق کیوں نہیں، جو موت اپنے دامن میں زندگی نہیں رکھتی، زندگی سے دھڑکتی ہُوئی آرزو، زندگی سے رچا ہُوا عزم نہیں رکھتی، اپنے ہاتھوں میں آدرش کا دمکتا ہُوا سُورج نہیں رکھتی، وہ موت ویسی ہی ہے جیسے سال خوردہ درختوں اور جانوروں کی موت، جنھیں موت کا انتظار ہے کہ وہ زندگی کے کھنڈر سے آزادی بخشے۔ سینما گھر کے ناظر، دریا کے مسافر، زلزلے کا شکار۔ یہ سب لوگ کس خاطر موت سے ہمکنار ہوئے ہ۔ — بس اُنھیں موت نے آن لیا۔ وہ موت سے دو دو ہاتھ کرنے نہیں نکلے تھے۔

تو شاید یہی وجہ ہے کہ جب کہیں اُصول کی خاطر دو آدمی بھی مارے جاتے ہیں تو اُن کی موت زیادہ معنی رکھتی ہے۔

دوسرے دن اخبار میں موت کی کئی خبریں تھیں لیکن اب وہ اُس کی نگاہ کو اسیر نہ کر سکیں۔ موت کے معنی بدل گئے تھے۔

موت کا مُسافر

جب زندگی نے اپنے دروازے اس پر بند کر لیے اور اُس کی جان اس کے وجود کی حدوں میں محصور ہو گئی، روشنیوں سے رشتہ ٹوٹ گیا اور اندھیروں نے اس کی رُوح کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے لیے ہر طرف سے یورش کر دی؛ ٹھنڈی میٹھی ہوائیں نرم گرم جذبات کی طرح دُور دُور بہنے لگیں اور قریب قریب صرف درد کی ایسی گھٹائیں تنی رہ گئیں جو کھُلنے اور برسنے کا نام ہی نہ لیتیں تو اُس نے موت کو مدد کے لیے پکارا، اپنے بازو پھیلا دیئے کہ موت آ کر اس سے ہم آغوش ہو جائے۔

لیکن دُکھ یہ دُکھ تھا کہ موت بھی اپنے آپ سے نہ آ سکتی تھی۔ اب یہی صُورت باقی تھی کہ وہ اپنے پھیلے ہوئے بازوؤں کا رُخ اپنی جان کی طرف موڑ لے اور اپنے اندر، دُور، وجُود کی اجڑی ہُوئی محرابوں میں، جان کے نیم جاں پرند کی پھڑپھڑاتے سے پہلے ہی مٹھی بھر لے، اسے دبوچ لے، دبا لے، دبائے جائے، دبائے جائے، ہمیشہ کے لیے سُلا دے، خاموش کر دے، ابدی سُکھ کی موجوں پہ بہا دے۔

زندگی میں اب رکھا بھی کیا تھا۔ برسوں سے اُمید کی صلیب کو اُس نے اپنے کندھوں سے اتار پھینکا تھا۔ بس اب اچانک اسے خیال آیا تھا کہ وہ

اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا ہے۔ اب بھی تو اسے ایک چیز پر بھروسا تھا — موت پر — کہ وہ خود بخود آجائے گی اور اسے اپنی گود میں بھر کر، اُس کی رُوح کو زندگی کی اندھیری، دُکھ بھری دلدل سے نکال کر، ابد کے منوّر ایوانوں میں گھمانے پھرانے لے جائے گی۔

تو کیا یہاں بھی میں اکیلا ہوں، خود مجھی کو، اپنے ہی ہاتھوں سے، اپنے آپ کو اس گھاٹ سے پار اتارنا ہو گا — میرے ہی ان ہاتھوں کو — انھی ہاتھوں کو جو برسوں سے ڈُنڈے پڑے ہیں یا موت کی اُمید میں پھیلے پھیلے سُوکھ گئے ہیں کیا ان میں اتنی طاقت ہے کہ یہ مجھے زندگی کے گدلے، سڑتے ہوئے پانیوں سے نکال کر ابد کی لامکانی، لازمانی وسعتوں سے ہمکنار کردیں، میری رُوح کو میرے چکنا چُور بُت کے ملبے سے کھود کر نکال دیں اور موت کی سُریلی آواز کے پیچھے پیچھے رواں دواں کردیں؟

ارے میرے تو بازوؤں میں اتنا بل ہے، اتنا کس ہے! میں بھی کیا نادان تھا کہ اب تک موت کا منتظر رہا۔ موت تو اپنی جگہ میری شہ رگ پر بیٹھی میرے ان ہاتھوں کی منتظر ہے۔ اب میں جب چاہوں موت کی سرسبز وادی میں داخل ہو جاؤں، مجھے کوئی نہیں روک سکتا، ہفت اقلیم کی چابی تو میرے اپنے ہاتھوں میں ہے، جب چاہوں ساتوں دروازے کُھل جائیں۔

پیارے سے پیارے سفر پر نکلنے سے پہلے جیسے ایک جھرجھری سی آتی ہے ویسے ہی اس کے وجود نے کروٹ سی لی اور دبے ہوئے غضب، دبی ہوئی حسرت نے وجود کو موت سے اتنا قریب پاکر آخری بار سر اُٹھایا — وہ جس نے زندگی

میں زہر بھر دیا، جس نے سب راستوں کو اندھی گلی بنا دیا، جس نے نیند کو کانٹوں کی چبھن دے دی۔ جس نے فضائے یاد سے اُمید کی گرمی نچوڑ لی، ہرے بھرے بدن کو چکنا چُور بُت بنا دیا، وہ کوئی ایسا دُور تو نہیں۔ اُس ظلم کی تصویر تک بھی تو میرے یہ ہاتھ پہنچ ہی سکتے ہیں۔ اگر یہ بری زندگی ختم کر سکتے ہیں تو اس آتی بہت سی زندگیوں سے خون چُوس لینے والی زندگی کو بھی تو ختم کر سکتے ہیں۔ قتل، نہیں یہ قتل نہیں ہوگا۔ یہ میرے پیچھے زندہ بچنے والوں پر رحمت ہوگی، موت کے مسافر کا زندگی کی ظلمتوں میں بھٹکنے والوں پر احسان ہوگا۔ پھر مجھے تو موت چاہیے۔ مرنا تو ہر صورت ہے ہی۔ کیوں نہ اس حسرت کو پُورا کر لوں۔

اُس کی جان اس کے وجُود کی تاریک گپھاؤں سے لڑکھڑاتی ہوئی اس کے ہاتھوں تک آ پہنچی۔ ہاتھوں میں جان آ گئی، جان میں جان آ گئی۔ تو اب وہ جان بھی میرے ہاتھوں میں آ کے رہے گی، وہ جان جس نے مجھے بے جان کر دیا تھا۔

اُس کی حسرت اُس کے غضب میں جذب ہو گئی اور وہ اپنی نظر میں دُنیا کے بدترین شخص کے خاتمے کے درپے ہو گیا۔ اُس نے اپنی جمع پُونجی سمیٹی اور جان ہتھیلی پر رکھ کر اُس شخص کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔

آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے یہ، چل سو چل، نہ جانے وہ کہاں تک پہنچا اور اُس نے کہاں تک تعاقب کیا ۔۔۔ مہینوں بعد اُس کی اپنے آپ سے مُلاقات ہُوئی تو اُس نے اپنے آپ کو اپنے بارے میں عجیب و غریب خبریں سُنائیں۔ اُس نے بتایا کہ اپنے اس پُرعزم اور با مقصد سفر میں اُس نے زندگی کو ایک مرتبہ پھر دیکھا ہے۔ وہ ہوا جو اُس کے لیے چلنا بند ہو گئی تھی اُس نے اُسے پھر سڑکوں، مکانوں، شہروں، دیہاتوں میں بہتے دیکھا ہے۔ وہ روشنی جسے تاریکی

ہڑپ کر گئی تھی پھر فروزاں دکھی ہے۔ وہ لوگ جو بوسیدہ کھنڈر بن گئے تھے
اسے پھر جیتے جیتے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ جان جو وجود کے مرکز میں سمٹ کر گھٹ کر
رہ گئی تھی اب اس کے سارے وجود میں جاری وساری تھی بلکہ وجود سے پھوٹ
پھوٹ کر دوسری جانوں کو اپنی حرارت کی خبر دے رہی تھی۔

اُس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ "اور موت؟"

اُس نے جواب دیا۔ "نہیں، ابھی نہیں، اب چار دن ع۔م اور مقصد کے
شہ زور گھوڑے پر سوار ہو کر زندگی کا رنگ ڈھنگ دیکھوں گا، موت کا کیا
ہے، اُسے میرا انتظار کرنے دو۔ میں نے بھی تو اُس کا اتنا انتظار کیا ہے۔"

ماں کی دُعا

"یا اللہ، یا پاک پروردگار، یہ جو میں نے دس نفل اور قرآن پاک کے دو پارے پڑھے ہیں اور تیرے اسم پاک کی سات تسبیحیں پُوری کی ہیں، یا اللہ تو انھیں مجھ گنہگار کی طرف سے قبول فرما اور اس کا ثواب جناب سرکار مدینہ، سرورِ کونین، رحمۃ للعالمین، خاتم النبیّین، شفیع المذنبین، شمس العارفین، سراج السالکین، صاحب تاج و معراج، صاحب کوثر و تسنیم، صاحب لوح و قلم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ارفع و اعلیٰ رُوح کو پہنچا اور ان کی وساطت سے . . . . "

کوئی ایک سال کا بچہ جو پہلے سو رہا تھا، اب خاصی دیر کا جاگ چکا ہے اور اپنی ماں کو عبادت میں مصروف دیکھ کر، اپنی جانب سے غافل پا کر کچھ کچھ جھنجلانے اور باقاعدہ بسُورنے لگا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ تھوڑی دیر مزید صبر کر لیتا۔ اس کی ماں نماز اور وظیفے سے فارغ ہو کر دُعا مانگ رہی تھی — ہاتھی نکل چکا تھا، دُم باقی تھی۔ لیکن بچے ایسی بات کہاں سمجھتے ہیں۔ جس طرح آخری تنکا اُونٹ کی کمر توڑ دیتا ہے اسی طرح انتظار کا عمیق سے عمیق پیمانہ بھی ایک نہ ایک وقت چھلک ہی پڑتا ہے۔

. . . ." اور ان کی وساطت سے آج تک صفحۂ ہستی پر جو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر تیرا پیغام لے کر آئے ان تک اس کلامِ پاک کا ثواب پہنچا ــ خاص طور پر حضرت آدم صفی اللہ علیہ السلام اور حضرت نوح نبی اللہ علیہ السّلام اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام اور حضرت عیسےٰ رُوح اللہ علیہ السّلام کی ارواح پاک کو اس کلامِ پاک کا ثواب پہنچا۔ پھر روزِ ازل سے آج تک . . . ."

اب انتظار کے آخری تنکے نے بچے کے صبر کی کمر توڑ ہی دی اور وہ باقاعدہ رونے لگا۔ منٹ آدھ منٹ کے لیے وہ اچانک چُپ بھی ہو جاتا۔ لیکن پھر ماں کی طرف ٹکر ٹکر دیکھتے رہنے کے بعد اور اُدھر سے اپنے لیے کوئی اشارہ نہ پا کر پہلے کی نسبت کہیں زیادہ جوش و خروش سے رونے لگتا۔

. . . ." پھر روزِ ازل سے آج تک جتنے ولی، قطب، سالک اور نیک لوگ پیدا ہوئے ہیں ــ خاص طور سے چار یارانِ رسُولؐ، جناب خلیفۂ رسُولؐ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ، جناب فاروق اعظم حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ، جناب ناشر القرآن حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ، جناب اسد اللہ الغالب حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ، کو اور ان کے ساتھ ہی نوجوانانِ جنت کے سردار جناب حضرت امام حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ اور جناب حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ، کو اور تمام شہیدانِ کربلا اور دیگر اہلِ بیت کو اس کلامِ پاک کا ثواب پہنچا۔ پھر چاروں اماموں حضرت

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی ارواحِ مقدسہ کو اور ان کے بعد: . . . "

بچے نے جب صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہ دیکھی تو اُس نے حالات کی لگام اپنے ہاتھ میں لینے کی ٹھانی۔ وہ چپکے سے اپنی پلنگڑی سے نیچے فرش پر اُتر آیا۔ پھر اِدھر اُدھر پڑی چیزوں میں کچھ دیر اس کی توجہ اٹک گئی۔

. . . " اور ان کے بعد خاص طور سے جناب حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، جناب حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اور جناب حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ اور جناب حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ اور جناب حضرت فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کو اس کلامِ پاک کو ثواب پہنچا، اسی طرح یا پاک پروردگار! اپنے سچے نبی جناب حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ’روزِ ازل سے آج تک جتنی نیک خواتین گزری ہیں ان سب کو بھی اس کلام پاک کا ثواب پہنچا — خصوصاً اماں حوا اور حضرت موسیٰؑ کی ماں یوکبد اور فرعون موسیٰؑ کی بیوی آسیہ اور حضرت عیسیٰؑ کی والدہ حضرت مریم اور جناب رسولِ عربی کی والدہ حضرت آمنہ اور اُن کی ازواجِ مطہرات خصوصاً حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور ان کی صاحبزادی جناب بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اس کلامِ پاک کا ثواب پہنچا اور اپنے ان برگزیدہ بندوں کے طفیل . . . "

اِدھر اُدھر پڑی چیزیں آخر کتنی دیر بچے کو بہلاتیں۔ شاید اسے پیاس

تھی یا بھوک لگ رہی تھی۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر حلق پھاڑ کر رونا شروع کر دیا۔
پھر جیسے ایک دم اُس کے اندر کوئی خیال سا جاگا۔ وہ چُپ ہو گیا اور ننھے ننھے
قدموں سے ادھر اُدھر چلنے پھرنے لگا۔

. . . " اور اپنے ان برگزیدہ بندوں کی طفیل یا اللہ پاک! تو میرے دادا دادی، نانا نانی، پھوپھا پھوپھی، ماموں ممانی اور میرے مرحوم ماں باپ کے گناہوں کو بخش دے اور انھیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے۔ اسی طرح میرے خاوند کے دادا دادی، نانا نانی، اور دوسرے مرحوم عزیزوں کو بھی بخش دے اور انھیں جنت میں جگہ دے — اور اے اللہ پاک! اپنے ان برگزیدہ بندوں کے طفیل اور اُس کلام پاک کی برکت سے جو مجھ گنہگار نے پڑھا ہے مجھے اور میرے خاوند کو ہمیشہ نیکی کی ہدایت دے اور ہماری اولاد . . . ."

ننھے نے کمرے میں کسی کو اپنے لائق اور اپنے آپ کو کسی کے لائق
نہ پاکر کمرہ ہی بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے پیچھے سے ایک دروازے
کا پردہ ہٹایا اور اندر غسل خانے میں داخل ہو گیا۔

. . . " اور ہماری اولاد کو نیک اور صالح بنا اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اُن کے حقوق پُورے کر سکیں، اُن کی مناسب دیکھ بھال کر سکیں، اُن کی صحیح تربیت کر سکیں۔ یا اللہ کسی کا محتاج نہ کرنا، اپنی ہی جناب سے سب کو دینا (آنسو بہنے لگتے ہیں) دو لڑکیاں جوان ہو گئی ہیں، کسی نیک کا مُنہ دکھانا . . . "

دُعا نہ جانے کب ختم ہوئی۔ شاید جلد ہی ختم ہو گئی ہو کیونکہ آنسوؤں کی

وجہ سے ناک صاف کرنے کی حاجت محسُوس ہونے لگی تھی۔ بہرحال جب ماں نے غسل خانے کا دروازہ کھولا تو پانی کے خاصے بڑے سے بھیفوی ٹب میں ایک ننھی سی لاش پھول کی طرح تیر رہی تھی۔

بنیان اور اوورکوٹ

سال میں کچھ دن ایسے بھی آتے ہیں کہ ہموار میدانوں میں اُونچے پہاڑ دن جیسی سردی ڈیرے ڈال دیتی ہے۔ پھر ایسے میں اگر بارشیں بھی شروع ہو جائیں اور ایک آدھ لمبی سی جھڑی لگ جائے تو، موئے پر سو دُرے، کانپتے ٹھٹھرتے ہوئے لوگوں کے ہاتھ پاؤں سُن ہونے اور دانت بجانے لگتے ہیں۔ بارشوں کے علاوہ وہ دن بھی بلا کے ہوتے ہیں جب دن بھر تو بادل چھائے رہتے ہیں اور رات کو یہ بادل نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی راتوں میں جوہڑوں، تالابوں اور کھیتوں میں کھڑا پانی جمتا ہے اور آدمی ہر جیلے بہانے رضائیوں، کمبلوں، نمدوں، اوورکوٹوں کوٹوں، سویٹروں، جرابوں کے ساتھ ساتھ کونوں اور انسانی جسموں کی حرارت سے چپنے اور تکنے والے کمروں سے چمٹا رہنا چاہتا ہے۔

ایسی ہی ایک شام کا ذکر ہے۔ بلکہ شام کیا، اچھی خاصی رات ہو چلی تھی۔ وہ کھانا کھا کر چہل قدمی کے لیے باہر لان میں نکل آیا تھا۔ پاؤں نئی گرم جرابوں کی تازگی محسوس کر رہے تھے اور خواہ مخواہ ٹہلنے پر مجبور کر رہے تھے۔ سر پہ سفید اُونی ٹوپی دُور سے یوں معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی بڑا سا گل داؤدی کھلا ہو یا برف پڑ رہی ہو اور سر پر چھوٹے سے ڈھیر کی صورت میں جمع ہو گئی ہو۔ دونوں ہاتھ بڑے

کوٹ کی جیبوں میں ٹھنسے تھے اور بڑی میٹھی طرح سے گرم ہو رہے تھے لیکن جسم میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد سردی سے ایک کپکپی سی لہرا جاتی تھی اور وہ مزے میں اکڑ سی سی کرنے لگتا تھا۔ اتنے میں اندر سے اس کی بیگم صاحبہ نے نعرہ لگایا کہ ذرا ملازم سے پان لانے کے لیے کہہ دیجئے۔ ملازم سے کہنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اُسے معمول کا یہ کام اچھی طرح یاد تھا؛ اشارہ پاتے ہی پان لینے چل دیا۔ اب اُس نے غور سے جو دیکھا تو ایک اکیلی قمیص میں وہ اس موسم میں دندناتا جا رہا تھا۔ اُس نے اُسے پکارا۔ "ارے میاں، کچھ خدا کا خوف کرو، فرلانگ بھر کا فاصلہ ہے، کوٹ پہن کر جاؤ۔" لیکن اُس اللہ کے بندے نے وہیں سے ہانک لگائی: "صاحب جی! میں نے قمیص کے نیچے سے بنیان پہن رکھی ہے"— اتنا کہا اور دروازہ پار۔

ایک دم سے اُس کے جیبوں میں ٹھنسے ہوئے ہاتھ ٹھنڈی ہوا سے ہاتھ ملانے باہر نکل آئے اور اُس کی کھانسی کے خمار سے بوجھل آنکھیں کھُل سی گئیں۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کے جسم سے تمام اُونی کپڑے جھٹک دیے ہیں اور اب وہ سردی ہی کی آغوش میں دبکا ہوا ہے۔

اُسے یاد آیا کہ چودہ پندرہ سال پہلے وہ بھی کڑکڑاتی سردیوں میں ایک قمیص اور ایک برسوں پُرانے سویٹر میں سکول جایا کرتا تھا۔ سکول میں اکثر اُستاد اُس کے چچا کے واقف کار تھے جسے اللہ نے ڈھیروں دولت دے رکھی تھی۔ دو ایک اُستادوں کو تو یہ بھی غلط فہمی تھی کہ شاید وہ اسی چچا کا صاحب زادہ ہے۔ کلاس میں بیشتر لڑکوں کے درمیان جو مفلروں، کوٹوں اور گرم جرابوں میں دھنسے ہوتے

وہ کچھ زیادہ ہی الگ نظر آتا تھا۔ اکثر اُسے ڈانٹ پڑتی کہ کوٹ کیوں نہیں پہن کر آتے، اتنی سردی ہے، کہیں نمونیا وغیرہ ہوگیا تو۔ لیکن وہ ہمیشہ تنک کر جواب دیا کرتا کہ جناب مجھے سردی ہی نہیں لگتی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ تب واقعی اُسے سردی نہ لگتی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ اگر سردی لگی تو بڑھا غریب باپ کوٹ کہاں سے لاکر دے گا۔

وہ پندرہ سال پہلے کی کلاس ہی میں بیٹھا تھا کہ اس کے پاس سے کوٹھی کے نوکر پیشہ کی ایک چھ سات سال کی بچی ناچتی ودڑتی گزری — دو قدم چھوٹے پھر ایک قدم لمبا اور ایک ذرا سا وقفہ۔ اتنے میں جمعدارنی کی چھوٹی لڑکی نے بھی دروازے سے کلکاری ماری اور پھر دونوں بچیوں نے جیسے دل کی مراد پالی ہو، لگیں ہنسنے اور ایک دوسری کو چھیڑنے ستانے۔ اُس نے دیکھا، دونوں نے صرف ایک ایک چھٹی قمیض پہن رکھی تھی اور دونوں کی ٹانگیں، سر اور بیران ٹھٹھے تھے اور اُدھر اُس کی بیگم صاحبہ اندر کمرے میں پچھلے بیس منٹ سے بچے کو سوئیٹر پر سوئیٹر پہنا رہی ہیں تاکہ اسے تھوڑی دیر باہر لے آئیں۔ ابھی وہ آئیں گی تو ملائم کمبلوں میں لپٹے ہوئے بچے کو اُس کی گود میں دے دیں گی۔ لیکن وہ کب آئیں گی؟ آہی نہیں چکتیں۔ شاید اب اپنی شال ڈھونڈ رہی ہوں۔ وہ تو غسل خانے میں اٹک رہی ہے۔ شاید اُنھیں یاد نہ آ رہا ہو۔ چلو میں ہی بتا آؤں۔

وہ اندر کی طرف مڑنے ہی والا تھا کہ باہر کھلے میں کھیلتی ہوئی دونوں بچیوں کے ایک زوردار بےخطر اور بلاجھجک قہقہے نے اس کے پاؤں سے جکڑ لیے۔ اُس نے دوبارہ ان کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا: یہ ہر مہینے بچاس ساٹھ روپے جو ہم داؤں

اور ٹونکوں پر خرچ کرتے ہیں اس کے باوجود کسی دن نزلہ زکام کھانسی دم نہیں لیتے۔ پھر اسے یاد آیا کہ جب اُس کے پاس کوٹ نہیں ہوا کرتا تھا تو اُسے بہاں سردی نہیں لگا کرتی تھی وہاں وہ یہ بھی تو سوچا کرتا تھا کہ سردر کیا ہوتا ہے کیسے ہو جاتا ہے یہ۔ اور اب وہ ہے کہ اسپرین جیب میں ڈالے پھرتا ہے۔ یہ قصہ کیا ہے؟

ملازم پان لے کر آ گیا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ بغلوں میں دے رکھے تھے لیکن سینہ تنا ہُوا تھا۔ نیچے بنیان جو پہن رکھی تھی اُس نے۔

اتنے میں بیگم اندر سے آ گئیں۔ اُنھوں نے زم زم سی ایک گھُرکی اسے تھما دی اور ملازم کے ہاتھ سے پان لے کر ایک اپنے اور ایک میاں کے مُنہ میں ڈال دیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولیں: "ہائے باہر کتنی سردی ہے، چلو اندر ہی چلتے ہیں۔"

لینے والا ہاتھ

دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے برتر ہے یا یُوں کہہ لیجئے کہ انسان لینے کے لیے نہیں دینے کے لیے پیدا ہُوا ہے۔ بہرحال بات ایک ہی رہتی ہے کہ احسان کرنے میں تو خُوبی ہے لیکن احسان لینے میں گھٹیا پن ہے۔ یہ تصوّر خاصا عام ہے اور کیا نوجوان، کیا پختہ سال سب اس کے بارے میں خُوب پُرجوش نظر آتے ہیں۔

یہ تو اندازہ نہیں کہ اس تصوّر نے کتنے دریا دل فیاض پیدا کئے ہوں گے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس نے انسانی شخصیت کی تعمیر میں اکثر روڑے اٹکائے اور اس طرح بے شمار انسانوں پر مسرت کے دروازے بند کیے ہیں بلکہ یہ کہنا بھی کچھ ایسا غلط نہ ہوگا کہ اگر اس تصوّر کو پُورا انسانی معاشرہ قبول کرلے تو ایک ہی دن میں انسانی ریل گاڑی پٹڑی سے اُتر جائے، سارا نظام درہم برہم ہوجائے۔

یہ بجا ہے کہ اس وقت کیا ہمارے یہاں، کیا کہیں اور، ہر جگہ خود غرضیوں کی بہتات ہے۔ لیکن احسان لینے کے بجائے احسان کرنے کا جو اتنا پرچار کیا جاتا ہے اس سے انسانی ذہن میں اکثر ایک ایسا غلط عقیدہ جم کر رہ جاتا ہے جس کے باعث انسانی تعلقات میں خوشگواری اور ہمواری کے بجائے سنگین فاصلے قائم

ہو جاتے ہیں اور شخصیت میں بُلندی اور وسعت کے بجائے ایک بے موج سکون پیدا ہو جاتا ہے۔

آپ ایسے بہت سے خاوندوں سے واقف ہوں گے جو اپنی بیویوں کے رُپے کو اپنے لیے حرام سمجھتے ہیں اور مُشکل وقت میں بھی اُن سے امداد لینے کسی صورت تیار نہیں ہوتے۔ خیر یہ تو مردوں اور عورتوں کا مسئلہ ہے اور مردوں کو پچھلے ہزار ہا سال کی یہی تربیت ہے کہ کمانا انھی کا فرض ہے لیکن آپ کو یہ تجربہ بھی تو اکثر ہُوا ہو گا کہ آپ نے کسی دوست یا واقف کار کے لیے بس یا تانگے کا کرایہ ادا کرنا چاہا تو اس نے انتہائی ڈھٹائی سے مسلسل انکار ہی کرتے چلے جانا ضروری سمجھا۔ یُوں یہ لینے اور دینے کا مسئلہ روپے پیسے ہی تک بھی محدود نہیں۔ ایسے لوگ بھی عام ہیں جو محبّت اور اخلاص قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

عجیب بات دیکھیے کہ انسان پیدا ہوتا ہے تو اُسے سب سے پہلے لینا ہی سکھایا جاتا ہے۔ بچے کی حیثیت میں انسان اپنے ماں باپ خصُوصاً ماں سے کیا کچھ نہیں لیتا۔ پھر طالب علم کی حیثیت میں وہ اپنے استادوں سے کیا کچھ نہیں لیتا لیکن جُوں جوں وہ بڑا ہوتا جاتا ہے اس کے کانوں میں یہ آواز پڑتی رہتی ہے کہ لینے کے بجائے دینا اچھا ہوتا ہے۔ یہاں اس بات سے بحث نہیں ہے کہ انسان کو احسان کرنے کے بجائے احسان لینا چاہیے مقصود اتنا ہے کہ انسانی شخصیت اور مسرت کے لیے احسان لینا بھی ضروری ہے۔ بہت سے دُوسرے مسائل کی طرح اس مسئلے کا حل بھی یہی ہے کہ لینے اور دینے کو باہم متضاد نہ سمجھا جائے بلکہ ان میں ایک ایسا تعلق جاری کیا جائے جس کی بدولت یہ دونوں ہم آہنگ ہو کر شخصیت

کی تعمیر اور مسرت کی آبیاری کریں۔

اگر دینے والے ماں باپ موجود ہوں اور لینے والے بچے غائب ہوں، تو دینے والوں کی شخصیت میں خاک پھیلاؤ آئے گا اور وہ زندگی سے خاک لطف اُٹھائیں گے۔ یہی کیفیت اُس وقت ہو گی کہ دینے والے اہلِ علم تو موجود ہوں لیکن لینے والے طالبانِ علم غائب ہوں ـــ استاد اُسی صورت میں سکھا سکتا ہے جب کوئی سیکھنے والا بھی ہو۔ اسی طرح ماؤں کی تکمیل بھی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب لینے والے بچے بھی موجود ہوں۔

کسی کا احسان لینا، ضرورت کے وقت کسی سے روپے پیسے کی امداد لینا، کسی کی محبت اور اخلاص کو قبول کر لینا، یہ سب کچھ شخصی اور معاشرتی صحت مندی کے لیے اتنا ہی لازم ہے جتنا کسی پر احسان کرنا، ضرورت کے وقت کسی کی امداد کر دینا یا کسی کے ساتھ محبت اور اخلاص سے پیش آنا۔

فرض کیجیے کہ آپ کو ایک چیز کی واقعی ضرورت ہے اور وہ کسی دوسرے شخص کے پاس افراط سے موجود ہے اور وہ خوشی سے آپ کی ضرورت پوری کرنے پر تیار ہے لیکن آپ اس وجہ سے اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں کہ اس شخص کا احسان کیوں اٹھائیں۔ لیکن کیا آپ نے یہ سوچا کہ اس انکار کا کیا نتیجہ ہوا ؟ سب سے پہلے تو آپ کی ایک ضرورت پوری نہ ہوئی اور آپ کی بہبود میں کمی آئی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ ایک شخص آپ کے ساتھ مہربانی کرنے سے محروم رہ گیا اور یوں اس کی شخصیت میں جو پھیلاؤ ممکن تھا وہ ناممکن ہو گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس دُنیا میں ایک نیکی کا اضافہ

ہوتے ہوتے رہ گیا۔ یہی معاملہ اُس وقت پیش آتا ہے جب آپ پیدل چل رہے ہوں اور کوئی سواری والا آپ کو آپ کی منزل تک پہنچانے کی پیش کش کرتا ہے اور آپ اُس کا یہ احسان اُٹھانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اور یہی معاملہ اس وقت پیش آتا ہے جب آپ یہ جانتے ہوں کہ ایک شخص آپ کو کچھ سکھا سکتا ہے لیکن آپ اس کا احسان نہ اُٹھانے کی خاطر اپنے آپ کو علم کے اُس میدان سے کورا رہنے دیتے ہیں۔

شاید آپ یہ سوچتے ہوں کہ آخر آپ اس احسان کا بدلہ کیونکر اتاریں گے لیکن احسان کا بدلہ اتارنے کی کیا یہی ایک صورت ہے کہ جواباً اس شخص پر کوئی احسان کیا جائے جس نے ہم پر احسان کیا ہے؟ آپ کبھی کسی دوسرے شخص کی ضرورت پوری کر دیں گے تو گیا حساب برابر نہ ہو جائے گا۔ اگر احسان کا بدلہ ہمیشہ احسان کرنے والے ہی کے ساتھ احسان کر کے چکایا جا سکتا ہو تو اس صاحبِ قلم یا صاحبِ دماغ کے احسان کا ہم کیا بدلہ دیتے ہیں جس کے خیالات بعض اوقات ہماری زندگی ہی بدل کر رکھ دیتے ہیں ـــــ اور اللہ جو سب نعمتوں کا خالق ہے اس کی نعمتوں کا ہم اُسے کیا بدلہ دیتے ہیں؟

تنہائی کا درد

صبح کو شام اور شام کو صبح کرتے کرتے تین دن ہو گئے تھے۔ درد وں نے ہونے والی ماں کو نڈھال کر دیا تھا۔ پہلا پہلا بچہ تھا۔ اُس نے گھر میں بچے پیدا ہوتے دیکھے سُنے تو تھے، پھر پچھلے تو مہینے میں سیکڑوں مرتبہ اِس تکلیف کی نوعیت اور شدّت کا ذکر ہُوا ہو گا لیکن اب یہ گھڑی سر پر کھڑی تھی تو یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بالکل ہی انوکھی سی بات ہے جو دیکھی نہ سُنی تھی۔

گزشتہ دو سال میں اُس کے دل و دماغ کئی موڑ مڑ چکے تھے۔ اُس کی جذباتی زندگی میں کئی تلاطم بپا ہو چکے تھے، شادی کے بعد ماں باپ اور میاں کی محبت کے درمیان کئی معرکے ہو چکے تھے۔ پھر وہ اُمید سے ہوئی تو ان معرکوں کی جولانی میں گرمی آ گئی۔ ماں باپ کہتے: بھئی! اب تو تمھیں ہمارے یہاں آ جانا چاہیے وہاں کون دیکھ بھال کرے گا تمھاری، میاں تمھارا صبح کا گیا رات کو آتا ہے اپنے کام سے، پھر ماں باپ کو یا بھائی بہنوں کو جو درد ہوتا ہے وہ ساس سُسر یا دیور نندوں کو بھلا کہاں، یُوں بھی پہلے بچے کے موقع پر تو ماں باپ ہی کے یہاں دن پورے کرنے چاہئیں، سو اُونچ نیچ ہو جاتی ہے، طبیعت خراب ہو رہی ہے، اوٹ پٹانگ چیزوں کو جی چاہ رہا ہے اور سُسرال میں ظاہر ہے آدمی کو تکلف کے مارے چُپکا ہو رہنا پڑتا ہے۔

ادھر میاں نے جب سے یہ بات سُنی تھی اُس کے کام کا دفتر بھی نسبتاً جلدی سمٹنے لگا تھا، آئے دن ڈاکٹر کے چکر ہونے لگے تھے شام کو آتا تو ہاتھوں میں دو چار دواؤں کیساتھ چار پانچ کھانے پینے کی چیزیں بھی ہوتیں، کھانا کھاتے کھاتے اُس کی طبیعت متلاتی تو میاں کا ہاتھ بھی وہیں کا وہیں رُک جاتا، وہ تو اسے دبا بھی دیا کرتا تھا اُس نے ماں باپ کی خواہش کا ذکر کیا تو وہ چپ سا ہو گیا، پھر کہنے لگا جیسے تم مناسب سمجھو۔ لیکن وہ سمجھ گئی کہ مناسب کیا ہے اور اُس نے ماں باپ سے کہہ دیا کہ وہ میاں ہی کے پاس رہے گی، البتہ پُورے دن ہونے کو ہوں گے تو ان کے یہاں چلی آئے گی۔ اب ماں باپ، بہن بھائیوں نے کوڑی پھیرا شروع کر دیا تینوں سے ہفتوں پر اور ہفتوں سے دنوں پر بات آ گئی اور اب خاصے دنوں سے وہ ماں باپ ہی کے یہاں تھی۔ میاں بھی اکثر پوچھنے آتا تھا اور اب تو وہ بھی یہیں اُٹھا آیا تھا بلکہ جہاں اُس کی آنکھوں کو تین دن سے نیند نصیب نہ ہوئی تھی میاں نے بھی آنکھ نہ جھپکی تھی۔ ماں باپ، بہن بھائی سب دوڑ دھوپ میں لگے تھے لیکن ڈاکٹر کی کوشش کو ابھی اللہ کی تائید حاصل ہی نہ ہو رہی تھی۔ بہر حال اب تو کچھ ہی گھنٹوں کی بات تھی۔

لیکن جُوں جُوں دردوں کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا اُس کی نظروں سے اپنے ارد گرد بیٹھے اور پھیلیے ہوئے سب عزیز غائب ہونے لگے۔ ساس سسر، دیور نندیں بھائی بہن سب غائب ہو گئے، پھر ماں باپ بھی غائب ہو گئے۔ اور تو اور جب اُس کا وجود اُس کے قابو میں نہ رہا اور تکلیف سے ناتواں جان کی کشتی ڈولنے سی لگی تو اُسے اچانک محسوس ہوا کہ اس وقت تو اس کا میاں بھی اس کے پاس نہیں

تھا۔ وہ بالکل تنہا تھی۔ اپنی تکلیف کے کالے اتھاہ سمندر میں بالکل اکیلی رہ گئی تھی۔ سب غمگساریاں اور دُعائیں ساحل ہی پر رہ گئی تھیں اور اُس کی کشتی ساحل سے دُور، ساحل والوں سے دُور سمندر کی بے پایاں وسعتوں پر، آسمان کی بے پایاں وسعتوں کے نیچے بے منزل کھڑی ڈول رہی تھی۔ اُسے یوں محسوس ہُوا کہ اس کی تنہائی ازلی ہے۔ وہ ہمیشہ سے تنہا تھی۔ انجمن کی رونق ہوتے ہوئے بھی وہ ہمیشہ تنہا تھی۔ اُس نے سوچا کہ یہ تنہائی کتنی اصلی اور حقیقی ہے حالانکہ وہ اُس سے آج تک روشناس نہ تھی اگرچہ کبھی کبھار اُس نے اسے محسوس ضرور کیا تھا۔ آج اُس نے اپنی اس پُرانی رفیقہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا، اب وہ اسے بھُول نہ پائے گی۔

اچانک اُسے خیال آیا کہ کیا تنہائی بھی زندگی کا ایک بُنیادی اُصول نہیں۔ وہ پیدا ہوئی تھی تو تنہا، مرے گی تو تنہا — باپ کا گھر چھوڑ کر دُلھا کے گھر گئی تھی تو تنہا، اُس نے زندگی میں جب کوئی اہم فیصلہ کیا تو تنہا۔ پھر تنہائی سے کیوں ڈرا جائے۔ تنہائی تو قیمتی چیز ہے، اس کی تو حفاظت ہونی چاہیے۔ اس کا تو اہتمام ہونا چاہیے۔ اگر زندگی میں انسان نے انسان کی حیثیت سے جینا ہے تو اس کے لیے آزادی لازم ہے۔ آزادی کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کا اختیار رکھتا ہو۔ آزادانہ فیصلہ کرتے ہوئے ہم لوگوں سے، عزیزوں سے، احباب سے کٹ کر ساحل سے اپنی کشتی کھول کر تنہائی کے سمندر میں ڈال دیتے ہیں۔ تنہائی کے سمندر میں — ہمارے تجربے، ہمارے علم اور ہمارے عرفان کی حدود میں ہماری ذات چکر کاٹتی ہے، خوطہ زن ہوتی ہے اور کسی فیصلے پر پہنچتی ہے۔ اگر ہم اس سمندر میں کُودنے سے ہچکچائیں تو ہماری

آزادی چھن جاتی ہے۔ ہمیں لوگوں کے کئے ہوئے فیصلوں پر تکیہ کرنا پڑتا ہے اور یُوں ہماری ذات اپنا جوہر کھو بیٹھتی ہے، اپنی آب کھو بیٹھتی ہے۔

اُس نے سوچا تنہائی سے وہی لوگ گھبراتے ہیں جو آزادی کی ذمّہ داری قبول نہیں کرنا چاہتے۔ وہ انجمن میں گھرے رہتے ہیں اور اپنے شب و روز کو شور اور ہنگامے سے پُر رکھنے کی کوشش میں جُتے رہتے ہیں تاکہ وہ تنہا نہ رہ جائیں اور انھیں فیصلہ کرنے کا درد نہ سہنا پڑے ـــــ فیصلہ کرنا واقعی ایک درد ہی تو ہے، دردِ زہ جیسا درد۔ لیکن اگر آدمی فیصلے کا درد سہنے سے نہ گھبرائے تو پھر جیسے دردِ زہ سہنے والی ماں کی گود ہنستے کھیلتے بچّے سے بھر جاتی ہے، اُسی طرح فیصلہ کرنے والا دل بھی آزادی کی انوکھی خوشی سے معمور ہو جاتا ہے۔

یُونہی سوچتے سوچتے اُسے اپنی تنہائی اچھی لگنے لگی اور وہ خوش ہو گئی۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں بچّے کے رونے کی آواز آ گئی اور اس کے ساتھ ساتھ اور بہت سے لوگ بھی خوش ہو گئے۔

نیا پُرانا سال

جُوں جُوں سال کا آخر قریب آتا جا رہا تھا اُس کا دل ایک نامعلوم سے خوف سے ڈوبنے کی سی کیفیت سے دوچار رہنے لگا تھا۔ اُس نے کئی مرتبہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر یہ خواہ مخواہ کی اُداسی کیوں دل میں گھر کیے بیٹھی ہے لیکن جس طرح چمکیلے، بھرے بھرے، مکمل دنوں کی شامیں بھی ڈوبتے سُورج کے ساتھ ساتھ دل میں ایک اَن جانا، اَن بُوجھا سا خوف اور اس کے ساتھ ایک غمناکی سی پیدا کر دیتی ہیں اسی طرح یہ چند دن شاید پورے سال کی شام تھے اور ان چند دنوں میں گویا پورے ایک سال کی یادیں زندہ ہو گئی تھیں جن میں کامیابیوں، کامرانیوں، خوشیوں اور لذتوں کے ساتھ ساتھ کتنی ہی ناکامیوں، نامرادیوں، ناشادیوں اور اکتاہٹوں کے سایے موجزن تھے یہی سائے ہی تو اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے لیکن اس کا تو اِن سایوں کے بجائے نئے سال کی روشنیوں، امیدوں، پروگراموں اور کوششوں میں دھیان تھا۔ یہ سال تو اب پُرانا ہو گیا تھا۔ اب تو نئے سال کی آمد آمد تھی اور پرانے بیتے ہوئے وقت کی راگنی دُکھ سے بھری تھی، اسے چھیڑنے سے حاصل۔

واقعی، اس کی بات ٹھیک ہی تو تھی۔ جو بیت گئی سو بیت گئی۔ بہتر یہی ہے کہ آدمی مستقبل پہ نظر رکھے اور پھر خوشی کے موقعے کون سے روز روز آتے

ہیں — سال بعد — پورے ایک سال بعد (بارہ مہینے، باون ہفتے تین سو پینسٹھ دن، بہت بے شمار گھنٹوں کے بعد) تو نیا سال آتا ہے۔ اتارو یہ اپنا اُداسی کا جامہ — آئے بڑے محتسب، بڑھاپا آئے گا تو بہت موقعے ملیں گے ماضی کا حساب کتاب کرنے کے — بیٹھے سوچتے رہا کرنا کہ کیا کرنا چاہیے تھا اور کیا نہ کر سکے اور کیا نہیں کرنا تھا جو مسلسل کرتے رہے۔

شام ہوئے وہ گھر کو پلٹا۔ گھر کی عجب مصیبت تھی۔ شہر سے پُورے چھ میل دُور، آنا جانا باقاعدہ ایک مرحلہ ہوتا تھا لیکن آج تو اس کا دل ایک نئے عزم سے معمور تھا۔ طبیعت کی طرح سائیکل بھی آج کچھ زیادہ رواں تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں نیم مدہوش چلا جا رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے آتی ہُوئی ایک بڑی ہی تیز رفتار کار کے مسلسل ہارن نے اُسے گڑبڑا کر رکھ دیا۔ کار تو زنّاٹے سے نکل گئی لیکن خالی سڑک پر آوازوں کا ایک جلوس چھوڑ گئی — بہتی ہُوئی، کچھ کہتی ہوئی آوازیں سائیکل کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں، اس کے گرد ایک حلقہ سا ڈالے، اُسے اپنے دامن میں سمیٹنے لگیں۔ کچھ دیر تو وہ مبہوت رہا، پھر جو اُس نے آنکھیں اٹھا کر سامنے اور پھر دائیں ہاتھ کھیتوں کی جانب نگاہ کی تو دُور بھورے پیلے درختوں اور لال سنہرے بادلوں میں سُورج کو دن کی آخری منزل پر ایک بڑے سے لال لال آنسو کی طرح لرزتا پایا۔ اب اُس کی آنکھیں تو ڈبڈباتے ہوئے سُورج میں گڑی تھیں اور کان زمین کی فضاؤں میں تیرتی ہُوئی آوازوں میں گم تھے۔ اُس کی سائیکل کی روانی نہ جانے کب ختم ہو گئی، اُس کی طبیعت کی روانی بھی نہ جانے کب ختم ہو گئی۔ وہ خاصی دیر سے سائیکل سے اُتر کر پاس کے ایک کھیت کی منڈیر پر

بیٹھا تھا۔ سورج ڈوب چکا تھا، آوازیں تھم چکی تھیں لیکن اس کے دل و دماغ کے آفاق پر ایک نیا تازہ سورج طلوع ہو چکا تھا اور نئی تازہ آوازوں نے بازار گرم کر رکھا تھا ــــــ بیتے ہوئے سال کے بیت جانے، ایسے ہی چپ چاپ بیت جانے کے غم کا بازار گرم تھا۔ نہ جانے وہ کب سے بیٹھا تھا اور کب تک بیٹھے کا ارادہ تھا۔ اتنے میں اُس کے بالوں اور کان کے درمیان ایک تیز سی کٹیلی دھار سرسرائی اور اُس کے ہاتھ میں مانجھے کی ڈور آگئی۔ دوسرے ہی لمحے ڈور تن گئی اور اُس نے محسوس کیا کہ ڈور کے دوسرے سرے پر پتنگ کوئی ایسی ویسی نہیں کہ وہ بیٹھا پیچیاں بیتا رہے۔ اُس کا وجود جو چند لمحے پہلے سال کی ایک آخری شام کے جادو سے گیلی مٹی کی طرح سویا سویا تھا اچانک کھنکھنا اُٹھا اور اسی لمحے اس پر یہ حقیقت کھلی کہ یہ پتنگ اس بیتتے ہوئے سال کا نشان ہے۔

اب وہ پوری طرح جاگ اُٹھا تھا اور جانتا تھا کہ اُسے پتنگ کو کامیابی سے اپنے پاس اُتارنا ہی ہوگا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ اُسے ٹھیک سے یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ پتنگ کا رخ کیا ہے۔ کہاں سے کٹ کر یہ کدھر کو جا رہی ہے۔ آسمان پر اس کی اونچائی کس قدر ہے۔ پتنگ اور اس کے درمیان کیسے کیسے اونچے نیچے مکان اور درخت حائل ہیں جیسے کسی حریف نے للکارا ہو وہ تو مبارزت کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ ایک ہاتھ سے اُس نے پتنگ کو سنبھالا اور دوسرے سے ڈور کا اندازہ کیا کہ کچھ ہاتھ ڈھیل دی جا سکتی ہے یا نہیں تھوڑی سی گنجائش تھی، جب ڈور ختم ہو گئی تو اُس نے مُنہ زور پتنگ کے ساتھ ساتھ چلنا

شروع کر دیا۔ کوئی ایک فرلانگ جا کر پتنگ کا تناؤ اس قابل ہوا کہ وہ ٹھہر سکے اب وہ آہستہ آہستہ پتنگ کو اتارنے لگا۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ پتنگ اتنی بڑی ہو گی۔ کوئی دو اڑھائی گھنٹے تک وہ آہستہ آہستہ پوری احتیاط سے ڈور کھینچتا رہا۔ اُس کے بازو تھک گئے، دسمبر کی آخری راتوں کی سردی سے اُس کی ٹانگیں اکڑ اکڑ گئیں لیکن اُس نے ہمّت نہ ہاری۔

جب پتنگ اُتر کر اُس کے ہاتھوں میں آ گئی تو اُسے احساس ہُوا کہ یہ اُس کی زندگی کا ایک سال تھا جو پچھلے کئی سالوں کی طرح اُس کی زندگی سے کٹ کر وقت کی بیکراں وسعتوں میں گم ہونے کو تھا لیکن جسے آج اچانک اُس کے خالی ہاتھوں میں دے دیا گیا تھا کہ وہ چاہے تو اسے اپنی زندگی کی ایک کڑی بنالے؛ اسے واپس اپنی زندگی میں کھینچ لے۔ اُس کا دل ایک عجیب طرح کی طمانیت سے بھر سا گیا۔ آج پہلی مرتبہ اسے محسوس ہُوا تھا کہ صرف وہی سال گزرتا ہے جسے ہم گزر جانے دیں، جسے ہم اپنے اندر نہ اتاریں، جسے ہم سمجھنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ وقت بھی پکڑا جا سکتا ہے اور ہمارے ساتھ ساتھ رہ سکتا ہے۔

بہرا، گونگا، اندھا

ریل گاڑی رات کے تہ دار اندھیرے کا سینہ چیرتی، دھرتی کے جان دار اُدھ بچے سینے پر پھسلتی چلی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وقت بھی دل و دماغ کو بہت پاس سے چھوتا ہوا کسی دُور کی منزل کو اُڑا لیے جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ وقت کا دھارا ریل گاڑی کے بدن کے رُوپ میں اُسے اپنے دامن میں سموئے، ماضی سے اُس کا دامن چھڑا کر مستقبل کی اَن دیکھی وادیوں سے اس کا دامن باندھنے کے لیے اسے آگے ہی آگے لیے چلا جا رہا تھا۔

جُوں جُوں ماضی سے ــــ اپنے عزیزوں، اپنے گھر اور اپنے شہر سے اُس کا فاصلہ بڑھ رہا تھا تُوں تُوں اس کے دل میں ان کے لیے تڑپ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا ماضی ایک وسیع و عمیق منظر کی صورت میں اس کے سامنے بچھ گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس منظر میں صُورتیں، شکلیں، رقبے، رنگ، لکیریں اور ان کے باہمی رشتے اُبھرنے اور واضح ہونے لگے تھے۔ اُس کے ذہن کے گردو موت سے ہمکنار ہونے والے کسی جہاں گرد کی طرح یادوں اور احساسات کے اَن گنت ہالے پھیلنے اور سمٹنے لگے تھے آج سے پہلے وہ اس منظر کی محض ایک تفصیل تھا، اُس کی بے شمار جزئیات کے تانے بانے کے ایک تار سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ بہتے ہوئے دریا کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے ایک تنکے

سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ لیکن آج اس دُوری نے، ریل گاڑی کے اس سفر نے اسے اس منظر سے جُدا کر کے اس منظر کی سیر دکھانے کی سبیل پیدا کر دی تھی اُسے اچانک احساس ہُوا کہ اتنے بڑے شہر میں رہتے ہوئے اُس نے آج سے پہلے اپنے شہر کے حُسن اور کردار کو نہ پہچانا تھا۔ اُس نے اُسے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔
اُس نے محسوس کیا کہ برسوں ایک گھر میں رہتے ہوئے اس نے آج سے پہلے اپنے گھر کے در و دیوار کو کچھ کہتے نہ سُنا تھا۔ اُس نے اسے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ جس طرح وہ اکثر گھر سے نکل کر شہر میں کسی منزل تک پہنچ جاتا اور حیران ہوتا تھا کہ اسے راستہ کٹنے کا احساس ہی نہیں ہُوا کچھ اسی طرح وہ اپنے گھر میں بھی داخل ہوتا تھا۔ جس طرح تانگے کے گھوڑے کو علم ہوتا ہے کہ اس کا آستھان کہاں ہے اُسے بھی گھر کا رستہ یاد ہو گیا تھا۔
ایک لمبا عرصہ تو وہ اس منظر اور اس سے پیدا ہونے والے محسوسات میں گھرا رہا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ماضی سے دُور جا رہا ہے لیکن ماضی جس طرح آج زندہ ہُوا تھا اس طرح تو پہلے بھی زندہ نہ تھا۔ یہ سب اس فاصلے کا کرشمہ تھا جو اُس کے ماضی اور اس میں حائل ہو چکا تھا۔ اس فاصلے نے اُس کے اندر ایک حسرت سی پیدا کر دی تھی کہ وہ کچھ کھو کر، کچھ پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہے۔
اپنے خیالات کے اس موڑ پر اُس کے ذہن میں ایک نیا خیال کوندا اور اس کے وجود میں ایک دریچہ کُھل گیا۔ اُس نے سوچا، کیا میں زندگی کے بارے میں صرف اُسی وقت کچھ جانا کروں گا جب وہ مجھ سے دُور ہٹ جایا کرے گی۔ کیا ہر مرتبہ مجھے اپنے حال کے منظر کو سمجھنے کے لیے اس سے کٹ کر کہیں دُور جانا پڑے گا۔

کیا کسی منظر کی موت ہی اس کی حقیقت کو عیاں کر سکتی ہے۔ کیا مجھے اپنی زندگی کا راستہ مرتے وقت ہی نظر آ سکے گا، جب میں اس راستے کو بدلنے پر قادر ہی نہ ہوں گا ـــــ ایک بھیانک سا اندھیرا اس کے وجود سے لپٹ گیا اور اس کے سارے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی ـــــ نہیں کوئی اور ڈھنگ بھی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔

اُس کا خیال اُسے واپس اُس کے شہر میں لے گیا۔ اُس نے دیکھا کہ لوگ باتیں کر رہے ہیں، لیکن ساتھ ہی اُس نے ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ وہ بہرا ہے اور اُن کی باتیں نہیں سُن رہا۔ اچانک اُسے یاد آیا کہ نہ صرف اُس نے اپنے اردگرد پھیلے ہوئے لوگوں کی باتیں ہی نہیں سُنیں اُس نے ہمیشہ سے انسانوں کو اپنی خوش الحانی سے خوش کرتے ہوئے پرندوں کے چہچے بھی نہیں سُنے، صدیوں سے سُروں اور تالوں کو آہنگ اور توازن بخشنے کی کوشش کرتے چلے آنے والے موسیقاروں کے حاصل کو بھی نہیں سُنا، دُنیا میں حکمت و دانش کا بیج بونے پھرنے والوں کی باتوں پر بھی کبھی کان نہیں دھرا، رات کے سناٹے میں کھیتوں اور مکانوں کے اُوپر سے سرسراتی ہوئی ریل کی سیٹی کی آواز پر بھی دھیان نہیں دیا، جل تھل سمندر پر لہراتی ہوئی جہاز کی کوک کو بھی کانوں میں جا کر جگانے کا موقع نہیں دیا۔

منظر میں کچھ تبدیلی آئی تو اُس نے دیکھا کہ پیارے پیارے لوگ یہاں سے وہاں تک پھیلے ہیں، اس سے کچھ کہہ رہے ہیں، اُسے چھُو رہے ہیں، گرم جوشی سے اُس کے ہاتھ بھینچ رہے ہیں، اُسے سینے سے لگا رہے ہیں۔ یا پھر پاس نہیں آ رہے، کترا کترا کر پاس سے نکلتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ اُن کی طرف ہاتھ پھیلاتا ہے،

دیکھتا ہے، ننگا ہوں میں اپنے دل کی ساری محبت اور اپنے ذہن کی ساری توجّہ سموئے ہوئے ہے لیکن مُنہ سے کچھ بول نہیں پا رہا، وہ گونگا ہے۔ صرف اس وقت ہی کی بات نہیں تھی، اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہمیشہ سے گونگا تھا۔ اُس نے کبھی اپنی قوتِ گویائی کو تپاک کے لیے استعمال نہ کیا تھا، کبھی اپنے نطق کو لوگوں کی قربت کے لیے نہ برتا تھا، اور تو اور اس نے کبھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارتے ہوئے کسی شخص کو اپنی ہمدردانہ باتوں سے روشنی نہ بخشی تھی، کسی نہ جاننے والے کے لیے علم کا دراز نہ کھولا تھا، سُرتال کو گلے کا ہار نہ بنایا تھا، سیٹی تک بجانی نہ سیکھی تھی کہ کسی اور کے کانوں میں رس نہ بھی گھلتا تو کم از کم اپنی تنہائی ہی میں کچھ رنگ بھر جاتا۔

منظر ایک مرتبہ پھر بدلا اور اس مرتبہ وہ اندھا ہو چکا تھا۔ روشنی کے تھرتھراتے ہوئے بدن کو اس کی آنکھیں چھو بھی نہ سکتی تھیں۔ رنگ نہیں تھے۔ من موہنی مُورتیں اور صورتیں نہیں تھیں، سر اٹھاتے ہوئے اور بہتے ہُوئے خطوط نہیں تھے، بچّوں کی ہنسی کھِلی اور عورتوں کی مُسکراہٹ دُور دُور دکھائی نہ دیتی تھی، پیاروں کی آنکھوں میں بھرے ہُوئے پیار کی کچھ خبر نہ تھی ——— دل میں ایک کٹیلی سی سردی اترتی چلی جا رہی تھی۔

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا، مُنہ سے خواہ مخواہ مبہم سی آواز نکالی اور کان پاس کی سیٹ پر بیٹھے ہُوئے مسافر کے خراٹوں پر لگا دیئے۔ وہ بہرا نہ تھا، گونگا نہ تھا، اندھا نہ تھا۔ لیکن آج تک

وہ بصارت کے باوجود اندھا رہا تھا، نطق کے باوجود گونگا رہا تھا، سماعت کے باوجود بہرا رہا تھا۔ اُس نے لالچیوں کی طرح باقی زندگی کے ممکن عرصے کا اندازہ کیا اور حسرت کی کھٹک کے باوجود اس کے دل میں ایک آرزو اُبھری جس نے اسے خوش کر دیا — اب میں سُنوں گا، بولوں گا، دیکھوں گا، پھر زندگی کو مجھ پر وا ہونے میں کوئی باک نہ ہوگا اور ماضی سے میری دوستی ہو جائے گی اور میرا راستہ مجھ پر عیاں ہو جائے گا۔

عِلم کے ٹھکانے

اُوپر، آسمان کی اَن جانی وسعتوں میں، چاند کی ننھی منی کشتی تیر رہی ہے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے، اُجلے اُجلے رنگ کشتی کے گرد حلقہ باندھے چل رہے ہیں۔ رنگوں سے خوشبو پُھوٹ رہی ہے، رنگ رنگ کی خوشبو۔ نیچے، وادی میں، بادلوں نے چھاؤنی چھائی ہے۔ دائیں بائیں اُونچے اُونچے پہاڑ اور اِن پہاڑوں کی فصیلوں میں گھرا بادلوں کا شہر۔ آسمان کے ساتھ ساتھ یہ شہر بھی چاندنی سے جگمگا رہا ہے۔ پہاڑ کے دامن میں آباد چھوٹی چھوٹی بستیوں میں دیے ٹمٹما رہے ہیں ـــ جگمگاتی ہُوئی زمین، جگمگاتا ہُوا آسمان اور زمین، آسمان کے درمیان ٹمٹماتے ہوئے دِیوں کے تارے اور ہر طرف پھیلی ہُوئی خوشبو، رنگ رنگ کی خوشبو۔

چاند آسمان سے دُور ہے۔ ہر طرف سمندر کی آواز ہے یا سمندر ہے۔ سمندر کا پانی دُور سے موجیں مارتا، لہروں میں ٹُوٹتا، ہموار ساحل پر جھاگ سے حاشیہ آرائی کر رہا ہے۔ جھاگ اور پانی کے درمیان گیلے اور چکنے ساحل پر جُگنو سے روشن ہیں ـــ کالی رات میں روشنی کی رمق، سمندر میں بسنے والے جانوروں اور سمندر میں ڈُوبنے والے انسانوں کی ہڈیوں کی فاسفورس جو پانی کے تھپیڑوں سے ریزہ ریزہ ہوگئی تھی، اندھیری رات میں زندگی کا نشان بن گئی

ہے اور ساحل پر جگنوؤں کے دیے جلا رہی ہے، سمندر کی طرف بُلا رہی ہے۔ اچانک اتھاہ، پُرشور پانیوں کی سطح پر سرسراتی ہوئی جہاز کی کوک کانوں میں آتی ہے اور دل اس کوک کے ساتھ سمندر کی ایک ایک موج کے ساتھ ہر سُو روانہ ہو جاتا ہے۔

بارش ابھی ابھی تھمی ہے، آسمان پر بادل آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ سفید اور سرمئی بادلوں میں سے اُجلا اُجلا آسمان جھانک رہا ہے۔ دُھلے دُھلے درخت، ہری ہری گھاس، مکانوں اور سڑکوں سے دُھوپ لپٹ رہی ہے۔ مٹی کی خوشبو میں بسی ہوئی گیلی گیلی ہوا بدن سے آر پار ہو رہی ہے، دُور گھنے گھنیرے جنگل میں شام ہو رہی ہے۔ اُونچے اُونچے تناور درختوں کی چوٹیاں نوعمر دوشیزاؤں کے گالوں کی طرح لال گلال ہیں۔ چھوٹے چھوٹے زیرِ سایہ درختوں پر اس گلال کا عکس ایک اور ہی رنگ پیدا کر رہا ہے۔ ان درختوں کے پتے بھورے بھورے جا کلیٹی سے دکھائی دیتے ہیں جیسے ابھی ابھی انھوں نے آنکھ کھولی ہے۔ ذرا بڑے پرندے درختوں سے اُوپر اُوپر چکر کاٹ رہے ہیں۔ شاید اپنے مسکنوں کا اندازہ کر رہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چڑیاں پتوں کے جھرمٹوں میں پُھدک پُھدک کر گا رہی ہیں۔ ان کا شور پتوں میں سے پھسلتی ہوئی ہوا کے زیر و بم سے ہم آہنگ ہو کر ایک لمبی تان بن کر کانوں میں رس گھول رہا ہے۔ جسم میں نیند سی گھلنے لگی ہے لیکن دل جاگنے لگا ہے۔ دھوپ اُونچی ہوتی ہوتی غائب ہو رہی ہے اور دل دھوپ کے ساتھ ساتھ اُونچا ہوتا ہوتا کہیں دُور بھاگا چلا جا رہا ہے۔ چڑیوں کا شور اور ہوا کا زیر و بم مل جُل کر اُسے اپنی رفتار قائم رکھنے میں مدد دے رہے

ہیں لیکن دل کا ٹھکانا نہ جانے کہاں ہے۔ دل کا ٹھکانا تو کسی دل ہی میں ہو سکتا ہے۔

کسی کی جمیلہ، ایک بھولی تارا، دل کے سارے پٹ کھولے اس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ دن بیتے، ہفتے بیتے، مہینے اور سال بیتے، ایک عمر بیت گئی ہے لیکن وہ آس سے نہیں ڈولی اور اپنے خوابوں اور خیالوں کے مندر میں اُسی کی آرزو کا دیا جلائے مگن بیٹھی ہے ۔۔۔ کسی کی ماں جس نے اپنے آنسوؤں سے اُسے پالا ہے اور اپنی بوڑھی ہڈیوں کو اس کے ذرا ذرا سے آرام کے لیے طرح طرح کی تکلیف دی ہے ۔۔۔ اور کسی کا حبیب، جو اُسے اپنی دعاؤں میں شریک رکھتا ہے، رات کو سوتے سوتے کبھی آنکھ کھل جاتی ہے تو دل جس کی خاطر لرزنے لگتا ہے کہ وہ ٹھیک ہو سہی ۔۔۔ اور کسی کی بیوہ، جو بھری دنیا میں عزیزوں اقارب اور بال بچوں کے ہجوم میں اندر ہی اندر اُن دنوں کی یاد میں محو رہتی ہے، جب اس کی مانگ میں جیتا جیتا سیندور چمکتا تھا اور کلائیوں میں تازہ تازہ چوڑیاں کھنکتی تھیں اور دن کو راتوں کے خواب آتے تھے اور راتیں دنوں کی طرح روشن گزرتی تھیں ۔۔۔ اور کوئی اجنبی مسافر، جو بستی بستی گھومتا پھرتا ہے اور منہ سے کچھ نہیں کہتا لیکن جس کی آنکھوں کی ویرانی میں ایک طویل داستان رقم ہے، جو سب کی خیر مانگتا ہے اور جسے کسی سے بَیر نہیں، جو سب کو اپنا کہتا ہے لیکن جسے کوئی اپنا نہیں کہتا۔

یہ سب کچھ کیا ہے؟

یہ آنکھوں کی سرزمین ہے۔ یہ کانوں کی اقلیم ہے، یہ دل کی مملکت ہے، اس

مملکت کا مسافر ہی اصل عالِم ہے۔ اس اقلیم کی مسافرت جس کے حصّے میں نہیں آئی یا جس نے جان بُوجھ کر اس سرزمین میں قدم نہیں رکھا علم کو اس سے کوئی علاقہ نہیں اور نہ وہ علم کا دوست ہے۔

علم کتابوں میں بند نہیں، علم تو ہر طرف پھیلا ہُوا ہے؛ جو کوئی آنکھوں، کانوں اور دل کا مالک ہے علم کے دروازے اس کے لیے کھُلے ہیں جس کسی نے یہ سمجھا کہ علم صرف مدرسے کی حدود میں محصور ہے وہ اس دہلیز میں کبھی داخل نہ ہو سکے گا۔ اُسے اس چار سُو پھیلی ہُوئی، ہر لحظہ پھیلتی ہُوئی کائنات کے راز سے آگاہی ہوگی نہ خدا ہی ملے گا اور نہ وہ حوصلے سے اس وقت کہ موت اُسے ایک نئی سلطنت کی سیر دکھانے آئے گی یہ کہہ سکے گا، اچھا دوستو، ہم تو چلے، الوداع!ــــ

معصومیّت کا سرمایہ

چھوٹا سا معصوم بچّہ باپ کی انگلی پکڑے گھر سے بازار کو روانہ ہے۔ روز کے پامال رستے پر باپ اُونچی نیچی زمین، دو رویہ درختوں، ان درختوں کے پتّوں سے چھن چھن کر آنے والی دُھوپ اور ان پتوں کی گہری گھنی چھاؤں سے بے خبر اپنی ہی دُھن میں چلا جا رہا ہے لیکن بچّہ جسے گھر میں بھی چین نہیں آتا اور جس کی زبان گھر میں بھی دو گھڑی دانتوں میں نہیں دبتی وہ تو اب اور بھی چوکس اور بیدار ہو چکا ہے اور ہر چیز کی طرف یُوں اشتیاق اور حیرت سے دیکھ رہا ہے جیسے ابھی ابھی اُس کی آنکھیں کھُلی ہیں اور ہر شے پہلی مرتبہ اُس کی نظر کی زد میں آئی ہے ——
بابا! یہ کیا ہے؟ باپ اپنے بچے کی سادگی پر مسکرانے پر مجبُور ہو جاتا ہے ——
بیٹا! یہ پتّے ہیں۔ دو قدم اور چلتے ہیں تو ایک سوال اور تیار ہوتا ہے ——
بابا! پتّے کیوں ہوتے ہیں۔ باپ جمع خرچ کی تفصیلات کے سمندر سے سر نکالتا ہے اور چند لمحے اس سوال کے نئے تیکھے پن پر دل ہی دل میں بچّے پر نازاں ہونے کے بعد کہتا ہے —— پتّے دھوپ کو روکتے ہیں بیٹا۔ بچّہ کھٹ سے نیا سوال داغ دیتا ہے — دُھوپ کو کیوں روکتے ہیں۔ باپ کی طبیعت میں برہمی کے آثار پیدا ہو چکے ہیں —— دُھوپ لگتی ہے تو چلّاتے ہو کہ نہیں ہائے گرمی، ہائے گرمی —— بچّہ چُپ سا ہو جاتا ہے لیکن دُھوپ چھاؤں نے راستے

میں جو گلکاری کر رکھی ہے وہ اس کی نظروں میں ایک طوفان بپا کئے دے رہی ہے۔ اس سے رہا نہیں جاتا ــــ بابا! دُھوپ کہاں سے آتی ہے۔ اب باپ کا غصہ بھی کچھ دھیما پڑ چکا ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر نرم سے لہجے میں بات شروع کرتا ہے ــــ دُھوپ سُورج سے آتی ہے۔ پھر اسے خیال آتا ہے کہ اب بچہ مزید سوال کرے گا، لاؤ پہلے ہی سے بہت سے مسائل حل کر دیں۔ چنانچہ سُورج کے بارے میں ایک تقریر کا آغاز کر دیا جاتا ہے جسے سننے کی کوشش کرتے کرتے بچے کی نظریں راستے کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا جائزہ لیتے لیتے درختوں پر پھدک پھدک پھرتی گلہری پر ٹک جاتی ہیں اور باپ کو سُورج سے واپس زمین پر پہنچ کر نیم افسردہ نیم شرمندہ لہجے میں بتانا پڑتا ہے کہ یہ گلہری ہے ــــ کیا واہیات ہوتے ہیں یہ بچے بھی۔ ہر وقت: یہ کیا ہے، یہ کیوں ہے، لگکے رکھتے ہیں۔ سیر ہی نہیں ہوتے یہ سوالوں سے۔

باپ کی برہمی بجا ہے۔ اس بیچارے کو تو روز مرّہ کے دھندوں نے ایسا اُلجھایا ہے کہ جانے کب سے اس کے دل میں کوئی ایسا بے معنی اور بے کار سوال نہیں اُبھرا۔ اُبھرا بھی ہو تو بہرحال اُس نے جواب کبھی نہیں دیا۔ آخر ایسے سوالوں سے حاصل ــــ آدمی کو تو کام کرنا چاہیے اور کام والے آدمی کو اتنی فرصت کہاں کہ فضول باتوں میں وقت ضائع کرتا پھرے۔ چنانچہ صبح ہوتی ہے تو اسی وقت سے غم روزگار اس کے سینے پر اپنا بھاری بوجھل ہاتھ رکھ دیتا ہے اور اُس کے دل کو اپنی سنگین مٹھی میں لے لیتا ہے اور گئی رات تک، جب تک نیند آنکھوں پر ترس نہیں کھاتی، اس کے دل و دماغ اسی کے پنجے میں اسیر رہتے

ہیں۔ یُوں یہی کہاں ثابت ہے کہ رات کو اُسے اُس غم سے نجات مل جاتی ہے لیکن دن کو تو ہر گز اُسے ایک لمحہ ایسا میسّر نہیں آتا جب وہ اپنے کام یا گھر کی مادی اور سماجی فکروں سے آزاد ہو — دفتر کی فائلوں، ماتحتوں کی کم فہمیوں اور افسروں کی غلط فہمیوں سے گھر کی ضرورتوں، بچّوں کی فیسوں اور بیوی کی فرمائشوں تک ایک پُل سا بنا ہوا ہے جس پر اس کا ذہن آر پار ہوتا رہتا ہے۔

ابھی تو اسے بیکار سوال پُوچھنے کی فرصت نہیں لیکن عنقریب وہ دن آ جائیں گے جب اُسے کسی طرح کے بھی سوال پُوچھنے کی فرصت بلکہ جرأت نہ ہوگی۔ ابھی تو وہ یہ سوچ لیتا ہے کہ فلاں مسئلے کا کیا حل ہو سکتا ہے، ماتحتوں کو کیسے ڈانٹا جائے، افسروں کو کیسے سمجھایا جائے، روپے کہاں سے آئیں گے، بچّوں کی فیس کہاں سے دوں گا، بیوی کا نیا کوٹ کیسے بنے گا۔ ابھی اس کے ذہن میں کچھ تدبیریں تجویزیں بھی آتی ہیں۔ لیکن عنقریب وہ یہ سوال کرنا بھی بھُول جائے گا۔ جو ہو سو ہوئے مجھے کیا۔ صبح دفتر گئے، جیسا کیسا دن کاٹا اور گھر آ گئے۔ اب تو گھر آ کر وہ کمر سیدھی کرنے لیٹ جاتا ہے پھر کمر ایسی دوہری ہو جائے گی کہ دفتر میں بھی سیدھی نہ رہا کرے گی۔ گھر میں جو ہو رہا ہے ہونا رہے۔ جو نہیں ہوتا بے شک نہ ہو۔ آخر وہ کیا کر سکتا ہے۔ وہ خدا تو نہیں۔

پھر یہ ہوگا کہ زندگی خوشبو اور ہوا اور ٹھنڈک سے خالی ایک صحرا بن کر رہ جائے گی جس میں مادّی اور سماجی فکروں کی بُو، گھٹن اور تپش سے دو گھڑی ٹھہرنا دشوار ہو جائے گا۔ آنکھوں کے آگے اور دل کے سامنے دولت، مرتبے اور شہرت کی مضبُوط، بے در دیواریں کھڑی ہو جائیں گی اور بھری پُری دُنیا کا سارا حسن یک

سے بہتا ہُوا گزرتا چلا جائے گا اور اُسے خبر بھی نہ ہوگی کہ وہ کس کس نعمت سے محروم رہا جاتا ہے اور اپنے ہی ہاتھوں کھڑی کی ہوئی دیواروں کو اُونچے سے اُونچا اٹھانے میں اپنے لہو کو کیسے بے دریغ صرف کر رہا ہے — لہو جو محض اس لیے نہیں تھا بلکہ زندگی کے رس، زندگی کے حسن، زندگی کے آہنگ سے ہم کنار ہونے کے لیے تھا۔

وہ بچّہ جو زندگی کے ہر منظر کو دیکھ کر حیران ہوتا ہے اور اس کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہے جب انسان اپنے اندر اس کا گلا گھونٹ دیتا ہے تو زندگی کی رنگینی ختم ہو جاتی ہے اور محض سنگینی باقی رہ جاتی ہے۔ انسانی زندگی میں بچّے کے اس سرمایے کی بے حد اہمیت ہے۔ یہ صلاحیت قیمتی ہے اور اُسے جان سے لگا کر رکھنا چاہیے تاکہ زندگی اپنے معنی اور حُسن کے دروازے ہم پر ہمیشہ وا رکھے اور ہم اپنی بنائی ہوئی مادّی اور سماجی دُنیا کی چار دیواری میں بے رس ہو کر، گھُٹ کر نہ رہ جائیں — اور دلچسپی ہوئی زندگی ہمارے ذہنوں اور تخیل ہی نہیں ہمارے جسموں کو بھی چھوئے چھیڑے اور نئی منزلوں کا پتا دے — ہم اس بچّے کے باپ بن کر نہ رہ جائیں۔

محبّت کا جنم

جس طرف دیکھیے برف ہی برف دکھائی دیتی ہے۔ برف نے پُورے منظر کو اس طرح ڈھک رکھا ہے کہ آسمان اور زمین میں امتیاز مشکل ہے۔ آسمان برف کے بادلوں اور زمین برف کے لبادے میں لپٹی ہے۔ درخت، مکان، رستے، میدان، کھیت اور باغ سب اسی کفن میں دبے ہیں۔ یُوں سمجھیے کہ آنکھوں کے آگے برف کا پردہ پڑ گیا ہے، آنکھیں بے نُور ہو گئی ہیں، دکھائی دینے کے باوجود کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔

آپ ایک اَن جانے راستے پر آغاز اور انتہا سے بے خبر — اُونچ نیچ، دائیں بائیں، سیدھے ٹیڑھے سے بے خبر چلے جا رہے ہیں۔ یہ تو جانتے ہیں کہ چل رہے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ کہاں سے چلے تھے اور کہاں ہیں۔ اور جب یہ نہ پتا چلے تو یہ محسوس کرنا بھی عجب نہیں ہوتا کہ چل بھی رہے ہیں یا ساکن ہیں۔ حقیقت، واہمہ معلوم ہونے لگتی ہے اور واہمہ حقیقت۔

آپ چل رہے ہیں یا نہیں چل رہے۔ آپ آگے جا رہے ہیں یا پیچھے پلٹ رہے ہیں — اس تفصیل کو جانے دیجیے، یہاں تو یہ مسئلہ بھی درپیش ہے کہ آپ کب چلے تھے اور اب وقت کے کس موڑ پر یوں اکیلے رہ گئے ہیں۔ یہ صبح ہے یا شام، دوپہر ہے یا رات، کب سے چل رہے ہیں، کب تک چلیں گے۔ اور

پھر وہی پُرانا مسئلہ کہ کہاں سے چلے تھے اور کہاں جا رہے ہیں۔ آپ زمان و مکاں کے ایک ایسے مقام پر اکیلے کھڑے ہیں (کھڑے ہیں یا چل رہے ہیں) جہاں روشنی اندھیرے سے جُدا نہیں، اندھیرا اور روشنی ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں، کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

کچھ بھی نظر نہ آنے کے باوجود آپ کو علم ہے کہ جہاں سے آپ گزر رہے ہیں، یہ آپ کا شہر ہے، اس شہر میں کتنے ہی آپ کو جاننے والے لوگ بستے ہیں، ان میں کتنے ایسے ہیں کہ آپ سے صبح و شام ان کا ملنا جلنا رہتا ہے، اس وقت وہ اپنے گھروں میں دبکے ہوں گے، آپ سے غافل، آپ سے بے پروا۔ ہو سکتا ہے اس وقت آپ جس جگہ پہنچے ہوں وہ آپ کے کسی جاننے والے کا ٹھکانا ہو۔ لیکن وہ تو آپ کی حالت سے بے خبر اپنے دروازے بند کیے پڑا ہے۔ آپ اگر دستک دیں تو شاید یہ کسی اجنبی کا گھر ثابت ہو یا ہو سکتا ہے جاننے والے ہی کا ہو مگر ایسے میں وہ آپ کو پہچانتے ہی نہیں۔

یہ آپ ابھی جس جگہ سے مڑے ہیں اسی موڑ پر شاید پھولوں کا وہ رنگین قطعہ ہے جو آتے جاتے والوں کی آنکھوں میں جگمگ جگمگ پیدا کر دیتا ہے اور نتھنوں کو میٹھی میٹھی خوشبو سے بھر دیتا ہے۔ جہاں سے گزرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے جیسے دل کا غبار دُھل گیا ہے اور ذہن کا بوجھ ہٹ گیا ہے۔ لیکن شاید یہ وہ موڑ نہ ہو اور وہ مقام ہو جہاں بلدیہ نے شہر بھر کی گندگی جمع کرنے کا ڈپو بنا رکھا ہے، جہاں سے گزرتے ہوئے پیدل اور سائیکل سوار لوگ مُنہ اور ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں اور خود آپ یہ کرتے ہیں کہ دُور ہی سے لمبا سا سانس سینے

میں بھر لیتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ اُسے نکالتے نکالتے یہ موڑ مُڑ جاتے ہیں اور خاصی دُور جا کر نیا سانس لیتے ہیں۔ برف نے اس مقام کو بھی ڈھانپ رکھا ہے، ہوا ہر طرح کی خوشبو اور بدبُو سے خالی ہے اور آپ ہر طرح کے تاثرات سے خالی ہیں ـــــ اس خلجان کے سوا کہ یہ کونسا مقام ہے، آپ اپنے دل و دماغ کو خالی ہی پاتے ہیں، آپ کے حواس تک منجمد ہو چکے ہیں، بیکار ہو چکے ہیں۔

آپ اب بھی چلتے چلے جا رہے ہیں۔ بہر حال آپ کے قدم رواں ہیں، خواہ وہ آپ کو آگے لے جا رہے ہوں یا پیچھے، دائیں لے جا رہے ہوں یا بائیں۔ چلتے چلتے آپ تھک کر چُور ہو گئے ہیں، لیکن آپ کہاں رُکیں، کہاں دم لیں ؟ اچانک آپ کسی چیز سے ٹکراتے ہیں اور بے دم ہو کر گر جاتے ہیں۔ بے ہوشی اور پھر موت جیسی گہری نیند آپ کو دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور یُوں زندگی کا ایک عجیب، طویل، کٹھن، بے کار، بے معنی اور بے ربط لمحہ اپنی انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ آپ بھری کائنات میں اکیلے رہ جاتے ہیں۔

جب آپ کی آنکھ کُھلتی ہے تو آپ کے کانوں میں کئی طرح کے پرندوں کے چہچہے گونج رہے ہوتے ہیں۔ آپ محسوس کرتے ہیں کہ یہ واہمہ ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ واہمہ حقیقت معلوم ہونے لگتا ہے۔ جس چیز سے آپ ٹکرا کر بے سُدھ ہو گئے تھے اور جس کے پاس آپ ادھ موئے پڑے رہے تھے وہ ایک سدا بہار درخت تھا اور اس پر چھوٹے بڑے بیسیوں پرندے اپنے اپنے راگ الاپ رہے تھے۔ کیا صبح ہونے والی ہے یا شام ہونے کو آئی ہے کہ یہ چڑیاں یُوں اُودھم مچا رہی ہیں۔ اتنے میں آپ کی گھومتی پھرتی آنکھیں آسمان کے ایک روشن سے حصّے پر

جم جاتی ہیں اور جمی رہتی ہیں۔ اب آہستہ آہستہ سوئی ہوئی ہوا ابھی جاگنے لگتی ہے اور دیکھتے دیکھتے رفتار پکڑ لیتی ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے برف کے بادلوں کا مضبوط سائبان پھٹ جاتا ہے اور صبح کا تارہ زمین کو ایک روشن دن کی نوید سُناتا ہے۔ آسمان کا وہ حصّہ جہاں آنکھیں تھوڑی دیر پہلے جمی تھیں، اب روشن تر ہونے لگا ہے، نئے سورج کی پیلی، پھر نارنجی اور آخر میں سُرخ سُرخ جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں اور پھر ایک لرزتا، کانپتا، ڈگمگاتا ہُوا لال لال سورج طلوع ہوجاتا ہے جو آہستہ آہستہ نارنجی، پھر پیلا اور پھر سفید بن جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ لرزنا، کانپنا، ڈگمگانا چھوڑ کر آسمان پر مضبوطی سے قدم جماتے ہوئے اُوپر ہی اُوپر چڑھنا شروع کردیتا ہے۔ شہر سے دُور بیٹھے بیٹھے آپ اب اتنے اکیلے نہیں رہے ـــــ گھومتی پھرتی، اردگرد چاروں طرف دیکھتی آنکھ اب برف کے کفن میں ملفوف شہر کی لاش میں زندگی دیکھنے لگی ہے۔ گھروں کی چمنیوں سے اُٹھتا ہُوا دھواں سورج کی تمازت سے مل کر آپ کے دل پر جمی ہوئی برف کی دبیز تہوں کو چاٹنے لگا ہے اور دل جو آرزوؤں اور اُمنگوں سے خالی ہوگیا تھا اب زور زور سے دھڑکنے لگا ہے ـــــ کوئی چپکے سے دل سے کہتا ہے: میں تجھ سے دُور نہیں۔

محبت نے جنم لے لیا ہے۔ برف پگھل گئی ہے، آپ اور کائنات میں رشتہ قائم ہوگیا ہے۔

محبّت کی گلیاں

چھوٹے میاں صبح کی اذان اور مُرغ کی بانگ کے ساتھ ہی اپنا پہلا نعرہ لگاتے اور وہ اس خیال سے کہ برخوردار رات بھر کے سوئے سوئے اُٹھتے ہی اپنے بستر پر پیشاب کر دیں گے، بیوی کے گرم گرم بازوؤں کو نرم نرم ہاتھوں سے چادر پر ڈال دیتا اور لحاف کی میٹھی حرارت کو جلدی سے خیرباد کہہ کر بچے کی پلنگڑی کا رُخ کرتا۔ چھوٹے میاں اب اتنے چھوٹے بھی نہ رہے تھے، شاید اپنے کو باقاعدہ آدمی سمجھتے ہوں، بہرحال پُورے دس مہینے کے ہو چکے تھے۔ بات کرنی تو ابھی نہ آئی تھی لیکن بیٹھنے، گھسٹنے بلکہ کچھ کچھ کھڑا ہونے میں تاک ہو چکے تھے۔ وہ اب اکثر سویرے اپنے چھوٹے سے لحاف کے حصار سے باہر بیٹھے اُس کا انتظار کرتے پائے جاتے تھے۔ اس کے ہاتھ بڑھاتے ہی بعد میں پھیلتے، ننھے میاں پہلے سے گود میں آنے کو بلکتے۔

غسل خانے سے نکل کر وہ دونوں خواب گاہ میں آتے، ننھے میاں سوئی ہوئی ماں کو ننھا سا پیار کرتے اور وہ سوئی ہوئی بیوی کو صبح کی بشارت کے طور سے ایک جگا دینے والا بوسہ دیتا۔ پھر دونوں باہر نکل جاتے۔ صبح کا تارہ ان کا منتظر ہوتا۔ ننھے میاں تارہ دیکھتے ہی اس کی طرف دیکھتے گویا کہہ رہے ہوں کہ بابا آپ نے بھی دیکھ لیا ہے نا۔ کتنی ہی مرتبہ ننھی ننھی آنکھیں جھپک جھپک کر اس کی آنکھوں کو صبح کے

مزوں میں شرکت کی دعوت دیتیں۔ اسے سردی کا اثر کہہ لیجیے یا بچّے کی اس زندہ نظری کا سرور کہ وہ کمبل میں لپٹے ننھے میاں کو سینے سے بھینچ بھینچ لیتا۔

پھر صبح کے نارے کے تیز نچے، اُفق پر، صبح کی سفیدی اپنی اوّلین جھلکیاں بکھیرنے لگتی اور شمال سے جنوب کی جانب جاتے ہوئے طوطوں، کوّوں اور کرسَتوں کے غول کے غول آسمان پر نمودار ہونے لگتے۔ ہر نئی آواز اور ہر تازہ شکل کے ساتھ ننھے میاں کی آنکھوں میں ایک نئی تازہ چمک اُبھرتی، ان کے ہونٹ وا ہوتے اور وہ ایک کلکاری مارتے۔ آج چھٹی تھی —— دفتر اور شیوسے چھٹی۔ اُس نے سوچا، لاؤ ذرا ٹہل ہی آئیں، اتنے میں دودھ والا دودھ لے آئے گا۔ ملازم کو جگا کر وہ گھر سے سڑک پر آ گئے۔

باہر ہوا ابھی جاگ چکی تھی، ننھے میاں ہوا کے ہر جھونکے پر اُس کی طرف دیکھتے پھر اُن کا دھیان بٹ جاتا۔ راستے میں کُتّے، بلّیاں اور اوپر پرندے انھیں اپنی طرف کھینچتے یا پھر وہ کمبل سے نکلا ہوا ننھا سا ہاتھ ہلا ہلا کر کوئی بڑا ہی شُدھ راگ الاپنے میں مگن ہو جاتے۔ نہر کے پُل پر پہنچتے پہنچتے کوئی بیس مرتبہ وہ ہاتھ ان سے نکل نکل گئے ہوں گے —— کبھی کسی کُتّے بلّی، کبھی کسی طوطے کوّے کی آواز کا پیچھا کرتے۔

پُل پر ابھی آمد و رفت کا وہ عالم نہ تھا جو دن بھر عموماً ہوتا ہے۔ یوں بھی آج چھٹی کا دن تھا، وہ خاصی دیر وہاں کھڑے رہے۔ ہوا سرسراتی ہوئی آتی اور ننھے میاں بے قابو ہو ہو جاتے۔ سونے پر سہاگہ، خزاں زدہ شیشم کے بڑے بڑے درخت جو پُل کے کناروں پر ہمیشہ سے کھڑے تھے، ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ سوکھے پتوں کا ایک

کھڑ کھڑاتا اُڑھیر نہر کے پانی کی سطح پر بکھیر دیتے، کچھ پتے اُس کے اور ننھے میاں کے سروں اور کپڑوں پر آ گرتے اور یُوں ننھے میاں کو خوب خوب ہنسنے کا موقع مل رہا تھا۔

واپس آتے ہُوئے کتنے بلّیاں تو نظر نہیں آئے البتہ یہاں وہاں لوگ آتے جاتے دکھائی دینے لگے تھے۔ کوئی کوئی سائیکل اور ایک آدھ کار۔ لیکن جو کوئی بھی ان کے پاس سے گزرتا یُوں محسوس ہوتا ننھے میاں کی اُس سے گاڑھی چھنتی ہے۔ کسی کی طرف دیکھ کر وہ مُسکراتے، کسی کی طرف دیکھ کر ہنستے، کسی کے استقبال کو ہاتھ بڑھاتے، کسی کے تعاقب میں نظریں دوڑاتے۔ کوئی کوئی شخص تو نام لے کر ننھے میاں کو چمکارتا بھی۔ اُسے عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ وہ تین سال سے اس علاقے میں رہ رہا تھا لیکن اپنے ہمسائے تک کے نام سے آشنا نہ تھا اور یہ ننھے میاں محلے بھر کے دوست بنے ہُوئے تھے حالانکہ انھیں دُنیا میں آئے بمشکل دس مہینے ہُوئے تھے۔

گھر پہنچے تو ملازم دُودھ گرم کر چکا تھا۔ اُس نے شیشہ لیا اور لان میں بنچ پر بیٹھ کر ننھے میاں کو دُودھ پلانا شروع کیا لیکن ننھے میاں تو لان میں اُدھم مچاتی پھرتی چڑیوں اور بُلبلوں میں ایسے مصروف تھے کہ اُنھوں نے آدھا دُودھ شیشے ہی میں چھوڑ دیا۔ اتنے میں ملازم ناشتے کا سامان لینے باہر جاتا نظر آیا۔ ننھے میاں نے وہیں سے اپنے بازو پھیلا دیے کہ بھئی مجھے کہاں بھُولے جا رہے ہو۔ ملازم اُنھیں بھی ساتھ لے گیا۔ اب اُس کی بیوی بھی باہر آ گئی تھی۔ وہ دونوں لان ہی میں بیٹھے تھے تاکہ ملازم آئے تو ننھے میاں کو اُس سے لے لیا جائے۔ ملازم ناشتہ بناتا یا اُنھیں رکھتا لیکن ننھے میاں آئے تو وہ تو ملازم کی گود سے اُترنے پر

ہی رضا مند نہ ہو رہے تھے۔ بڑی مشکلوں سے ماں کے پاس آئے بلکہ شاید اُن کی ماں کو کچھ بُرا بھی محسوس ہوا کہ دیکھو، مجھ سے زیادہ بچّے کو ملازم سے لگاؤ ہے۔

وہ لان ہی میں بیٹھے تھے کہ جمعدارنی صفائی کے لیے آگئی۔ اُس نے دُور ہی سے ننھے میاں سے ایک انوکھی سی زبان میں چوں چڑاں کی۔ ننھے میاں کی تو باچھیں کھل گئیں۔ اتنے میں جمعدارنی کا لڑکا بھی پہنچ گیا۔ وہ تو سیدھا لان ہی میں چلا آیا اور لگا ننھے میاں کے سامنے اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے۔ اوٹ پٹانگ تو صرف اُسے یا اس کی بیوی کو محسوس ہو رہی تھیں ورنہ ننھے میاں تو خوشی کے مارے پھُولے نہ سما رہے تھے ۔۔ تو گویا ننھے میاں جمعدارنی کے بیٹے کے بھی دوست ہیں۔

صبح کے تارے سے لے کر جمعدارنی کے لڑکے تک ننھے میاں نے کتنی ہی جگہ دل لگا رکھا ہے، اُن کی محبت کا دھارا کتنے ہی راستوں میں بہتا ہے۔ لیکن خود اُن کی محبت تو بڑی لگی بندھی ہے۔ کیا وہ بھی بچپن میں اتنے بڑے دل کا مالک نہ تھا، پھر اب کیا ہو گیا ہے؟

محبّت کا کنُواں

وہ بہت دنوں سے سوچتی تھی کہ جب سے شادی ہوئی ہے اپنے شہر نہیں گئی۔ ماموں جان خط پر خط لکھ رہے تھے کہ کبھی آؤ۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ ہر مرتبہ ٹالا بالا بتا جاتی تھی۔ کبھی کوئی بہانہ، کبھی کوئی۔ اُس کے میاں نے کتنی بار خود یہ پیش کش کی کہ وہ اُسے چھوڑ آئے گا لیکن ہمیشہ وہ کچھ اس انداز سے یہ پیش کش ٹھکرا دیتی کہ میاں کو اس انکار میں اپنے ساتھ گہری محبت کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ مگر کب تک، اچانک ایک دن تار والے نے بُلاوے، پیش کش اور انکار کی یہ تکون ڈھا دی —— اس کی ممانی کو ناگہاں موت نے آن لیا تھا۔ تو اب اُسے جانا ہی ہوگا۔ مگر اس کے اچھے بھلے شریفانہ غم کی سطح کے نیچے ایک بڑا ہی چور جذبہ لہریں لیتا رہا —— ممانی کی وفات کی خوشی (اللہ کتنی بُری بات تھی)۔ وہ رات ہی کی گاڑی سے چل دیئے۔

برسوں کی جانی پہچانی گلی میں داخل ہوتے ہی ایک خونخوار قسم کی کتیا سے پالا پڑا جس نے تازہ تازہ بچے دیئے تھے اور جسے خواہ مخواہ ہر اجنبی پر یہ شک گزرتا تھا کہ وہ ضرور اُس کے بچوں کا دشمن ہے۔ کتیا کو بھونکتا سُن کر پاس کے دونوں گھروں سے کئی سر ایک ساتھ باہر جھانکے —— ارے وہ آگئی ہے، وہ گھر بعد میں پہنچے، یہ خبر پہلے پہنچ گئی۔ برسوں بعد وہ اُس گھر میں قدم رکھ رہی تھی،

جہاں اُس نے شعور، لڑکپن اور جوانی کی منزلیں طے کی تھیں۔ لیکن ایک تو موقع ہی غم کا تھا، دوسرے اس گھر میں جو عرصہ گزرا تھا وہ ایسا ٹھنڈا اور اندھیرا تھا کہ دہلیز پار کرتے ہوئے اُس کے سارے بدن میں ایک لرزش سی دوڑ گئی۔ مگر پھر فوراً ہی اُسے یاد آگیا کہ ممانی اب اس دُنیا میں نہیں۔ اب شاید گھر کی ٹھنڈک اور اندھیرے میں کمی آگئی ہو۔ ہائے کیسے دن تھے وہ جب سُورج کی گرمی اور روشنی جیسے مرگئی تھی اور ایک بس ممانی کی آنکھوں میں تیرتی پھرتی بے مہری سارے میں چھائی رہتی تھی۔ شام گئے کہیں ماموں نظر پڑتے تو اس کا کھچاؤ کچھ کم ہوتا، ورنہ دن بھر تو وہ اسی فکر میں تنے ہوئے رستے پر سوار رہتی کہ کہیں اس کی کوئی بات ممانی کو ناگوار نہ گزر جائے۔

وہ کوئی سال بھر کی ہوگی کہ ماں اللہ کو پیاری ہوگئی تھی، باپ نے دُوسری شادی کرنے میں دن نہ لگائے تھے اور اُسے ماموں اپنے یہاں لے آئے تھے۔ لیکن ممانی تو نہ لائی تھیں نا۔ ان کے ماشاءاللہ اپنے چار بچّے تھے تین بچّے اُس کے اُن کے یہاں آنے کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ یُوں تو ماموں اچھے کھاتے پیتے نہ ہوتے تب بھی اُس کی ماں کے نام جو جائداد تھی وہ اس کی کفالت بخوبی کر لیتی لیکن ممانی کو تو یہی محسوس ہوتا رہا کہ یہ چڑیل اُن کے ماتھے خواہ مخواہ مڑھ دی گئی ہے۔ پھر ممانی سے چلتا چلتا یہ احساس ان کے بچّوں میں بھی سرایت کر گیا اور ایک چھوٹی سی جان اپنی سی کوشش کے باوجود اُن کے دلوں میں اپنے لیے گرمی نہ پیدا کر سکی۔ لے دے کے ایک ماموں تھے۔ انھیں بھی یہ خیال کبھی نہ گزرا ہوگا کہ بہن کا لگایا ہوا یہ بُوٹا روشنی اور گرمی سے محروم اندر ہی اندر مرجھا رہا ہے۔

اتنی نیک دل ممانی ہے اس کی، ارد گرد بھائی بند ہیں ۔ اور کیا چاہیے اُسے۔ خود وہ بھی اکثر اُسے جوتی کپڑا لا دیتے۔

پھر جوانی نہ جانے کیونکر اُس تک راہ پا گئی اور وہ ڈری ہوئی ہرنی کی طرح ممانی کی آنکھوں سے چھپتی پھرنے لگی۔ آنکھیں جو گھومنا چاہتی تھیں جکڑی جکڑی گئیں سینہ جو پھُولنا چاہتا تھا کمر کے جھکاؤ میں ڈوبا رہتا۔ چال کی ٹھنک سے خود اُس کے اپنے دل میں کھٹکا سا لگتا۔ جُوں جُوں بچّے بڑے ہوتے جا رہے تھے گھر سُونا ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی اس سے بات تک کرنے کا روادار نہ تھا۔ ممانی اور بچّے ایک جماعت تھی اور وہ دوسری۔ ریلوے جنکشن پر کٹے ہوئے ڈبّے کی طرح کبھی وہ ایک پٹڑی پر دوڑتی کبھی دوسری پر، لیکن کوئی ریل اُسے اپنے ساتھ نہ جُڑنے دیتی۔ اُسے یہ شرف کبھی نہ حاصل ہُوا کہ کوئی اس سے بھی اتنا پُوچھ لیتا کہ تمھاری طبیعت کیوں گری گری ہے۔ ہر مہینے اُسے پانچ پہاڑ جیسے دن کاٹنے ہوتے تھے لیکن شرم کے مارے وہ کسی سے آج تک کچھ نہ کہہ سکی تھی۔ ممانی اُس کی اس بے قاعدگی اور تکلیف سے بخوبی واقف تھیں لیکن اُن دنوں میں تو اُن کی آنکھوں کی بے رحمی باقاعدہ حقارت میں بدل جاتی تھی جیسے اُس کی وجہ سے گھر ہی ناپاک ہو گیا ہو۔

اور وہ قیامت کا دن، جب پہلے پہل ایّام آئے تھے، حیرانی اور خوف سے پاگل بنائے دے رہے تھے۔ ممانی سے اتنا تو کیا ہوتا کہ بیٹھ کر سمجھاتیں، دفت پر بھی بُرا سا مُنہ بنا کر ایک طرف ہو رہیں۔ کیسا اندھیرا دن تھا وہ، آج تک وہ دن ہر مہینے اُس کے دل پر اپنا سایہ ڈالتا چلا آتا تھا۔

ممانی کو دُنیا سے جاتے گیا تھا۔ ماموں جان اُسے دیکھ کر پھُوٹ پھُوٹ کر روئے،

بچّوں نے بھی رہی سہی بھڑاس نکالی۔ وہ بھی رو رہی تھی مگر دل میں دُور کہیں ایک مسرّت کی کرن بھی ناچ رہی تھی۔ اُسے بڑی ہی شرم آئی مگر یہ کرن وہیں کی وہیں رہی۔

کوئی ہفتے بعد وہ واپس جانے لگی تو اُس کے ساتھ ممانی کے دونوں چھوٹے بچے بھی تھے ـــ اپنا پہلا بچّہ تو ابھی اس کے پیٹ میں تھا۔ دل میں یہ بات تھی کہ ممانی کی محبّت تو اپنے پیٹ کے کنوئیں سے باہر ٹھنڈی پڑ جاتی تھی لیکن میں ان بچّوں کو بھی اپنے ہی پیٹ سے نکلا جانوں گی۔ اس مرتبہ وہ گلی سے نکلے تو کُتیا پھر بھونکی۔ اس کے دل میں مسرت کی ایک اور کرن لہرائی ـــ مجھ میں اور اس میں کچھ تو فرق ہے۔

محبّت کا اعجاز

سب اس سے نالاں تھے۔ بہنیں، بھائی، ماں، باپ، دوست، اُستاد، ہمسایے، رشتہ دار۔

ہماری بہنیں یُوں بھی جذباتی طور سے بھائیوں کی ذرا زیادہ ہی محتاج واقع ہُوئی ہیں۔ بھائیوں سے جو جو اُمیدیں وہ وابستہ کر لیتی ہیں بھائی لوگ شاذ ہی انھیں پُورا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں لیکن اس کے معاملے میں تو بہنیں بچاری اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئیں۔ اُس نے بھُولے سے مُنہ سے کبھی کسی سے حال احوال بھی نہ پُوچھا تھا، دوسرے تیسرے چھوڑ، سال شش ماہی، عید بقر عید بھی اسے یہ توفیق نہ ہوتی کہ دو ٹکے کی چیز ہی ان کے لیے لے جاتا۔ جو بہن بیاہی ہُوئی تھی اُسے میکے آکر ہی اس کی صُورت دیکھنی نصیب ہوتی تھی ورنہ وہ تو بھُولے سے بھی اُس کے گھر کے پاس نہ پھٹکتا تھا۔ جو دو پڑھتی تھیں اُنھیں یہ اطمینان تو ضرور تھا کہ چلو ڈنڈا لیے پیچھے تو نہیں پڑا رہتا لیکن دل ہی دل میں اُنھیں کھُد بُد لگی رہتی تھی کہ اُس کے لیے تو شاید وہ ہیں ہی نہیں۔

بھائیوں کا وہ اس حد تک بھائی تھا کہ اُن سے اُس کی شکل ملتی جلتی تھی اور وہ ان کے نام بھی جانتا تھا۔ شاید یہ بھی علم ہو کہ کون ملازم ہو چکا ہے اور کون ابھی پڑھتا ہے لیکن یہ پتا نہ تھا کہ کون کہاں ملازم ہے اور کون کس درجے میں

بڑھتا ہے۔ بہرحال یہ تو ہرگز خبر نہ تھی کہ کس کی کیا تنخواہ ہے اور کس نے کالج میں کیا مضامین لے رکھے ہیں۔

ماں یہی چیختی رہتی کہ بالوں میں تیل لگا لو، کنگھی کر لو۔ پاجامے پہننے کے بجائے پتلون پہنا کرو — اُس بیچاری کو شاید یہ خیال ستاتا ہو گا کہ لوگ میرے بچے کو خواہ مخواہ کم شکل سمجھتے ہیں، وہ چاہے تو اچھا بھلا شریف آدمی دکھائی دے۔ مگر اُسے تو نہ جانے کیا مار تھی، سُن ہی کے نہ دیتا تھا۔ کئی مرتبہ وہ یہاں تک کہہ چکی تھی کہ یُوں پھرو گے تو کوئی بیٹی بھی نہ دے گا۔

باپ کا معاملہ سب سے الگ تھا۔ وہ اُدپر سے تو اس سے بات تک کرنے کا روادار نہ تھا لیکن بیچ ہی بیچ میں یہ بات دل کو لگا بیٹھا تھا کہ دیکھو کس ناخلف نے میری اُمیدوں پر کیسے پانی پھیرا ہے۔ میاں بیوی دو گھڑی باہم بیٹھتے تو میاں کی ساری اکڑ اُس کے آنسوؤں میں بہ جاتی — اس نے تو میری کمر توڑ دی ہے — پہلے جو ملتا تھا کہتا تھا "ملک صاحب، ماشاء اللہ یہ صاحبزادہ آپ کا بڑا ہونہار ہے۔ ضرور نام پیدا کرے گا۔ اور اب جو ملتا ہے کسی نہ کسی طور شرمندہ کرتا ہے۔ اس سے تو یہ مر وَر ہی جائے تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اور آگے آنسوؤں کا ریلا آواز کو روندتا ہوا گزر جاتا۔

دوستوں، ہمسایوں، رشتہ داروں کی بات چھوڑیئے اُنھیں دوسروں سے شکایتیں رہتی ہی ہیں، البتہ اُستادوں کو واقعی اس کی ہیئت کذائی کا رنج تھا۔ برسوں کی محنت کا بوٹا جو بس پھل لانے ہی کو تھا ایک دم سے خزاں پسند ہو گیا تھا اور اب مدت سے بالیدگی سر پھوڑ پھوڑ کر رہ جاتی تھی اور وہ اپنے

دروازے بند کیے پڑا تھا۔ نہ جانے اپنے علم اور ذوق کو اُس نے کس مُردہ خانے میں چھپا یا تھا، مجال ہے جو اُس کی کسی بات سے یہ پتا چل جائے کہ کبھی اسے ان سے بھی علاقہ تھا۔

آخر قصّہ کیا تھا۔ وہ کسی سے دل کی کہتا تو کچھ اُگ سُگ ہوتی۔ وہ تو جیسے اپنے آپ کو، لوگوں کو، خُدا کو، خُدا کی ساری خدائی بلکہ شاید خُدا کو بھی بھول چکا تھا (اگر وہ پیری فقیری شروع کر دیتا تو کاروبار خوب چمکتا۔ مگر اُسے اتنی بھی ہوش کہاں تھی) سے دے کے یہی سمجھ میں آتا تھا کہ وہ راستہ چلتے چلتے بھٹک گیا ہے اور اب اُسے اردگرد کی ہر چیز اجنبی اور پُر خطر محسوس ہوتی ہے، بے معنی اور بے کار، ٹھنڈی اور تاریک نظر آتی ہے۔ لیکن وہ سُورج کب طلوع ہوگا جو اس منظر کو روشنی، حرارت، کارمندی، معنی، لطف اور رفاقت بخشنے گا کیا بہن بھائی، ماں باپ، دوست، رشتہ دار، اُستاد، ہمسایے ایک طرف اور خدا دُوسری طرف اس سُورج کی حیثیت اختیار نہ کر سکتے تھے۔ یُوں خُدا کی ڈور اس کے ہاتھ سے بالکل چھُٹ جاتی تو شاید وہ بالکل ہی تحلیل ہو جاتا۔ لیکن وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خود کیا سوچتا تھا۔

دیکھنے والوں نے البتہ ایک دن ایک معجزہ دیکھا۔ وہ چہرہ جس کے گرد غم کا ایک ہالہ سا نظر آیا کرتا تھا ایک دن نہ جانے کیونکر دمکتا ہُوا محسوس ہُوا۔ آنکھوں میں بھی زندگی کی چمک نظر آتی۔ پھر جُوں جُوں دن گزرتے گئے اُس کی تو گویا کایا پلٹ ہو گئی۔ اب کینچلی اُتر گئی تھی اور زندگی نے کروٹ لے لی تھی۔ لباس، چال ڈھال، رفتار، سب نے چولا بدل لیا۔ وہ جو کسی بدرُوح کا

سایہ سا اس پر پڑا رہتا تھا اس کی جگہ اب کسی مہربان فرشتے نے لے لی تھی۔
آہستہ آہستہ گھر والے اور پھر دوست احباب بھی خوش دکھائی دینے لگے۔
اس انقلاب کی پوری کہانی کیا ہے —— یہ معلوم نہیں — رات وہ اپنے دوست
سے البتہ کچھ اس قسم کی بات کر رہا تھا —" اب تو ہر گھڑی یہی محسوس ہوتا
ہے کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہے، جی چاہتا ہے جتنا بھی اچھا لگ سکوں لگوں۔"

محبّت کی دُھوپ

ہاں تو، رات وہ اپنے دوست سے کہہ رہا تھا — "اب تو ہر گھڑی یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہے —"

اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ساری کائنات اُن دو آنکھوں کی کٹیلی نظروں کے سامنے گویا عُریاں ہو گئی ہے۔ خود اُس کی ہیئت کذائی اور پریشان حالی کے اٹوٹ خول کو وہ نظریں یُوں چیر گئی تھیں کہ اُسے اُس کی فوری طور سے خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ وہ تو جب وہ اپنی مالکہ کے ساتھ ساتھ گو نجتے 'بھاگتے بازار میں نہ جانے کہاں گم ہو گئیں اور وہ بھرے مجمع میں تنہا حیران کھڑا رہ گیا تو اس پر یہ حقیقت کھُلی کہ ان نظروں نے اُس کے ساتھ کیا ہاتھ کیا تھا۔

ساری برف پگھل گئی تھی اور وہ ہزاروں گز گہری برف میں سے لال لال لوتھڑے جیسے نو مولود بچّے کی طرح جیتا جیتا، تازہ تازہ، نیا نیا نکل آیا تھا۔ اپنی نا آراستگی اور بے آہنگی یُوں اس کی نگاہوں میں آ گئی تھی جیسے نویلی طرح دار دُلھن اچانک دُلھا کے قدموں کی چاپ سُنے اور مایوسی سے سر پہ ہاتھ پھیرے کہ ہائے اُس کے بالوں میں تو کنگھی ہی نہیں ہوئی اور وہ ہنستا ہُوا، کچھ کہتا ہُوا، پھُول جس پہ وہ دن بھر پانی چھڑکتی رہی تھی کہ وہ جاگتا رہے وہ یونہی اکارت گیا — سویا سویا دماغ اور کھوئی کھوئی رُوح دُور دُور کے آفاق سے سمٹ سمٹا کر

واپس اُس کے وجود میں مرکوز ہو گئے تھے۔ اس کا وجود بھر سا گیا تھا، برسوں کے بعد آباد ہو گیا تھا مگر دل جن تک وہ نظریں ظاہری خول کے ہر منظر کو نظر انداز کر کے اسے راستے سے ہٹا کر کمال بے خبری میں پہنچ گئی تھیں اب یوں پھڑپھڑا رہا تھا جیسے کسی بے دھیان چڑیا کو اچانک مٹھی میں داب لیں اور ذرا کی ذرا دبائے رکھنے کے بعد چھوڑ دیں اور چڑیا ایک دفعہ تو پھر سے اُڑ جائے لیکن پھر پاس کی منڈیر پر بیٹھ کر تھر تھر کانپنے، لرزنے لگے۔

کیا نظریں تھیں وہ۔ سوئے ہوئے، ڈھکے ہوئے، بجھے ہوئے دل تک وہ کیونکر پہنچ گئیں۔ اسے یوں پلک جھپکنے میں بیدار، عیاں اور تازہ کیونکر کر گئیں۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ نظریں اب بھی دُور کہیں اُسی پر گڑی تھیں، اُسے اپنی تمام ترسطحوں پر، تمام تر پردوں، تہوں، خولوں سمیت عریاں دیکھ رہی تھیں۔ اُس کے کان پھولے ہوئے بدن کے پھولے ہوئے لہو کی تمازت سے دہکنے لگے تھے اور آنکھیں وجود کی وحدت کے نشے سے نیم خوابیدہ سی ہو رہی تھیں۔ ذہن جو پہلے ہزاروں لاکھوں سمتوں میں بٹا پھرتا تھا اب ایک بڑے سے دھارے پر گرم سفر تھا اور اُس کی روشنی دھندلی دھندلی نہ رہی تھی، نور کی ایک مستقیم لہر بن گئی تھی۔ روح آسودہ اور راضی راضی تھی۔ اُس نے بازار میں کھڑے کھڑے چاروں طرف دیکھا، چلتے پھرتے لوگوں کے سروں کے اُوپر سے اُس کی نظریں اُن آنکھوں کی تلاش میں گھومیں۔ وہ دو آنکھیں تو کہیں نظر نہ آئیں لیکن فضا میں زمین سے آسمان تک جو کچھ موجود تھا وہ زندہ زندہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ نظریں اُس کے دل کے ساتھ ساتھ ہر دوسری چیز میں بھی سرایت کر گئی تھیں، ہر دُوسری

ہر چیز کو بھی بیدار، عیاں اور تازہ کر گئی تھیں۔

وہ کتنی ہی دیر وہیں پٹڑی پہ کھڑا رہا اور خون کو اپنے بدن میں گرم گرم دوڑتا سنتا رہا اور خوشبو سے مہکتی روشنی کو دل کی تیرہ و تار گپھاؤں میں تیرتے، سرسراتے دیکھتا رہا۔ جب اُس کے قدم رواں ہوئے تو اُس کی چال بدل چکی تھی، درماندگی رخصت ہو چکی تھی اور جولانی کا نزول ہو چکا تھا۔ اُس کا تھکا تھکا دل بھی آج اکیلا نہ تھا، اُس کی تھکان غائب تھی اور وہ مسرت کے سمندر میں رقصاں تھا۔ سوچ کی پُرعزم ہوا اسے آگے ہی آگے لیے جا رہی تھی اور تخیل کے تہ در تہ پردوں کی موسیقی اُس کے راستے میں نئے نئے دروازے کھولتی جا رہی تھی۔

وہ موجود ہے ۔۔۔ وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔ وہ جس کے بغیر میں ٹوٹی ہوئی مالا کے منکوں کی طرح بکھرا بکھرا تھا اور جس کی نظروں کی ڈوری میں اب میرے وجود کے سارے دانے پروئے پروئے محسوس ہوتے ہیں، وہی، ہاں وہی، وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے ۔۔۔ سورج بھی وہی ہے جو دن بھر مجھے دیکھتا ہے۔ چاند بھی وہی ہے اور تارہ بھی وہی کہ رات بھر مجھے اپنی نگاہ میں رکھتے ہیں۔ ہوائیں اُسی کی خوشبو ہے، خوشبو میں اُسی کا رنگ ہے، رنگ میں اُسی کی آنکھوں کی روشنی ہے۔ روشنی بھی وہی ہے، دھوپ بھی وہی۔ دھوپ جو دن کو روشنی بن جاتی ہے اور رات کو اندھیرا ۔۔۔ میں کہاں چھپوں، اُس کی نظریں میرے تعاقب میں ہر جگہ پہنچ جاتی ہیں، مجھے ڈھونڈ لیتی ہیں مجھے عریاں کر دیتی ہیں، پھول کی طرح، برسات کی رات میں جگنو کی طرح مجھے آزاد

کر دیتی ہیں، خوشبو کی طرح، بہتے پانی کی طرح۔ مجھے سمیٹ لیتی ہیں۔ دبوچ لیتی ہیں جیسے ہمکتے ہوئے بچے کو ماں ہوا میں اُچھال کر ہاتھوں میں دبوچ لیتی ہے اور بازوؤں میں سمیٹ لیتی ہے۔ میرے لیے تو اب کوئی جائے اماں ہی نہیں رہی۔ میرا تو اب کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا۔ سب اُس کی نظروں میں ہیں، سب اُس کی نظروں کے جادو سے پیارے اور قیمتی محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن وہ خود کہاں ہے، میری نظروں سے کیوں اوجھل ہے۔ اپنی نظروں کو میری نظروں سے ہم کنار کیوں نہیں ہونے دیتی۔ میں بھی تو اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اُس کی روشنی نے تو مجھے اُسے دیکھنے بھی نہ دیا تھا۔

محبت کا سایہ

"لیکن وہ خود کہاں ہے، میری نظروں سے کیوں اوجھل ہے۔ اپنی نظروں کو میری نظروں سے ہم کنار کیوں نہیں ہونے دیتی۔"

وہ نظریں اُس کے دل میں کھُب گئیں، اُسے بیدار، عیاں اور تازہ کر گئیں، اُس کے وجود کی شیرازہ بندی ہو گئی اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا میں بھی اُسے حسن اور معنی نظر آنے لگے تو آہستہ آہستہ یہ لگن بھی تیز تر ہونے لگی کہ اس حسن اور معنی کا سرچشمہ کہاں ہے؟

شروع شروع میں تو وہ خاصے دن اپنے آپ میں مگن اور اپنے وجود کی حدت میں سرشار رہا۔ لیکن جُوں جُوں دن آگے بڑھتے گئے وہ نظریں اُس کے وجود میں بھلے مارنے لگیں اور اسے اُکسانے لگیں کہ وہ اپنی تلاش کی رفتار میں اضافہ کرے۔ جب دُنیا سے وہ کٹا کٹا پھرتا تھا تو یہ دُنیا بھی اتنی بڑی نہ تھی۔ اُن نظروں نے تو اُسے اتنا اوپر اٹھا دیا تھا کہ کتنے ہی نئے آفاق اب اُس کی نگاہ میں تھے اور اسے اتنا نیچے اُتار دیا تھا کہ خود اپنے اندر اُسے کتنے ہی نئے طبقات کلبلاتے محسوس ہوتے تھے۔ ان آفاق اور طبقات کی اتھاہ رفعتوں اور پہنائیوں میں اب وہ اکیلا سرگرداں تھا۔ پہلے ایک چھوٹی سی دُنیا تھی اور وہ اس دُنیا سے بے خبر تھا۔ وہ بیج کے ایک دانے کی طرح بے رَس، ٹھنڈی مٹی پر پڑا تھا۔ مٹی اور

بیج میں رشتہ عنقا تھا لیکن اب تو وہ نظریں دھوپ اور نمی کا سرچشمہ بن کر اُسے مٹی سے یک جان کر گئی تھیں، مربُوط کر گئی تھیں۔ یہی تو ستم ہے۔ اب بیج وہ پہلے سادا دانہ نہیں رہا۔ اب وہ پھوٹ پھوٹ کر مٹی میں گھلنے ملنے لگا ہے ۔۔۔ اور وہ جس نے یہ سب کچھ کیا ہے جس نے اسے اردگرد کی دُنیا سے یک جان کر دیا ہے، مربوط کر دیا ہے، اس کی سنگین انفرادیت کا دوسرے انسانوں سے گھال میل کر دیا ہے، خود وہ کہاں ہے۔ اس کے بغیر تو وہ اپنے آپ کو مٹی کی تاریکی میں پھوٹتے ہوئے بیج کی طرح مستقبل سے بے خبر پا رہا تھا۔ اُسے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی محفل میں کوئی اُس کا شرکاء سے تعارف کرا کے خود غائب ہو گیا ہو، جس کے بلاوے پر وہ آیا ہو، وہ خود تو غائب ہو گیا ہو اور وہ دوسرے مہمانوں کے درمیان، اُن سے تعلق کے باوجود اپنے آپ کو اکیلا پا رہا ہو۔

نہیں۔ اُس کی حالت تو اُس پتنگ جیسی تھی جو بسنت کی سنہری صبح کو اچانک ایک مقام سے آسمان کی جانب اُٹھے اور سُورج کی البیلی کرنیں اس کے رنگین اور مہین جسم سے آر پار ہو جائیں، اُس کے روئیں روئیں کو منوّر کر دیں۔ پھر یہ پتنگ ڈور کی ڈھیل میں اُوپر ہی اُوپر، آگے ہی آگے بڑھتی جائے اور دیکھنے والوں کو یُوں محسوس ہو جیسے ایک نئے رنگ کا چھوٹا سا سُورج ہے جو نیلے آسمان پر تیرتا چلا جا رہا ہے۔ کوٹھوں پر چڑھے لوگوں کے شور اور آسمان پر کل بادل کی طرح چھائی ہُوئی دوسری پتنگوں کی سرسراہٹوں میں اس پتنگ کی سنسناہٹیں سر اُٹھاتی اور ڈوب رہی ہوں۔ ہوا کے بوجھ سے پتنگ کے نازک ریشمیں جسم پر سلوٹیں سی پڑتی اور پھسلتی ہوں اور اُس کا اُفقی شہتیر کبھی چلّہ چڑھی کمان کی طرح دوہرا ہو

ہو جاتا ہو اور کبھی تیر سے خالی کمان کی طرح ہوا ہی میں کسی فرضی ہدف کی تاک میں کستا ہوا ہو۔ لیکن اتنے میں ہوا کا ایک بے پناہ جھونکا اُٹھے اور اس پتنگ کو کوتوں ہی سے توڑ کر اپنے ساتھ لگائے اور پھر یہ پتنگ کوٹھوں پر، باغوں میں، اپنے خواہش مندوں کی خواہش پر پانی پھیرتی، ہوا کے نہاں پیچوں میں قید، ہوا کے گھوڑے پر سوار، کسی نئی انوکھی اجنبی منزل کی جانب رواں دواں ہو جائے۔

پھر سے دوپہر ہو جائے، سردی کا کڑاکا ٹوٹ جائے۔ دھوپ کی تمازت سے بدن تپ جائے، ہوا کی سیٹی بھی اُتر جائے اور اس کی رفتاریں فراٹا آجائے۔ پھر یہ پتنگ ہوا کے ایک زینہ پیچاں میں آسمان پر ایک تھکی سی دکھائی دینے لگے، بازار میں بانس سے سوکھی بیری باندھ کر مالِ غنیمت سمیٹنے والی لڑکا فوج کے ایک سالار کے مطابق 'اندھی' ہو جائے۔

شام ہو جائے، لوگ کوٹھوں سے اُتر آئیں، شہر کا شور سو جائے اور پھر لوگ بھی سو جائیں، ہوا تھم جائے۔ پتنگ آہستہ آہستہ آسمان سے زمین کی جانب اُترنے لگے، اُس کا منور بدن رات کے اندھیرے میں بے نور ہو جائے، دھوپ نے جو حرارت اُس میں نفوذ کر دی تھی وہ ٹھنڈی پڑ جائے۔ سوئے ہوئے شہر پر وہ ایک بیقرار روح کی طرح منڈلانے لگے۔ یہاں سے وہاں— چونکہ ڈور ساتھ تھی نہیں اس لیے کہیں اُلجھنے اٹکنے میں خاصی دیر ہو۔ آخر گھنٹوں کسی اجنبی اندھے کی طرح دربدر پھرنے کے بعد اسے کہیں ٹھکانا ملے۔

صبح ہو تو پتنگ ایک ٹنڈ منڈ درخت کی سوکھی ٹہنیوں میں دبکی نظر آئے۔

اُجڑی اُجڑی، مُرجھائی مُرجھائی۔ رات کی اوس نے اس کی تازہ رنگی پر بیچارا سا پھیر دیا ہو اور اسے برسوں بوڑھا بنا دیا ہو۔ پھر دن پر دن بیتتے چلے جائیں اور پتنگ کا کاغذ تپسیا کرنے والے سادھو کے گوشت کی طرح ہڈیوں سے جُدا ہو جائے اور شہتیر ہی شہتیر باقی رہ جائیں۔ پھر یہ شہتیر بھی درخت کی ننگی ٹہنیوں ہی گھل مل جائیں، اسی کا حِصّہ بن جائیں، اسی میں گم ہو جائیں۔ درخت ہرا بھرا ہو جائے لیکن یہ ویسے کے ویسے رہیں۔ درخت سُوکھ جائے لیکن یہ ویسے کے ویسے رہیں — وہ مسیحا کہاں ہے جو اس مُردہ پتنگ میں پھر سے جان ڈال دے جو کبھی کسی دکان کی زینت تھی، پھر آسمان بھر کی زینت بنی اور اب یُوں سب سے الگ پڑی ہے۔ کس کی منتظر ہے یہ — کاش وہ دکان ہی میں ٹنگی رہتی اور اُڑنے کا مزہ ہی نہ چکھتی۔

ہاں کاش وہ بھی محبت کی دُھوپ نہ چکھتا، اب یہ اس کے سائے تو ترسے کھائے جا رہے تھے۔

محبّت کا قیام

اِسے اُس نے پہلے دیکھا تو ضرور ہو گا لیکن محسوس ہرگز نہ کیا تھا۔ یُوں بھی اُس کی عادت تھی کہ نگاہیں جھکا کر چلتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ خُدا کا حکم ہے اور نہ اس لیے کہ وہ بہت شرمیلا تھا۔ اسے تو کچُھ اس قسم کا احساس رہتا تھا کہ لوگوں کی طرف، خاص طور سے خواتین کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے ان کا تو کچُھ نہیں بگڑتا البتہ آدمی آپ ہی اپنے جامے سے باہر ہو جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے، گھر والوں کے ساتھ سڑک پر ٹہلتے یا اکیلے دُکیلے کبھی بس سٹاپ پر کھڑے، کبھی بس میں آتے جاتے یہ اُسے نظر تو اکثر آئی تھی لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ اُسے محسوس کبھی نہ ہُوئی تھی۔ وہ اکثر ایک ہی بس سٹاپ پر کھڑے ہوتے لیکن ایک دوسرے سے بے تعلق، ایک دُوسرے کے وجود کے احساس کے بغیر۔ کم از کم اُس نے تو کبھی اس کی طرف پلٹ کے نہ دیکھا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ ایک ہی بس میں سوار ہونے کی نوبت بھی آئی اور پہلے داخل ہونے کے حق کے تحت یہ اُس کے بالکل قریب سے ہو کر بھی گزری لیکن اُس نے تب بھی اِسے کھُلی آنکھوں سے نہ دیکھا۔

ابھی تھوڑے ہی دن کی بات ہے وہ گھر سے نکل کر آبادی کی سڑک پر آیا تو ٹُنڈ منڈ شہتوتوں سے اٹی ہُوئی سڑک پر اُس نے ایک سبز سبز چیز گزرتے دیکھی

قد، چال، رفتار اور جسامت نے مِل جُل کر اُسے جھٹ پٹ سمجھا دیا کہ سبز لباس میں وہ ہی تھی۔ اب اُسے فیصلہ کرنا تھا کہ وہ اُس کے پیچھے پیچھے چلتا جائے یا اپنی نسبتاً تیز رفتار کو برقرار رکھتے ہُوئے اس سے آگے نکل جائے۔ ایسی صورتِ حال میں پیچھے پیچھے چلنے سے جہاں تعاقب کا پہلو نکلتا ہے وہاں شرافت بلکہ نجابت کا رنگ بھی دیکھا جا سکتا ہے — ویسے ہی جیسے آپ دروازے میں رُک کر انتظار کریں کہ دوسرا آپ سے پہلے گزُر جائے بلکہ یہاں تو یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ آگے جانے والا اپنے دھیان میں چلتا رہے اور اُسے یہ احساس بھی نہ ہو کہ کوئی اور بھی گزر رہا ہے، اُس کا نہ تو دھیان بٹے، نہ اس کی انا کو وہ ہلکی سی ٹھیس پہنچے جو ہر تیز رفتار ہر آہستہ رَو کو آگے نکلتے ہوئے پہنچاتا ہے۔ اس طرح آگے نکلنے میں اُسے ایک بے جا سے غرور کی جھلک نظر آتی تھی، جیسے کوئی بڑی سی کار ہارن دے کر چھوٹی سی کم رفتار کار کو اپنی گرد کے لبادے میں لپیٹ کر آگے چل دے۔ بہرحال تھوڑی دُور تو وہ پیچھے پیچھے چلتا رہا، پھر اچانک اُسے خیال آیا کہ اس طرح تو ہر وقت یہ دھیان رکھنا پڑے گا کہ وہ کہیں زیادہ قریب تو نہیں جا پہنچا، بہتر ہے کہ آگے ہی نکل جائے۔ اور وہ آگے نکل گیا۔ پاس سے گزرتے ہوئے اس نے اس کی طرف دیکھا تو نہیں لیکن آج اُسے اُس کی موجودگی کا احساس ضرور تھا اور یہ بڑی ہی انوکھی بات تھی۔ جب وہ بس سٹاپ پہ پہنچ کر رُکا اور اُس نے پیچھے نگاہ دوڑائی تو یہی سبز سبز چیز قریب آتی دکھائی دی۔ اُس کا دل پھیلا، پھر سمٹ گیا۔ وہ کھمبے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں بس آ گئی۔ یہ ابھی تھوڑے فاصلے پر تھی لیکن اس کی

رفتار میں تیزی آتے دیکھ کر وہ بھانپ گیا تھا کہ اسے بھی بس چاہیے تھی۔ کنڈکٹر نے دو تین مرتبہ اُسے اشارہ کیا کہ وہ چڑھ جائے لیکن وہ تو اس تکر میں تھا کہ وہ بھی پہنچ جائے۔ چنانچہ اُس نے احتیاطاً براہِ راست ڈرائیور سے گزارش کی کہ ذرا رُک جائے، ایک سواری رہ جاتی ہے۔ یہ تقریباً دوڑتی ہوئی بس تک آئی اور دروازے میں داخل ہوگئی۔ اس ایک لمحے میں اس نے اُس کی طرف شکر گزاری کے طور سے دیکھا اور اگلی نشستوں کی طرف بڑھ گئی۔

بس چل دی۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا لیکن اُس کا دل ایک نئی رفتار سے چل رہا تھا۔ یہ آنکھیں جنھوں نے آج مجھے دیکھا ہے یہ ہرگز وہ آنکھیں نہیں جنھوں نے اتنے دنوں سے میری زندگی کے تانے بانے کو تہ وبالا کر رکھا ہے، مجھے جگا رکھا ہے، مجھے مجسم انتظار بنا رکھا ہے۔ لیکن وہ آنکھیں اب ہیں کہاں۔ وہ آنکھیں ہیں کس کی، وہ ہے بھی یا نہیں۔ وہ ہو یا نہ ہو بہرحال آج جن آنکھوں نے مجھے دیکھا ہے ان میں بھی وہی نُور ہے جس کی جھلک میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھی تھی جواب میری آنکھوں سے دُور نہ جانے کہاں چھپی بیٹھی ہے۔ ہوسکتا ہے اُسے میرے وجود کا علم بھی نہ ہو۔ یا کبھی ہُوا بھی ہو تو یاد بھی نہ رہا ہو ــــ سرِ راہے ایک نظر دیکھ لینے کے اور پھر کبھی نہ ملنے سے کوئی کتنی دیر یاد رہ سکتا ہے۔ میری بات دوسری ہے۔ میں تو سویا ہُوا تھا، زندگی میرے قریب سے گزری اور مجھے جگا کر آگے بڑھ گئی۔ صبح صبح ہمارے گھر کے اُوپر سے ہوائی جہاز نہیں گزرتا، جس کے شور سے بیسیوں لوگ جاگ اُٹھتے ہیں۔ اب ہوائی جہاز کو بھلا ان لوگوں کے جاگنے کی کیا خبر۔ ان آنکھوں کا شاید

مجھے جگانے تک ہی میری زندگی میں دخل تھا۔ اب اگر میں اُن کی تلاش میں سرگرداں رہوں تو شاید بیلاحاصل ہی ثابت ہو۔ لیکن یہ آنکھیں، یہ نظریں جو آج میری زندگی میں داخل ہوئی ہیں، یہ نوکئی سالوں سے میرے آس پاس موجزن رہی ہیں، اس کے باوجود میں ان سے، ان کے نُور سے بے خبر چلا آیا ہوں ـــ یہ قصہ کیا ہے؟"

انھی خیالوں میں اُس کی منزل کہیں پیچھے رہ گئی۔ وہ اس وقت چونکا جب یہ اپنی سیٹ سے اُٹھ کر بس کے دروازے کا رُخ کر چکی تھی۔ یہ اُتری اور وہ بھی اُتر گیا۔ یہ چلتی گئی۔ وہ کھڑا رہا۔ تھوڑی دُور جاکر اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔

"کیا یہ وہی تو نہیں، ہرگز نہیں۔ تو پھر یہ کون ہے؟ یہ وہی نہیں تو پھر یہ میرے وجود میں کیونکر رچ رہی ہے۔ میرے دل میں کیونکر سرایت کر رہی ہے؟ وہ وہیں کھڑا تھا کہ یہ پھر اُس کے پاس سے گزری ـــ اُسے دیکھتی ہوئی، زیر لب مسکراتی ہوئی اور کچھ کچھ شرماتی ہوئی۔

وہ وہیں کھڑا رہا۔ حیران ہوتا ہُوا، دل ہی دل میں مسکراتا ہُوا، اسے محسوس کرتا ہُوا ـــ حیرانی سے، سکھ سے۔

محبّت اور آئینہ بندی

جب سے اُن نگاہوں نے اُسے محبت کے آفاق کی سیر دکھائی تھی وہ اُن نگاہوں کے گرد اگرد آئینہ بندی میں مصروف تھا ۔ وہ ایک لمحہ جو اَن گنت لمحوں میں اب نہ جانے کہاں جا چُھپا تھا اُس کے دل و دماغ میں کسی ایسے مرمریں مجسمے کی طرح متشکل ہو رہا تھا جسے ایک خلّاق فن کار آئے دن سنوارتا اور نکھارتا چلا جائے اور دیکھنے والی آنکھیں جس میں روز کسی نئی اور اہم خوبی کا اضافہ دیکھتی چلی جائیں ۔ اُس نے ان نگاہوں کو مرکز مان کر جو جو تو سیں کھینچی تھیں وہ دُنیا کی تمام تر خوبی و خوبصورتی پر محیط ہوگئی تھیں اور جوں جوں اُس کے علم کے ذرائع وسیع ہوتے جاتے تھے اور جوں جوں اسے زندگی میں نئے نئے رنگ اور نئے نئے روپ جلوہ گر دکھائی دے رہے تھے وہ انھیں بھی اُسی صاحبِ نظر کی ذات میں شامل کرتا چلا جاتا تھا ۔ یوں سمجھیے کہ اس کے لیے اب وہ ذات ذاتِ خداوندی سے بس چند ہی سیڑھیاں اِدھر کہیں مقیم تھی ــــ اب جہاں اُسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کا دل اُس ذات سے کتنا قریب ہے وہاں ساتھ ہی اسے خدا کی قربت کا بھی احساس ہوتا ۔ اُسے اکثر محسوس ہوتا تھا کہ جب وہ اُس ذات تک پہنچ پائے گا تو خدا تک رسائی بھی مشکل نہ رہے گی ۔

لیکن اب جو اُس نے اپنے وجود کو ایک ایسے وجود کی سرحدوں پر کھڑا پایا

جس کی طرف اب سے پہلے اُس نے کبھی نظر بھر کے دیکھا بھی نہ تھا، جو برسوں اُس کے آس پاس رہا تھا لیکن جو اُس سے پہلے کبھی محسوس ہی نہ ہوا تھا تو اس کے اندر ایک انوکھی کشمکش نے سر اُٹھایا — ایسی کشمکش جس نے اُسے بے رُخ سا کر دیا۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ اپنے صادق نہ رہنے پر رنجیدہ تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہرجائی ہرجائی ہو گیا ہے۔ دوسری بات سے وہ خوفزدہ تھا۔ اُس کی آنکھوں نے اسے واضح طور سے بتا دیا تھا کہ وہ تمام تر خوبصورتی جو اُس نے اُس ذات سے وابستہ کر رکھی تھی وہ اس وجود میں تقریباً عنقا تھی۔ اسے تو کچھ کچھ حیرت بھی ہوتی تھی کہ ایسی سیدھی سادی لڑکی کی جانب دل کیونکر کچھ سکتا ہے۔ نہ اس کی قامت قیامت خیز تھی، نہ رنگ ایسا شہابی تھا کہ خون دوڑتا دکھائی دیتا، نہ چال ایسی ہموار تھی کہ چلنے کے بجائے تیرنے کا احساس دلاتی۔ نہ آنکھوں میں شراب تھی، نہ ہونٹ گلاب کی پنکھڑیاں تھے۔ نہ ابرو چڑھی کمان تھے نہ زُلفوں کی چھاؤں ایسی گھنیری تھی کہ اہلِ دل دو گھڑی قیام کرنے کی آرزو کرتے۔ ناک نا ک ہی تھی استوان تلوار نہ تھی۔ کان کان ہی تھے رس کے کٹورے نہ تھے کہ مدھ مکھیاں فریفتہ ہوتی ہوتیں۔ گردن گردن ہی تھی، صُراحی وغیرہ سے اُس کا کوئی تعلق نہ تھا — یُوں اس پہلے آدمی نے اُس ذات سے جو خوبصورتی ٹانک رکھی تھی یہ تصویر اس کی عکاس نہیں، یہ تو میں نے ذرا خام انداز میں بتانا چاہا ہے کہ وہ جس لڑکی کو دل میں گھر کرتا پا رہا تھا وہ کوئی ایسی جمیلہ نہ تھی کہ ہر شخص پلٹ پلٹ کر اسے حسرت سے دیکھتا رہ جاتا۔ تیسری بات اُسے یہ چُبھ رہی تھی کہ شاید وہ اندر ہی

اندر کبھی سے اس لڑکی کی طرف کھچا رہا ہے اور اس کشش کا باعث وہی ہے جو اکثر و بیشتر لوگوں کے معاملے میں ہوتا ہے ـــ قربت ـ صنفِ مقابل کا جو فرد آپ سے قریب ہو آپ چپکے چپکے اپنے کامی جذبات کے لیے اسے کھونٹی بنا لیتے ہیں، کتنے ہی اَن مل بے جوڑ بندھنوں کے پیچھے ایسی ہی ہنگامی کشش کارفرما دکھی جاتی ہے ـــ لوگ اپنے سے بے حد کمتر لوگوں کی طرف کھچ جاتے ہیں اور بعد میں جب ہوش ٹھکانے آتے ہیں تو اُن کا جی چاہتا ہے یہ سب کچھ جھوٹ ہو جائے کہیں وہ بھی اسی بنا پر تو اس طرف نہیں جھک رہا کیونکہ لڑکی کی عمر تھی اور یہ لڑکی چونکہ روز نظر آ سکتی تھی، یہیں کہیں قریب ہی رہتی تھی، اس لیے اس سے مزید قریب آنے کے خاصے امکانات تھے یا کم از کم اسے روز دیکھا تو جا ہی سکتا تھا۔

لیکن پھر سوچ کا رُخ بدل جاتا تھا اور وہ دل ہی دل میں محسوس کرتا تھا کہ جو بھی ہو، اس لڑکی کی ہر چیز الگ الگ خواہ کتنی ہی عام ہو، لیکن یہ پوری کی پوری مجموعی طور سے، اپنے پورے وجود کے ساتھ، عام چیز نہیں۔ ہر گز نہیں۔ اُسے یاد آتا تھا کہ اُس کی بہنیں جن کا بستی بھر کی لڑکیوں سے بہناپا تھا اسے کوئی خاص خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ اسے یاد آتا تھا کہ بستی کے لڑکے بستی کی جن لڑکیوں پر جان دیتے تھے اُن میں بھی اُس کا نام شامل نہ تھا۔ اور تو اور اس کا نام تو کبھی والدہ نے بھی نہ لیا تھا جن کے بارے میں اُس کی بہنوں کو شکایت تھی کہ اُن کی نظر میں تو ہر لڑکی ہی خوبصورت ہے، اس لیے ان کی بہو بن سکتی ہے لیکن اس سب کچھ کے باوجود اس کے اندر ایک خیال یہ بھی پنپ رہا تھا کہ اور سب میدانوں کی طرح محبت کی سرزمین میں بھی عیاں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرنا

چاہیے ۔ انسان اکثر عیاں، واضح اور سامنے کی چیزوں کو نہاں، مبہم اور دُور کی چیزوں کی خاطر نظر انداز کر دیتا ہے ۔ حالانکہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ یہی سامنے کی چیزیں ہمارے لیے معنی رکھتی ہیں اور ہمارے وجود کی تکمیل کی لازمی کڑی ہوتی ہیں ۔ ہم نے اکثر دیکھا تھا کہ لوگ گھر کے سکھ کو سمجھنے میں فخر محسوس کرتے، ماں باپ سے دُور دُور رہتے، اپنے بہن بھائیوں سے بات نہیں کرتے لیکن جب گھر سے والدین اور بھائی بہنوں سے ناطہ ٹوٹ جاتا ہے تو سب کے لیے روتے ہیں جب پڑھ سکتے ہیں تو پڑھتے نہیں اور بعد میں پچھتا پچھتا کر رہ جاتے ہیں ۔ اپنے گھروں میں جو بچے جوان ہو جاتے ہیں انھیں دال برابر سمجھتے ہیں اور باہر کی دال کو مرغی سمجھ کر گھر میں لا بٹھاتے ہیں اور بعد میں ہاتھ ملتے ہیں کہ اوہو پہلے خیال ہی نہیں آیا ۔

"اگر میں یہ سمجھوں کہ میری جمیلہ خاص طور سے آسمان سے نازل ہوگی اس کی چھب دُنیا بھر سے نیاری ہوگی، وہ مجھے نظر آئے گی تو میرا دل بیٹھ بیٹھ جائے گا، میرے وجود کی عمارت لرز اٹھے گی، میں فنا ہو کر پھر سے اس کی مسیحائی کی بدولت جی اٹھوں گا تو یہ میری خام خیالی ہے ۔ شاید یہی میری محبت کا ٹھکانا ہے اور میں نے یہ کیسے سمجھ لیا ہے کہ جو کچھ یہ اب مجھے نظر آ رہی ہے یہ صرف یہی کچھ ہے ۔ اسے پہلے تو یہ مجھے اتنی بھی نظر نہ آتی تھی مجھے اپنی آنکھوں کو، کانوں کو، اپنے قلب کو موقع دینا چاہیے کہ وہ اسے پوری طرح محسوس کریں ۔ شاید ابھی تک میرے قلب اور کانوں پر مہر لگی ہو اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہو ۔"

محبّت کی دریافت

لڑکیاں شادی کے ذکر پر شرمایا کرتی ہیں اُسے شادی کے نام سے چڑ تھی۔ جب کبھی اس کی کوئی سہیلی یا واقف کار ازدواج کے رشتے میں منسلک ہوتی یا ہورہی ہوتی وہ گویا اُس کی نظروں سے گرسی جاتی۔ اُسے کچھ گھن سی آتی تھی اس خیال سے کہ اچھی بھلی لڑکی اپنے کردار اور اپنی انفرادیت پر شادی کا پچارا پھیر لیتی ہے۔ چلو آج سے سو پچاس سال پہلے تو ماں باپ پکڑ دھکڑ کے اُسے دُلھامیاں کے پلّے سے باندھ دیا کرتے تھے لیکن اب اس ہمارے آپ کے زمانے میں تو حالات خاصے بدل گئے تھے۔ اب جو وہ آئے دن کسی مانوس سے نرم سے نام کے پیچھے کسی غیر مانوس، کرخت سے نام کا جھاڑو بندھا پاتی تو اندر ہی اندر بل سا کھا جاتی۔

یُوں کبھی کبھار اُسے باقاعدہ یہ احساس بھی ہوتا کہ وہ جو دُنیا بھر سے انوکھی ڈگر پر سوچتی ہے تو اس میں ضرور خود اُس کی اپنی ذہنی ناپختگی کا ہاتھ ہے۔ لوگ کوئی ابھی ابھی تو شادی کے قائل نہیں ہوئے، یہ ادارہ اَن گنت سالوں سے چلا آرہا ہے۔ وہ سوچتی شاید اس کی وجہ میرے خاص حالات ہوں۔ لیکن جب وہ اپنے حالات پر نظر کرتی تو اسے اپنے گھر میں یا کسی عزیز کے یہاں ایسی صورتِ حال بھی نظر نہ آتی کہ عورت کو کٹھ پتلی یا گڑیا سمجھا جاتا ہو۔ بلکہ اُلٹا اس کی اپنی ماں کا تو گھر پر اتنا اختیار تھا

کہ باپ بیچارہ اس معاملے میں بیوی کی گرد کو بھی نہ پہنچ پاتا تھا۔ رہی بھابی تو بھائیوں کے بارے میں نندوں کی رائے تو طے ہی ہے کہ اُنھوں نے اُن کے بھائیوں کو زن مرید بنا کر رکھ دیا ہے۔

شادی کے بارے میں اُس کا طرزِ عمل اب اتنا مشہور ہو چلا تھا کہ اُس کے بارے میں ماں باپ نے فکر ترک کر دی تھی۔ البتہ اُس سے چھوٹی بہن نے دل ہی دل میں ڈرنا شروع کر دیا تھا کہ کہیں یہ 'سدا کنوارا دی' میرے ہی راستے کی دیوار نہ بن جائے۔ لیکن اس کے باوجود جُوں جُوں اس کے جسم میں تبدیلیاں ہوتی گئیں اور جُوں جُوں وہ بیس سے آگے بڑھتی جا رہی تھی اُسے اپنے دل کے کسی نہ کسی چور گوشے میں بڑے منتشر، عجب کھٹ میٹھے اور کچھ کچھ بے حجاب خیالات کے وجود کا احساس ہونے لگا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ دن آگئے کہ رات کو سونے سے پہلے وہ خود ہی ایک انجمن سی برپا کر لیتی اور کبھی مبہم کبھی واضح طور سے ایک مردانہ سایہ اُس کے وجود سے لپٹ جاتا اور اُسے اپنے دل و دماغ بلکہ جسم اپنی رُوح کے سناؤ میں کمی سی محسوس ہونے لگتی۔ اُسے محسوس ہوتا کہ اُس کے وجود کی اندھیری وادیوں میں اجالا سا ہو گیا ہے اور کتنے ہی جانے اَن جانے گوشے گونجتے اور سوئے سوئے خلا بھر گئے ہیں۔ وہ کبھی یہ تعین نہ کر سکی کہ اس سایے کے خط و خال کیا ہیں، رنگ روپ کیا ہے، قد، چال، آواز، خوشبو کیا ہے ـــ وہ اس کے لیے سایہ ہی رہا۔ کبھی کبھی وہ دن کو بھی اسے پاس بُلانے کی آرزو کرتی لیکن شاید دن کی روشنی اور لوگوں کی آنکھیں سائے کو قریب نہ آنے دیتیں۔ اُسے محسوس ہوتا کہ وہ سایہ کہ ہے جس پر اپنے کام دیو کی شکل دیکھنا حرام ہے۔

اکثر اُس نے گھر میں، سڑک پر، کالج میں، مجمعوں میں، جلسوں اور تقریبوں میں چور نگاہوں سے یہ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی کہ شاید وہ سایہ کسی بھلے مانس

کا روپ دھارے یہیں کہیں موجود ہو لیکن ہر مرتبہ اُسے ناکامی ہوتی سارہ گرد کتنے ہی لڑکے بلکہ بزعم خود مرد دکھائی دیتے رہتے تھے۔ اپنے ہی خاندان میں چار پانچ نوجوان تھے جو بقول شخصے ہر لحاظ سے "اچھے" تھے ـــ ہاں اور کیا چاہیے ہوتا ہے، اچھی صحت، اچھے نقوش، اچھی تعلیم، اچھے عزائم۔ پھر یونیورسٹی تھی کہ لڑکوں سے اٹی پڑی تھی۔ ایک سے ایک نیازمند اور بے نیاز نوجوان یہاں دندناتا پھرتا تھا۔ پروفیسر تھے، بھائیوں کے دوست تھے، دُور کے رشتہ دار اور ہمسایے تھے۔ مگر اُسے کسی میں بھی تو وہ نظر نہ آیا۔

کوئی دوسرا نہ بھی جتاتا تو اُسے خود ہی اس بات کی خبر ہو جاتی کہ اب دو تین سالوں سے اُس کی بڑی بڑی آنکھیں بے خالی خالی دکھائی دینے لگی تھیں۔ ان میں بے خوابی کے بجائے بے چینی، اضطراب بلکہ ایک جستجو، ایک لگن سی بھری ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اُسے اچھی طرح علم تھا کہ اُس کی آنکھوں سے وحشت ٹپکتی ہے جیسے کچھ کھو گیا ہو اور برسوں سے مل ہی نہ رہا ہو۔

مرد اُسے نظر تو آتے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی اُس کے پورے وجود کو مخاطب نہ کرتا تھا۔ یوں اب اُس نے اگرچہ پیار اور شادی کے خلاف وہ پہلی سی شدت ترک کر دی تھی مگر لوگوں کو اب بھی یاد تھا کہ وہ مرد بیزار ہے کیونکہ اب بھی جب اُس کے ارد گرد اس کی بہنیں یا سہیلیاں خوبصورت اور منچلے مردوں کو دیکھ کر اچھل اچھل پڑتیں اور اُن کے مُنہ سے بے اختیار داد نکل جاتی تو وہ حیران سی، چپ سی رہ جاتی کہ نہ جانے ان ادھ کچے، اُدھورے، خام نوجوانوں میں ان لڑکیوں کو کیا نظر آگیا ہے۔

اس کی سرد مہری دیکھ کر لڑکیاں یہی کہہ کر رہ جاتی تھیں کہ دیکھیں اس کے لیے کون افلاطون آئے گا۔ پھر اچانک ایک دن ایک دیکھا بھالا آدمی ایک دیکھی بھالی سڑک پر وہ بن کر طلوع ہو گیا۔ پھر اچانک اس پر حقیقت کھلی کہ وہ جو اتنا لمبا عرصہ مردبیزار رہی ہے تو شاید اس کا وجود اسی وقت کا منتظر تھا کہ وہ آجائے۔

اب جو اُسے وہ دکھائی دیتے اور آہستہ آہستہ محسوس ہونے لگا تو اُس نے اُسے اُس سایے سے ملا کر دیکھنا چاہا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ اس سایے کا مادّی وجود اس ڈھنگ کا ہو گا۔ اور یہ تو اُسے کبھی وہم بھی نہ تھا کہ وہ عینک لگاتا ہو گا اور اس کی آواز ایسی خواہ مخواہ کانوں میں گھسنے والی ہو گی اور بھی بہت سی باتیں تھیں۔ لیکن جتنا وہ تفصیل میں جاتی اور اسے اُس سایے سے مختلف پاتی اُتنا ہی اسے احساس ہوتا کہ ہے یہ وُہی۔

مزے کی بات یہ تھی کہ جُوں جُوں دن گزر رہے تھے اُسے یہ بھی خیال ہو رہا تھا کہ سایہ اپنی ہیئت بدل رہا ہے، وہ اور سایہ ایک جیسے بن رہے ہیں۔

محبّت کا اقرار

"اور میں نے یہ کیسے سمجھ لیا ہے کہ جو کچھ یہ اب مجھے نظر آ رہی ہے یہ صرف یہی کچھ ہے۔ اب سے پہلے تو یہ مجھے اتنی بھی نظر نہ آتی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں کو، کانوں کو، اور اپنے قلب کو موقع دینا چاہیے کہ وہ اُسے پوری طرح محسوس کریں شاید ابھی تک میرے قلب اور کانوں پر مُہر لگی ہو اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہو۔"

آخر اس کے قلب اور کانوں کی مُہر ٹوٹنے لگی اور اُس کی آنکھوں کا پردہ چاک ہونے لگا۔ ہر نئی صبح، ہر نیا سورج، پتّوں کی ہر تازہ لہلہاہٹ اُس کی آنکھوں میں شادابی کا اضافہ کرتی چلی جاتی۔ اُسے محسوس ہوتا کہ اب وہ پہلے کی نسبت بہتر طور پر دیکھ سکتا ہے۔

تازہ ہوا کی ہر سرسراہٹ، متوالے پرندوں کی ہر چہچہاہٹ، بہتے اور گرتے اور برستے ہوئے پانی کا ہر گیت اُس کے کانوں میں نغمگی کا اضافہ کرتا چلا جاتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ اب وہ پہلے کی نسبت بہتر طور پر سُن سکتا ہے۔

چھوٹے بڑے بچّوں کی طرف ننھّے سے اُٹھی ہوئی کسی ماں کی نگاہ، یہاں وہاں شفقت یا ہمدردی کا کوئی چھوٹا بڑا واقعہ، پاس داری، خیالِ خاطرِ احباب کا کوئی تذکرہ اس کے دل میں درد کا اضافہ کرتا چلا جاتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ اب وہ پہلے کی نسبت بہتر طور پر محسوس کر سکتا ہے۔

جوں جوں اُسے اپنے اس پھیلاؤ کی خبر ہوتی گئی اُسے یہ علم بھی ہوتا گیا کہ اِس کا سراپا پہلے سا نہیں رہا۔ اِس کی آواز پہلی سی نہیں رہی، اِس کی قربت، اِس کے وجود سے دل میں جو احساس جاگتا ہے وہ پہلے سا نہیں رہا۔ یہ سب کچھ بدل گیا تھا۔ یہ بدل سی گئی تھی۔ اب اِس کی سادہ سی شکل و صورت میں نئے نئے رنگ جھلکنے لگے تھے، روپ کی نرم و نازک کرنوں نے اِس کے گرد مستقل طور پر ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ اِس کی وہی آنکھیں جو خالی خالی، متلاشی متلاشی، وحشی وحشی دکھائی دیا کرتی تھیں اب ان میں اطمینان، اعتماد اور استقلال موجزن تھا جیسے اُس کی طرح اِسے بھی منزل کی نوید مل گئی ہو، بشارت ہو گئی ہو کہ حقیقت منتظر، دُور نہیں۔

اِس کی ننھی سی ناک جو غائب سی، ہزیمت خوردہ سی، پشیمان سی دکھائی دیا کرتی تھی اب بڑی پُرعزم، باوقار اور بلوان نکلتی آ رہی تھی جیسے ساری دُنیا کا سامنا کر سکتی ہو، جیسے اس کی طرف سے ساری دنیا کو للکار رہی ہو کہ میں تو وہی کروں گی جو میرے دل میں ہے۔

اس کا وہ پھیکا پھیکا، پھیلا پھیلا، پیلا پیلا چہرہ جس میں اکثر ٹکا ہوں کیلئے کوئی جاذبیت نہ تھی اب کندنی کندنی، پونی، پونی، دید نی دید نی ہو گیا تھا کہ زردی کی جگہ چاندنی کھنڈ گئی تھی۔ پھیکے پن کی جگہ حدّت نے لے لی تھی جو وجود کے اندر سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھی اور پھیلاؤ نے طاقت کا روپ دھار لیا تھا۔ اس کے پھیلے پھیلے چہرے سے پہلے تو چوڑے چوڑے چہرے کا روپ دھارا، پھر اس چوڑے چہرے میں اشرف ہونے کا احساس نمودار ہوا۔ اب

اس کا بڑا سا، روشن سا، جیتا جیتا چہرہ اِدھر سے اُدھر گھومتا تو اُسے محسوس ہوتا کہ سطوت، جلال اور نجابت اس چہرے کی وساطت سے دُنیا والوں پر نظر کر رہے ہیں۔

اِس کی چال کہ تیرنے کا سماں نہ پیدا کرتی تھی اب یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ زمین کی چال سے ہم آہنگ تھی۔ زمین پر اس کے قدم یُوں پڑتے تھے جیسے زمین اور ران میں باتیں ہو رہی ہیں ___ ایسی باتیں جو دو ہم سفر مسافت کا احساس بھلانے کے لیے، دُوریوں کو پاٹنے کے لیے ایک دُوسرے سے بغیر کسی غرض کے کیا کرتے ہیں۔

کیا یہ بدل گئی ہے یا میں ہی بدل گیا ہوں ؟

اُس نے ہر طرف نگاہیں دوڑائیں، اپنے اندر جھانکا، اِسے دیکھا ___ اُسے یہی احساس ہوا کہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ سب کچھ زیادہ حقیقی اور ساتھ ہی زیادہ معنی خیز نظر آنے لگا ہے۔ مگر اُس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیونکر ہو گیا۔ کیا اُس کی آنکھیں، کان اور قلب اس لیے زندگی میں زیادہ حسن اور معنی نہیں پا رہے کہ حسن اور معنی کا سر چشمہ اُسے اپنے قریب ہی نظر آ گیا تھا یا کیا زندگی اور اس کے مظاہر میں حسن اور معنی نظر آنے ہی سے اِس کا حسن اور معنویت بھی اُجاگر نہیں ہوئے تھے ؟ وجہ کونسی تھی اور نتیجہ کونسا۔ یا پھر کیا یہ دونوں صُورتیں باہم پیوستہ اور ہم رشتہ تھیں؟ ایک دُوسری کی وجہ بھی تھیں اور نتیجہ بھی ؟ جہاں اس کی سیدھی سادی حقیقت میں حسن اور معنی کا ایک جہان آباد محسوس ہونے لگا تھا وہاں روزمرّہ زندگی کی حقیقت بھی خوش رنگ، خوش رس اور خوش مزہ محسوس ہونے لگی تھی۔

"شاید یہی وہ لمحہ ہے جسے دوام مل جائے تو جینا سپھل محسوس ہونے لگے۔ شاید یہی وہ لمحہ ہے جسے دوام بخشنے کی کوشش زندگی کا حاصل ہے۔ یہی تو وہ لمحہ ہے کہ وجود اندر اور باہر دونوں سمتوں میں بڑھتا ہے اور دونوں دُنیاؤں میں ایک اٹوٹ رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔

"مگر اس لمحے کو میں اکیلا تو دوام بخشنے سے رہا — یہ اگر ساتھ دے تو شاید۔

"شاید نہیں — ضرور — تو میں پھر اس سے کہہ ہی دوں کہ تُو اور میں ایک ہی ہیں — آ، ساتھ ساتھ چلیں۔"

محبّت کی اِنتہا

جب محبّت اُس کے جسم، دل و دماغ، اس کی رُوح پر محیط ہو گئی، اس ہمہ گیر قوّت نے سب کچھ اپنے دامن میں سمیٹ لیا تو اسے کتنے ہی دن گھنی سی چڑھتی رہی۔ سرور، لطف، انبساط کی موجیں محبّت کے اتھاہ اور بے کنار پانیوں کی سطح پر مچلتی رہیں، پانیوں کا سینہ قرار سا پا گیا لیکن پھر بھی اُسے محسوس ہوتا تھا کہ یہ کیفیت ضرور کسی بہت بڑی ہلچل کی حامل ہے، اس کے پردے میں اس پر نیند سی طاری ہے — نیند جس کا انجام بیداری، سرگرمی، شرکت ہے۔

اندر ہی اندر اُسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ان دنوں کسی ایسے بستر پر دراز ہے جس سے اُٹھنے پر اس کا وجود اپنی پہلی ہیئت، پہلی ترکیب، پہلی معنویت کھو کر، ایک نئی ہیئت، نئی ترکیب، نئی معنویت سے سرشار ہو جائے گا اور اُسے نئی انوکھی راہوں پر گامزن کر دے گا۔

پھر ایک دن اُس نے محبّت کے اُفق پر اپنے وجود کو سرسراتے، پھیلتے محسوس کیا۔ اس کا وجود محبّت میں شرابور تھا لیکن محبّت اس کا دامن نہ کھینچ رہی تھی۔ اُس کا وجود محبّت سے متعلق بھی تھا اور اس سے آزاد بھی۔ محبّت ایک ایسی طاقت بن گئی تھی جس سے آزادی کی افزائش ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنے وجود کو اُبھرنے، اُوپر اُٹھنے، محیط ہو جانے کی آرزو سے دغدغاتا پایا۔ اُس نے دیکھا کہ محبّت

اسے اپنا اسیر بنانے کے بجائے زندگی، زندگی کے تمام مظاہر سے ہم کنار، ہم آہنگ، ہر رشتہ کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔

وُہ حسن جو کبھی اُسے ایک وجُود میں محسوس ہوا تھا اور اُس نے اُس وجُود کی کم روئیوں کے باوجود اس میں حُسن کو ڈھونڈ لیا تھا، اپنی محبت کی آگ سے اسے جلا دی تھی اب وہ اسے اس وجُود سے باہر، اس وجُود کے علاوہ بھی نظر آرہا تھا۔ اب ارد گرد بسنے والے کئی دیکھے بھالے لوگوں میں خامیوں، کمیوں، کمزوریوں کے باوجود حُسن کی موجُودگی اُسے محسوس ہونے لگی تھی۔

پھر اُس نے محبت کے سفر کی نئی نئی منزلیں مارنی شروع کیں۔ اب محبت کی نظر جسمون تک ہی محدود نہ رہی تھی، اُس کا دائرہ عمل خیالات تک پھیل گیا تھا حُسن اب دل و دماغ کے مناظر میں ڈھل رہا تھا حُسن اب فن کی صُورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ صداقت اور خیر اب حُسن کے ہمراہی بن گئے تھے۔ محبت کی نظر اب حُسن کے ساتھ ساتھ صداقت اور خیر کی تلاش بھی کرنے لگی تھی۔ محبت اب ایک وجُود کی پابند نہ رہی تھی۔ وہ وجود جس نے محبت کو جنم بخشا تھا ایسا مرکز بن گیا تھا جس سے محبت خوشبو کی طرح پھوٹ پھوٹ کر سارے میں پھیل رہی تھی، سارے پر محیط ہو رہی تھی۔ جُوں جُوں یہ خوشبو پھیلتی جا رہی تھی اُس کے اندر آزادی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ محسوس ہو رہا تھا کہ خود خوشبو کا مرکز، محبت کا خالق وہ وجود بھی تکمیل اور تشکیل پا رہا ہے۔ پہلے تو انسانوں سے دوستی کی منزل آئی۔ پھر خیالات سے، پھر فن سے دوستی کا آغاز ہو گیا۔ دوستی کا یہ دائرہ پھیلتا چلا جا رہا تھا، بے انتہا ہوتا چلا جا رہا تھا۔

جُوں جُوں اس کا وجُود پھیلتا اور اُوپر اُٹھتا جا رہا تھا اسے دوسرے انسانوں کا بھی اسی طرح خیال رہنے لگا تھا جیسے اپنا۔ زندگی کے رُخوں اور رجحانوں پر اس کی نگاہ رہنے لگی تھی۔ اب اُس کا ایمان ہوتا جا رہا تھا کہ دُنیا بھر کے سیدھے سادے اور اُلٹے پلٹے مسائل اسی صورت میں حل ہو سکتے ہیں کہ میری طرح جماعتیں بلکہ قومیں بھی محبت ہی کی نظر سے ایک دوسرے کو دیکھیں، دوسروں کی خامیوں، کمیوں، کمزوریوں کے باوجود ان میں حُسن، خیر، صداقت کی تلاش کر سکیں، ان جوہروں کو اپنی محبت سے جلا بخشیں۔

اب کہ اُس نے محبت کی پہنچ میں زندگی کے تمام شعبوں کو دیکھا تو اُسے یہ ضرورت بھی محسُوس ہوئی کہ حُسنِ مطلق، صداقتِ مطلق، خیرِ مطلق کی بھی خبر لے۔ وہ کون ہے جو کاملاً حسین ہے — جو اس جہان میں پھیلے ہُوئے حُسن کا جامع بھی ہے اور اس سے ماوراء، اپنی ذات میں حُسن کامل بھی ہے۔ وہ کون ہے جو اس جہان میں بکھری ہُوئی صداقت کا حامل بھی ہے اور اپنی ذات میں کامل صداقت بھی ہے — جس کی کوئی ادا، کوئی حرکت باطل سے آلودہ نہیں۔ وہ کون ہے جو اس عالم میں خیر کی ہر رمق، ہر جھلک سے نمایاں بھی ہے اور اپنی ذات میں خیرِ کامل بھی ہے — جو شر سے آزاد ہے۔

یہ تو میں نہیں جانتا کہ خُدا تک پہنچنے کی منزل کب آئی، آئی بھی یا نہیں، البتہ اتنا ضرور ہے کہ محبت نے اب اُسے اس راہ پر ڈال دیا تھا جس کی انتہا بے انتہا تھی اور بے انتہا خُدا ہی تو ہے۔

دھوپ کا سائبان

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ط (الانفال: ۴۲)

لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ٥ (التوبة: ۴۳)

دُوسرا حِصّہ

قائدِ اعظم اور دَورِ حاضر

قائدِ اعظم محمد علی جناح کی زندگی — ذاتی، معاشرتی، سیاسی، تمام سطحوں پر ایک ایسے انسان کی زندگی ہے جو قانون کو اپنے لیے اصل اُصول سمجھتا اور برتتا ہو اور اس ضمن میں پیش آنے والی تمام مشکلات کا سامنا مردانہ وار کرنے کے لیے تیار ہو، وہ سب قیمتیں دینے کے لیے تیار ہو جو قانون کی اطاعت کرنے والوں کو دینی پڑتی ہیں۔

میری نظر میں یہی وہ نکتہ ہے جو قائدِ اعظم محمد علی جناح کی رحلت کے بعد اہلِ پاکستان ہی نہیں اہلِ دُنیا کے لیے بھی ان کی زندگی کی معنویت کو پائندہ رکھے گا۔ قائدِ اعظم نے جس بے رُخ سیاسی فضا میں اپنی قیادت کا علَم بلند کیا اور جس طرح مسلمانانِ ہند کی ڈگمگاتی کشتی کو پاکستان کے ساحلِ مُراد سے ہم کنار کیا اُس کی داد کے لیے اقبال کی یہ پیش گوئی ہی کافی ہے:

"آپ ہی ہندوستان کے واحد مسلمان ہیں جس سے قوم بجا طور پر صحیح رہنمائی کی توقع رکھ سکتی ہے۔" (اقبال کا خط، جناح کے نام - ۲۱ر جون ۱۹۳۷ء)

گاندھی جی کے عدمِ تشدد کو آئین پسندی کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ ان کی ستیہ گرہیں اور کانگرس کے انقلابی اقدامات ہی ہندوستانی سیاست کا مرکز و محور رہے ہیں اور یہی کچھ کانگرس، ہندوؤں، قوم پرست مسلمانوں کا سرمایۂ امتیاز و افتخار

رہا ہے۔ اس غیر آئینی سیاسی فضا میں قائدِ اعظم کی آئین پسندی اور بھی نمایاں ہے کہ اس بظاہر نحیف و نزار انسان کو خدائے بزرگ نے کیسا تابناک دل و دماغ عطا فرمایا تھا اور یہ بظاہر "صاحب بہادر" قسم کا انسان اندر سے کتنا بڑا صاحبِ ایمان تھا، اسے قانون — خدا کے قانون، کی کتنی پرواتھی؛ وہ انسانی خون کی حُرمت کا کس شدّت سے قائل تھا — اُس نے اُس وقت بھی اُن مسلمان جماعتوں کی آؤ بھگت نہ کی جن کا دامن انسانی خون سے داغدار تھا جب لوگ جوق در جوق اس کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے تھے اور اسے اس بات کی بے حد ضرورت تھی کہ اس کے مطالبات کو پوری مُسلم قوم کی آواز تسلیم کر لیا جائے۔

قائدِ اعظم کی آئین پسندی کی عام مثال ان کی سیاسی زندگی کو سمجھا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں یہ ایک ایسی بنیادی غلطی ہے جس کا مزہ ہم نے قیامِ پاکستان کے بعد کے دس بارہ سالوں کی ابتری کے روپ میں چکھا ہے۔ قائدِ اعظم محض سیاسی زندگی ہی میں آئین پسند نہ تھے؛ آئین پسندی ان کی معاشرتی بلکہ ذاتی زندگی کے ہر شعبے میں بھی روحِ رواں کا درجہ رکھتی تھی۔ یہی وہ فرق ہے جس نے قائدِ اعظم کو بامُراد اور ہمارے دوسرے سیاست دانوں کو ہر میدان میں خائب و خاسر کیا۔ ہمارے سیاست دان یہ تو مانتے رہے کہ سیاست میں خاص طور سے جب واسطہ دوسری قوموں سے ہو، آئین پسندی ہی پاکستان کا موقف رہے گی لیکن اُنھوں نے آئین پسندی کو ایک دائرۂ حیات میں تو قبول کر لیا لیکن دوسرے میدانوں میں اسے طلاق دے دی۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ

اِلٰی اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ (البقرۃ: ۸۵)
(کیا تم کتاب کے ایک حصّے پر تو ایمان رکھتے ہو اور ایک حصّے سے انکار کرتے ہو۔ پس تم میں سے جو کوئی یُوں کرے گا اس کے لیے دنیوی زندگی میں رُسوائی ہے اور یومِ قیامت کو اسے شدید تر عذاب کی جانب پھیر دیا جائے گا)۔

قانون کی ایک جگہ اطاعت اور دوسری جگہ نافرمانی کا جو مظاہرہ ہم نے اپنی زندگی کے ان پچھلے چند سالوں میں دیکھا ہے ہماری رسوائی کیا اسی کا ثمر نہیں؟

ہمارے یہاں مارشل لاء صرف ساڑھے تین سال رہا ہے لیکن اس عرصے میں پاکستان کی جو ساکھ دُنیا میں قائم ہوئی وہ اس سے پچھلے بارہ سال میں نہ ہوئی تھی۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم نے اپنی خارجہ پالیسی بدل لی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسا تو نہ ہوا تھا۔ اس کی محض ایک وجہ تھی کہ وہ آئین پسندی جو ہم پہلے صرف دوسروں کو پیش کرتے تھے اب اسے خود اپنے ملک میں بھی نافذ کرنے کا پروگرام تھا — اس مختصر سے عرصے میں ہمارے یہاں بیسیوں ملکی اصلاحات عمل میں آئیں لیکن مجموعی طور سے وہ غلط بخشیاں، کنبہ پروریاں، نفس کشیاں غائب تھیں جو پہلی حکومتوں کا خاصہ بن چکی تھیں۔ زرعی اصلاحات سے متاثر ہونے والوں نے بھی چوں نہ کی کیونکہ انھیں احساس تھا کہ اُن کا پیٹ کاٹ کر اہلِ حکومت نے اپنے گھر نہیں بھرے ۔ ۱۹۵۸ء کے اواخر کی بات ہے، بیرونی ممالک میں پاکستان کی پبلسٹی کی مہم تیز کرنے کی فرمائش پر مارشل لاء کے ایک ترجمان نے

ایک نہایت اہم بات کہی تھی کہ ملک میں قانون کی عملداری ہو، ملک ترقی کرتا ہو، افراط کا شکار نہ ہو تو بیرونی ممالک میں جتنی پبلسٹی خود بخود ہو جاتی ہے اتنی کسی خطیر سے خطیر رقم صرف کرنے پر بھی نہیں ہوسکتی اور اس سے بڑی کیا نیک نامی ہے کہ اب کئی ممالک میں پاکستان کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے انقلاب آ رہے ہیں — کشت و خون بہا کر یا بہانے کے لیے نہیں بلکہ ایسا نظامِ حکومت اپنانے کے لیے جو امن و ترقی کا ضامن ہو۔ اس طرح ان چند سالوں میں ہم نے قائدِ اعظم کو جو معنوی خراج پیش کیا وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اگر ہم ارادہ باندھ لیں تو کوئی عجب نہیں کہ ان آفاق پر ہماری دسترس ہو جائے جن کے پیشِ نظر قائدِ اعظم نے پاکستان کے لیے جدوجہد کی تھی اور مسلمانانِ ہند کے لیے ایک ملک حاصل کیا تھا۔ مگر اس خراج کی نوعیت وہ نہیں جو قائدِ اعظم کے مقبرے کی تعمیر کی ہے کہ ایک مرتبہ مقبرہ بن گیا سو بن گیا۔ یہ تو ایک زندہ خراج ہے جس کی بقا و نشو و نما کے لیے ہمیں قائدِ اعظم ہی کی طرح اپنی ساری زندگی — ذاتی، معاشرتی، سیاسی، قومی، ملی زندگی کو ایک مستقل عملِ صالح میں ڈھالنا ہوگا۔

قائدِ اعظم اتنی بڑی شخصیت اور مقام کے مالک ہیں کہ وہ محض اہلِ پاکستان ہی نہیں، اہلِ اسلام اور اہلِ دنیا کے لیے بھی دورِ حاضر میں زندگی بسر کرنے کی روشن مثال ہیں۔ آج ساری دنیا اس نقطے پر پہنچ چکی ہے کہ قوموں کے باہمی مسائل قوت یا غیر قانونی انداز سے حل نہیں ہونے چاہئیں۔ اقوامِ متحدہ کا وجود اسی حقیقت پر دال ہے لیکن قائدِ اعظم کی زندگی اس اصول کی عملی تفسیر ہے۔ دیکھا جائے تو دورِ حاضر میں امن کے سچے پیغامبر وہی ہیں، جھوٹے دعویدار بے شک بے شمار

ہوں۔ اُنھوں نے آزادی جیسی جنگ بھی قانون کی حدود میں رہتے ہوئے لڑی۔ حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج دُنیا کے کئی مقام آزادی کے نام پر خون آشام ہیں۔

سیاسی آزادی کا مروجہ تصور خالصتاً مغربی ہے لیکن اہلِ مشرق اپنی مغرب دشمنی کے باوصف ہر اُس بات کو ایک قدر کا درجہ دے چکے ہیں جو مغرب والوں کے نزدیک قدر رہی ہے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ انھی اقدار نے مغرب کو مشرق پر مسلط ہونے میں مدد دی تھی۔ ابھی تک ہمارے ہاں مغربی طرزِ جمہوریت کو سیاست کے میدان میں حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے۔ یہی حال صنعتوں کا ہے "ویسی بھی قیمت پر صنعت"۔ آج کئی ایشیائی و افریقی قوموں کا نعرہ یہی ہے۔ چنانچہ جہاں سے بھی مشینیں ملیں اور جس ڈھنگ سے ملیں لی جا رہی ہیں۔ یہی حال آزادی کا ہے۔ آزادی، خواہ اس کے لیے انسانی خون کی اتنی بے حرمتی کرنی پڑے کہ مسلمان خود بے گناہ مسلمانوں کا خون بہانے سے دریغ نہ کریں۔ الجزائر میں مُسلمان مجاہد اپنے ساتھ تعاون نہ کرنے والے دیہات کو ملیا میٹ کر دیتے رہے؛ اگر اُنھیں یہ شک گزرتا کہ یہ گاؤں دُشمن کے قبضے میں آجائے گا تو حربی اعتبار سے ہمیں نقصان ہو سکتا ہے۔ یا اُنھیں گاؤں والوں سے اپنی حمایت کا پورا یقین نہ ہوتا تو پھر وہ گاؤں کے گاؤں کو بلا جھجک نذرِ آتش کر دیتے تھے۔ کیا سیاسی آزادی خُدا کے اٹل ارشادات —— ایک بے گناہ کے قتل سے مُراد ساری انسانیت کا قتل ہے اور جس کسی نے عمداً کسی مومن کو قتل کر دیا اس کی جزا دائمی جہنم ہے؛ اس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہے اور اس کے لیے عذابِ عظیم کو بھڑکایا گیا ہے

—— سے زیادہ محترم ہے۔ جب مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل کی جانب مبعوث ہوئے تو اُن کی قوم غلام تھی۔ اس پر اہل روم غالب تھے۔ لیکن مسیح کے ذمتے اس کے خداوند نے سیاسی آزادی کا کام ہرگز نہ لگایا، نہ اُنھوں نے اپنی قوم کو اس کام کی ترغیب ہی دی۔ بغاوت اور فتنہ پردازی کے بجائے خدا نے ہجرت کا حصول اسی لیے تو وضع کیا ہے۔

فتنہ وفساد کی ذیل میں حضرت موسیٰ و ہارُون کی زندگی کی ایک جھلک قرآن حکیم نے دکھائی ہے۔ حضرت موسیٰ چند دنوں کے لیے اپنی قوم سے جدا ہو کر اللہ تعالیٰ سے احکامات لینے جاتے ہیں اور ان کی عدم موجودگی میں ان کی قوم سامری کے بنائے ہُوئے بچھڑے کو پُوجنے لگتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام غضب ناک ہو کر ہارُون علیہ السلام سے کہتے ہیں:

يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۝ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۝ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّىْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ۝ (طٰهٰ : ۹۴)

اے ہارون! جب تم نے یہ دیکھا کہ یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں تو تھیں میرے پاس چلے آنے سے آخر کس بات نے روکا، یہ تو میری بات نہ ماننے کے مترادف ہے۔ ہارون نے کہا، اے میرے بھائی! تم مجھ پر یُوں نہ برسو۔ یقیناً مجھے تو یہ ڈر تھا کہ پھر تم کہتے کہ میں نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈالا اور تمھاری بات نہ مانی۔

آج آزادی کے نام پر جو خُون پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے اور جس بے قانونی

کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا گیا ہے کیا قائدِ اعظم اور ان کا طرزِ عمل اس سب کچھ کے مقابلے میں سلامتی کا درجہ نہیں رکھتے — اور کیا آج انسانیت کو سلامتی عزیز نہیں۔

مسیح علیہ السلام کے یومِ ولادت پر ہمارے یہاں پیدا ہونے والا محمد علی جناح ہمارے لیے، مسلمانوں کے لیے تو اہمیت و مرتبہ رکھتا ہی ہے، وہ مسیح کے ماننے والوں کے لیے بھی ایک پیغام ہے کہ دورِ حاضر میں بھی سلامتی روی سے جیا جا سکتا ہے۔

ہماری اُدھوری آزادی

کشمیر کا مسئلہ

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہم نے ایک برطانوی مقبوضے کی سطح سے اُبھر کر ایک خود مختار مملکت کی حیثیت سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا تھا ہم آزاد ہوگئے تھے مگر کچھ لوگوں کی نظر میں یہ آزادی اُدھوری تھی۔ آزادی کے اس اُدھورے پن کی وجہ مختلف لوگوں کے یہاں مختلف تھی۔ ایک خیال یہ تھا کہ دولتِ مشترکہ کے رشتے سے ہم ابھی تک سلطنتِ برطانیہ کے دامن سے بندھے ہیں۔ ایک خیال یہ تھا کہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم سے آزادی کی صورت مسخ ہوگئی ہے۔ یہ تو ابتدائی تاثرات تھے۔ بعد میں ایک تاثر کا اور اضافہ ہوگیا کہ برطانیہ کے بجائے اب ہم امریکہ کی بندگی کرتے ہیں اور اسی سے مدد چاہتے ہیں۔ میرے نزدیک بھی ہماری آزادی اُدھوری ہے لیکن اس احساس کے پیچھے دو اور ہی وجہیں کارفرما ہیں (۱) جو کچھ ہمیں ملا ہم اُسے بھی ایک آزاد معاشرے میں نہ ڈھال سکے —— ہمارے یہاں سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی سطح پر وہی تہ بہ تہ ظلمتیں اٹری گھمڈی رہیں جو بے مہار و بے منزل معاشروں کی تقدیر ہیں۔ ہم نے بہت جاؤ سے اپنے جسم وجان اور دل و دماغ کی سیرابی وشادابی کے لیے غذا ڈھونڈی لیکن اس غذا کو گلنے سڑنے کے لیے چھوڑ کر خود پاؤں پسار کر سو رہے۔ اس اجمال کی

تفصیل طولانی ہے، اس پر فی الحال اس لیے بات نہیں چلا رہا کہ دوسری وجہ پر بات نہ رہ جائے۔ (۲) دُوسری وجہ یہ ہے کہ جس اُصول پر ہمیں وطن عزیز پاکستان ملا ہے اس کے مطابق برِعظیم ہند کا ایک خطّہ ابھی تک ہمیں نہیں ملا — ہاں میں کشمیر ہی کا ذکر کر رہا ہوں کہ اسی ٹھنڈی میٹھی وادی نے کروڑوں انسانوں کے دلوں میں گرمی تلخی پیدا کر رکھی ہے اور اسی جگمگاتی سرزمین نے ہماری آزادی کے سُورج کو گہنا رکھا ہے۔

برِعظیم ہند کی بھارت اور پاکستان کی صورت میں تقسیم اس اُصول کے تحت ہُوئی تھی کہ وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے پاکستان میں شامل ہوں گے۔ اسی اُصول کے تحت بنگال اور پنجاب کو بانٹا گیا تھا۔ جہاں تک ریاستوں کا تعلق ہے یہ طے ہُوا تھا کہ وہ دونوں مُلکوں میں سے جس کے ساتھ مناسب سمجھیں شامل ہو جائیں۔ برِعظیم کی سینکڑوں ریاستوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ تقسیمِ ہند کے بنیادی اُصول کے تحت ہی اپنا الحاق کریں۔ چنانچہ آبادی کی اکثریت کا خیال رکھتے ہوئے مسلم اکثریت کی حامل ریاستیں پاکستان سے ملحق ہوگئیں اور غیر مسلم اکثریت کی حامل ریاستیں بھارت کا حصّہ بن گئیں۔ اتفاق یا سیاسی جغرافیے کا کرشمہ دیکھیے کہ مسلم اکثریت کی حامل ریاستیں پاکستان کے اندر یا سرحدوں سے جڑی ہُوئی تھیں اور یہی حال غیر مسلم ریاستوں کا تھا کہ بھارت انھیں گھیرے ہوئے تھا۔ بھارت نے حیدر آباد دکن پر زبردستی قبضہ کر لیا حالانکہ اس کا مسلمان سربراہ خود مختار رہنا چاہتا تھا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ ریاست کی بیشتر آبادی غیر مسلم تھی اور وہ بھارت سے الحاق چاہتی تھی لیکن کشمیر کے معاملے

میں یہ وسیل اُلٹ دی گئی۔ یہاں غیر مُسلم حکمران بھارت سے الحاق چاہتا تھا حالانکہ ریاست کی بیشتر آبادی مُسلم تھی اور وہ پاکستان سے الحاق چاہتی تھی۔ کشمیر جو فطری، انسابیاتی، تاریخی، تہذیبی اور اقتصادی طور پر پاکستان کا حصّہ تھا اب تک پاکستان سے کٹا چلا آرہا ہے۔ جس اُصول پر پاکستان کی ساخت ہُوئی ہے کشمیر کی موجودہ صورتِ حال اُس اُصول کی سراسر نفی ہے ــــــ دوسرے معنی میں ہمارے لیے تقسیمِ ہند کا آخری فیصلہ ابھی تک کھٹائی میں پڑا ہے۔ دوسرے معنی میں ہماری آزادی ابھی تک اُدھوری ہے، ہمیں کچھ علاقہ تو مِل گیا ہے کچھ باقی ہے۔ دوسرے معنی میں پاکستان ابھی پُورا نہیں بنا۔ دوسرے معنی میں تحریکِ پاکستان کو ختم سمجھنا غلط ہے۔ یہ تحریک اُس وقت تک بے ثمر سمجھی جانی چاہیے جب تک کشمیر کو حقِ خود اختیاری نہیں ملتا۔

لیکن کشمیر کا معاملہ ہماری آزادی کے اُصول ہی کی خلاف ورزی نہیں، بھارت نے کشمیر پر قبضہ کرکے تقسیمِ ہند کے اُصول ہی سے روگردانی نہیں کی؛ اس نے ان عظیم انسانی اُصولوں پر بھی لات ماری ہے جو انسانوں نے صدیوں کے معاشرتی اور تہذیبی تجربے سے کشید کیے تھے۔ دلیل کے بجائے ڈنڈے سے راج کرنا پنڈت جواہر لال نہرو جیسے عوام پرست پر واقعی بہت پھبتا تھا، حالانکہ یہی پنڈت جی تھے جنھوں نے کشمیر میں اپنی فوجیں اُتارنے کے بعد اعلان کیا تھا کہ "کشمیر کے الحاق کا فیصلہ طاقت نہیں بلکہ عوام کی مرضی سے ہوگا۔" میں یہ بات بھی واضح کردینا چاہتا ہوں کہ اس تمام عرصے میں ہماری یہی پالیسی رہی ہے کہ جہاں کہیں کسی ریاست کا بھارت یا پاکستان سے الحاق کے متعلق تنازعہ

ہے وہاں اس بات کا فیصلہ کرنے کا حق اس ریاست کے عوام کو پہنچتا ہے۔" (۲- نومبر ۱۹۴۷ء)

بھارت نے اب اہلِ کشمیر سے یہ حق کیوں چھین لیا ہے ؟ دنیا بھر کے فلسفیوں، سیاست دانوں اور ماہرینِ قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنا آج بھی کتنا آسان ہے ۔ انسانیت کے ضمیر کا خون کرنا آج بھی کتنا آسان ہے !

مقبوضہ کشمیر کی وہ اسمبلی جس نے بھارت کے دعوے کے مطابق کشمیر کی نمائندہ جماعت کی حیثیت سے کشمیر کو بھارت کی جھولی میں ڈال دیا ہے اسی کے بارے میں ۱۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو سر بی۔ این۔ راؤ نے سیکورٹی کونسل میں بھارتی وفد کے قائد کے اعتبار سے کہا تھا " اگر کشمیر کی قانون ساز اسمبلی کشمیر کے الحاق کے مسئلے پر کوئی رائے دینا چاہتی ہے تو اسے طبعی طور سے کوئی روک تو نہیں سکتا لیکن یہ رائے نہ تو میری حکومت پر کوئی فرض عائد کرتی ہے اور نہ سیکورٹی کونسل کی کارروائی پر اثر انداز ہو سکتی ہے ۔" اسی قانون ساز اسمبلی کے بارے میں ۱۹۵۶ء میں بھارتی پارلیمنٹ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے خود پنڈت نہرو نے کہا تھا کہ " الحاق کے بارے میں اس کا فیصلہ غیر قانونی ہے اور اس سے کشمیر کے بارے میں بین الاقوامی تنازعہ حل نہیں ہوتا " (شیخ عبداللہ کا بیان ـــــ ۱۷ فروری ۱۹۵۸ء) بھارت کا کہنا ہے کہ اب حالات بدل گئے ہیں اور یہ حالات کشمیر یا بھارت میں نہیں بدلے بلکہ پاکستان میں بدلے ہیں کیونکہ اُس نے کئی دفاعی معاہدے کر لیے ہیں۔ گویا اب کشمیر کی امانت میں خیانت جائز ہو گئی ہے ـــــ اُسی طرح جس طرح کوئی امانت اس وقت تک تو ہمارے پاس محفوظ رہے

جب تک بھی اس کی ضرورت نہ پڑے اور جب یہ ہمارے لیے قیمتی ہو تو ہم اسے اپنی جاگیر سمجھ کر ہڑپ کر جائیں۔

پھر کشمیر کی موجودہ صورتِ حال ہماری آزادی کے اُصول کی خلاف ورزی کے ساتھ ساتھ عظیم انسانی اُصولوں کی بے حرمتی ہی نہیں بلکہ دُنیا کے ایک معتبر ادارے، اقوامِ متحدہ کے وقار کے لیے بھی ایک زبردست للکار ہے۔ بھارت جو اقوامِ متحدہ کا رُکن ہے اور امن امن کی مالا جپتے اس کی زبان نہیں تھکتی وہ اگر خود اپنے عہد سے پھر جائے تو یہ صرف بھارت ہی کے ماتھے پر کالک کا ٹیکا نہیں ساتھ ہی ساتھ اقوامِ متحدہ کی نمائندہ حیثیت کے لیے بھی کاری ضرب ہے ـــــ ایشیا اور افریقہ ہی نہیں یورپ اور جنوبی نصف کرۂ ارض کے ممالک بھی آخر اقوامِ متحدہ کی فعالیت سے کیا اُمید رکھ سکتے ہیں ؟ پھر بھارت اقوامِ متحدہ میں مسئلہ کشمیر کے پیشِ نظر جس طرح اپنا مسلک بدلتا رہتا ہے، جس طرح وہ ہر مسئلے پر صرف اس اعتبار سے اپنا پینترا چنتا ہے کہ کشمیر کے مسئلے میں اس کے طرزِ استدلال پر زد نہ پڑے خواہ باقی معاملات میں اس کے طرزِ عمل میں کوئی وحدت رہے یا نہ رہے اس سے بھارت کی سیاسی دیانتداری ہی کا پول نہیں کھُلتا، اقوامِ متحدہ کی بھی "سیاسی اکھاڑے" کے سوا کوئی شکل نہیں بنتی۔

۲

تو آخر ہم کشمیر کے لیے کیا کر سکتے ہیں ؟

ہم کشمیر کے لیے جنگ کر سکتے ہیں : (ا) آئینی جنگ (ب) فوجی جنگ۔

جہاں تک آئینی جنگ کا تعلق ہے ہر طرح کی جنگ کی طرح بلکہ زندگی کے ہر شعبے

کی طرح ہمارا ایمان ہم سے اس ضمن میں بھی ایک ہی بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم حدود اللہ سے تجاوز نہ کریں اور یہ بات کبھی پسِ پُشت نہ ڈالیں کہ صداقت ہی بالآخر فتح یاب ہوتی ہے۔ جُونا گڑھ کی ریاست کی بیشتر آبادی غیر مُسلم تھی لیکن اس کے مسلمان سربراہ نے ریاست کا الحاق پاکستان سے کر دیا اور پاکستان نے کشمیر کے بارے میں بھارتی مؤقف کو باطل ثابت کرنے کے لیے اس زرّیں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس الحاق کو قبول کر لیا۔ بھارت نے اس بنار پر کہ جونا گڑھ بھارت میں محصور ہے اور اُس کی بیشتر آبادی غیر مُسلم ہے اور بھارت سے الحاق چاہتی ہے اس پر قبضہ کر لیا۔ بظاہر بھارت کی دریدہ دہنی کی اتنی تنگی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ دو بالکل متخالف معاملوں، کشمیر اور جونا گڑھ کو، ایک ہی اندھی لاٹھی سے ہانکنے پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے لیکن کیا جونا گڑھ کے الحاق کو قبول کر کے پاکستان نے ریاستوں کے حکمرانوں کو الحاق کا مختار تسلیم نہیں کر لیا؟ پھر اگر ایک غیر مُسلم حکمران اپنی ریاست کا الحاق بھارت سے کرتا ہے تو ہم اسے کس مُنہ سے غلط کار کہیں گے۔ اگر بھارت جونا گڑھ پر قبضہ نہ کرتا تو یقیناً کشمیر کے بارے میں ہمارے مُوقف کو بہت ٹھیس پہنچتی۔ ہمیں اگر کشمیر میں آئینی تدابیر ہی سے کام لینا ہے تو ہمارے طرزِ عمل میں صادقانہ وحدت ہونی چاہیے تا کہ "دیر ہے اندھیر نہیں" کے مصداق کبھی دُنیا سچی بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو ہی جائے تو ہمارا کردار انعام ہی کا مستحق ٹھہرے غضب کا نہیں۔

مجھے یہ تسلیم ہے کہ فوجی جنگ کی نسبت آئین پسندی ہی مستقبل میں قوموں کے فیصلے کر سکتی ہے اور مجھے فخر ہے کہ مُسلمانانِ ہند نے محمد علی جناح جیسے بڑے

آئین پسند کو ہضم دیا اور بالآخر اس کی قیادت پر اعتبار کیا۔ لیکن میں یہ سوچتا ہوں کہ وجس چڑیا کا نام جہاد ہوا کرتا تھا وہ بالکل بے جان و بے معنی ہو گئی ہے؟ ـــــ آئین پسندی تو آئین پسندوں ہی کے درمیان معنی رکھتی ہے۔ لاتوں کے بھوت اس دنیا سے ہجرت تو نہیں کر گئے، وہ اب بھی باتوں یا دلیلوں سے قائل ہونے میں اپنی تذلیل جانتے ہیں۔ جب اصولوں ہی پر اتفاق نہ ہو، جہاں نقض عہد کر کے پیشانی پر پسینے کے بجائے اُلٹی تیوریاں پڑتی ہوں وہاں آئین پسندی کیا خاک چلے گی۔ کشمیر کے سلسلے میں ہم برسوں سے جہاد کے مقدس لفظ سے کھیلتے رہے ہیں بلکہ شاید آئندہ بھی یہ کھیل جاری رہے۔ اس جہاد کا عملی موقع آیا بھی اور چلا بھی گیا لیکن کیا جہاد اسی ذوق و شوق کا مستحق ہوتا ہے جس کا ہم نے مظاہرہ کیا ـــــ سارا غصہ لے دے کر مودودی صاحب پر نکال دیا گیا کہ دیکھیے صاحب وہ کشمیر کی لڑائی کو جہاد نہیں مانتے۔ اگر یہ واقعی جہاد تھا تو پھر کیا یہ حکومت پاکستان پر اس لیے حرام تھا کہ اس نے بھارتی حکومت سے عہد کر رکھا ہے کہ ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں گے اور یہ اہل پاکستان پر اس لیے حلال تھا کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کو پہنچنا اپنا دینی فرض سمجھتے تھے۔ اگر ہم پچھلے بارہ سو سال سے محمد بن قاسم کا نام اس لیے احترام سے لیتے رہے ہیں کہ اس کم سن مجاہد نے لنکا کے چند مسلمانوں یا چند عرب تاجروں کے اغوا کی بنا پر راجہ داہر کی سلطنت ختم کر کے ملتان تک ایک زبردست اسلامی مملکت کا پھریرا لہرا دیا تو کیا کشمیر کے چالیس لاکھ مسلمانوں کی فریاد ہمارے سینوں میں کوئی طوفان برپا نہیں کرتی کہ ہم ایک مسلمان ملک اور قوم کی حیثیت

سے خُدا کے حکم کے مطابق (النساء : ۷۵) اپنے قریبی ترین بھائیوں کے لیے اپنی تلوار کو بے نیام کریں۔ شاید ہم ایسا کرتے لیکن ہم اس لیے باز رہے کہ بھارت ہمارے اس اقدام کو اپنے علاقے پر حملہ تصوّر کرتے ہوئے ہماری تمام سرحدوں پر مورچے گاڑ دیتا ، شاید اسی خوف یا اسی حقیقت نے ہمارے دفاعی معاہدوں کو ختم کر دیا ، شاید ہمارے اسی حفاظتی اقدام سے جز بز ہو کر بھارت نے حالات کی تبدیلی کی آڑ میں اپنے تمام وعدوں سے ہاتھ کھینچ لیا اور وہ کشمیر پر دھرنا مار کر بیٹھ گیا۔ تو اب کیا ہو سکتا ہے ؟ کیا اب جنگ نہیں ہو سکتی یا کیا جہاد صرف اسی وقت کیا جاتا ہے جب خدا کا کوئی فرشتہ یہ اشتہار لے کر نازل ہو جائے کہ فتح ضرور ہماری ہو گی (التوبۃ : ۴۱) لوگوں کا خوف اسی طرح خدا کے خوف سے غافل کیا کرتا ہے (النساء : ۷۷)

کیا یہ جہاد کا موقع نہ تھا کہ کشمیر کے متنازع فیہ علاقے پر قابض بھارت اس علاقے کی حفاظت کا نا اہل ثابت ہو رہا تھا اور چین کشمیر کے ایک جزو "نیفا" لداخ کے ہزاروں مربع میل رقبے پر قبضہ کر رہا تھا۔ اقوام متحدہ ہی نہیں دُنیا کے تقریباً تمام ملک انفرادی طور سے بھی کشمیر کو ایک غیر طے شدہ مسئلہ سمجھتے ہیں۔ اگر ہم کشمیر کی حفاظت کے لیے اُٹھتے تو ہمیں اس کا پُورا حق حاصل تھا۔ بجا ہے کہ اس طرح اور بہت سے مسائل کھٹائی میں پڑ جاتے ، مثلاً پانی کا مسئلہ طے نہ ہوتا۔ یقیناً اس میں بڑی فراست ہے کہ ہم نے بھارت سے کشمیر کے سوا دوسرے تقریباً سبھی معاملات طے کر لیے ہیں اور اب ہم زیادہ آسانی سے کشمیر کے مسئلے پر توجہ دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ یہ معاملہ جتنے دن طے

نہیں ہوتا بھارت کا فائدہ ہے نفسیاتی طور سے وقت کے ساتھ ساتھ زخم بھرنے لگتے ہیں۔ دو آدمی آپس میں اُلجھتے ہیں۔ ایک کو چوٹ آ جاتی ہے۔ وہ اس وقت تو کسی مصلحت سے خاموش ہو رہتا ہے اور کچھ دن بعد جب دیکھنے سننے والے اس واقعے کو بھول بھلا جاتے ہیں تو وہ انصاف کا طالب ہوتا ہے مگر شاید اس وقت وہ شہادت کے طور سے اپنا زخم بھی نہ دکھا سکے کیونکہ اس وقت تک وہ محض ایک خراش رہ جائے گا، ہر کوئی اس وقت یہی کہے گا کہ بھئی کیوں گڑے مُردے اُکھاڑتے ہو، مٹی ڈالو اس معاملے پر۔ کشمیر جو کل تک ساری دُنیا کے لیے ایک زندہ مسئلہ تھا اس کے وجود سے آج بھارت کو منکر ہونے کی جُرأت اسی لیے ہو رہی ہے کہ اسے اتنے بہت سال ہونے کو آئے ہیں اور ادھر ہمیں بھی اپنی خارجہ سیاست کا رُخ اس طرف کرنے کی ضرورت پیش آ رہی ہے کہ ہم اپنے حواری ملکوں تک کی زبان سے یہ کہلوانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہاں ہاں کشمیر کا مسئلہ تو ابھی باقی ہے۔

جب پاکستان نے الجزائر کی عارضی قومی حکومت کو تسلیم کیا تو بھارت میں اس سے یہ تاثر لیا گیا کہ عنقریب پاکستان بھی آزاد کشمیر کی آڑ لے کر پورے کشمیر کے لیے اسی طرح کی عارضی حکومت قائم کر دے گا اور یوں کشمیر میں ایک مرتبہ پھر جنگ شروع ہو جائے گی۔ بہر حال اگر ہم جنگ کا فیصلہ کرتے ہی ہیں اور اس جنگ کو جہاد کا نام دیتے ہیں تو ہمیں اپنے ذہنوں اور دلوں میں اپنی تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی گنجائش پیدا کرنی ہو گی۔ یہ نہیں کہ ہم نیم دلی کا شکار ہو جائیں۔ ہمیں اپنے ذہنوں اور دلوں کو صاف کر کے ہی اس آگ میں کودنا چاہئے

باہم جہاد کریں گے یا نہیں کریں گے لیکن یہ نہیں کہ جہاد کا نام تو لے رہے ہوں اور سامنے آنے سے بھی دامن چُراتے ہوں۔ اس سلسلے میں ایک بات ضرور واضح رہنی چاہیے کہ جب دو معاہد ملکوں میں سے ایک اپنے وعدوں سے پھر جاتا ہے تو دوسرے پر معاہدات کی پابندی لازم نہیں آتی۔ (الانفال : ۵۸)

۳

کشمیر کے مسئلے کا ایک حل اور تجویز کیا جاتا ہے اور یہ ہے تقسیم۔ بھارت کہتا ہے کہ جو حصّہ جس کے پاس ہے اُس کے پاس رہے اور معاملے کو ختم سمجھا جائے۔ باہر کے کچھ علماء و زعماء بھی تقسیم ہی کو اس بیماری کا علاج بتانے لگے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ کشمیر کی تقسیم ہماری آزادی کے اصُول کے سراسر اُلٹ ہے۔ برِعظیم کی سینکڑوں چھوٹی بڑی ریاستوں میں الحاق کے سلسلے میں ہرگز کوئی تقسیم عمل میں نہیں آئی۔ یہ بجا ہے کہ برطانوی ہند کے صُوبوں بنگال اور پنجاب میں تحصیل کو اکائی مان کر مذہبی اکثریت کی بنا پر تقسیم ہُوئی لیکن ہر بڑی سے بڑی ریاست کو بھی دستورِ آزادی کے مطابق ہمیشہ ایک اکائی ہی سمجھا گیا۔ ریاست جموّں و کشمیر ایک اکائی ہے اور اسی مکمل صورت میں اس کی قسمت کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا — خواہ پاکستان کی کسی حکومت کو بھی یہ تقسیم گوارا ہو — تو ہماری آزادی کے اُصول کی بے حُرمتی ہوگی، ہماری آزادی اَدھوری رہے گی۔

جہاں تک بیرونی دُنیا کا تعلق ہے کشمیر کی تقسیم اس غیر منطقی یا کج دلیل پر منحصر ہے کہ درمیانی راستہ ہمیشہ صحیح راستہ ہوتا ہے۔ بے شک اکثر ایسا ہی ہوتا ہو

لیکن یہ کوئی مستقیم دلیل نہیں۔ فرض کیجیے دو آدمی آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے نہیں، دو اور دو تو چھ ہوتے ہیں۔ ایک اجنبی پاس سے گزرتا ہے اور وہ دونوں کو سمجھاتا ہے کہ لڑنے بھڑنے میں کیا رکھا ہے، درمیانی راستہ اختیار کرو یعنی یہ تسلیم کر لو کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ فیصلہ سراسر لغو ہے۔ اسی لغویت کا شکار وہ حضرات ہیں جو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ بھارت بھی کہتا ہے: کشمیر میرا ہے، پاکستان بھی کہتا ہے: کشمیر میرا ہے، بہتر یہی ہے کہ کشمیر کو بانٹ دیا جائے، کچھ حصّہ بھارت لے لے کچھ حصّہ پاکستان لے لے۔

بھارت نے ایک چال اور چلی ہے کہ اپنے ساتھ ملحق علاقے، جموّں، کو مسلمانوں سے بالکل خالی کر دیا ہے۔ اگر تقسیم کی تجویز آگے بڑھے تو بھارت یہ کہہ سکتا ہے کہ کم از کم جموّں کا علاقہ تو اسے ضرور ملنا چاہیے کہ اس میں غیر مسلم بستے ہیں۔ اسی ضمن میں ہمیں مسئلہ کشمیر کے اس پہلو کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے کہ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر میں آبادی کے تناسب کو بدلنے کی کوشش ضرور کی جائے گی۔ بھارت یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ پاکستان کی سرحد پر مسلمان اکثریت کا کوئی رقبہ ہو۔ مسلمان تو مسلمان باقی تمام ملکی مطالبوں کے برعکس سکھوں کو پنجابی صوبہ بنانے کی محض اس لیے اجازت نہیں مل رہی کہ شاید اس طرح ایک غیر ہندو اکثریت کا صوبہ جس کی سرحدیں پاکستان سے ملتی ہوں کسی شورش یا سازش کا باعث ہو۔ پھر بھارت کشمیر کی مسلم اکثریت کو ہندو اکثریت میں بدلنے کی کوشش کیوں نہ کرے گا۔

۴

بھارت کی پوری کوشش ہے کہ اہلِ کشمیر، اہلِ پاکستان اور اہلِ دنیا آہستہ آہستہ اس کی دھاندلی کو بھول جائیں اور وقت زخمیوں کو اتنی تسکین دے دے کہ وہ اپنا درد بھی محسوس نہ کریں۔ ادھر ہماری کوشش ہے کہ ہم کشمیر کو نہ تو خود بھولیں نہ اہلِ دنیا کو بھولنے دیں۔ لیکن کیا جس سطح پر ہم یہ کوشش کر رہے ہیں اس سے وقت کے مرہم کی کاٹ ہو سکتی ہے؟ کیا کشمیر کا مسئلہ ہمارے دلوں کو طویل مدتوں کے لیے گرمائے رکھے گا، ہمارے اس زخم کی چبھن کو تازہ کیسے رکھے گا۔ شاید نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مادی اور معاشی ضرورتیں انسان کے لیے ہنگامی طور سے تو اہم ہوتی ہیں لیکن جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ان کی معنویت بدلتی اور گھٹتی چلی جاتی ہے۔ آج اگر ہم کشمیر پر اپنا حق جتاتے ہوئے صرف کشمیر سے حاصل ہونے والے مادی یا معاشی فوائد کو پیشِ نظر رکھیں تو ہو سکتا ہے کل حالات اس ڈھب سے بدل جائیں کہ ان خاص فوائد کی ہمیں ضرورت ہی نہ رہے یا یہ فوائد ہمیں بآسانی دوسرے ذرائع سے حاصل ہونے لگیں۔ آج ہم پانی پانی پکار رہے ہیں، ہو سکتا ہے آئندہ سو پچاس سال یا دو سو چار سو سال میں ہم ایک خالص صنعتی معاشرہ بن جائیں اور ہمارے لیے پانی کی وہ ضرورت نہ رہے جو اب ہے، یا ہم ایسے آسان متبادلات ڈھونڈ لیں کہ دریاؤں پر ہماری زراعت کا انحصار کم ہو جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بھارت ہمیں پانی کے سلسلے میں کبھی تکلیف نہ دے اور کشمیر سے ہو کر آنے والے ہمارے دریا اتنے ہی تواتر سے بہتے رہیں جیسے اب بہتے ہیں —— اُس وقت ہم کیا کریں گے، کیا اُس وقت ہم کوئی نئی پکار تلاش کریں گے، کوئی نیا نعرہ

گھڑیں گے۔

اگر ہمیں اپنی آزادی عزیز ہے، اگر ہمیں اپنی سالمیت عزیز ہے، اگر ہمیں اپنے بھائیوں کی آرزو عزیز ہے، اگر ہمیں اسلام کی شیرازہ بندی عزیز ہے تو پھر ہمیں کشمیر کا مطالبہ کسی ایسی ہمہ گیر اور گہری سطح پر اُٹھانا چاہیے کہ اس مطالبے کی تکمیل میں صدیاں کی دیواریں بھی حائل ہو جائیں تو ہمارے پاؤں مضبوطی سے اپنے مؤقف پر جمے رہیں ہمارے دلوں کی گرمی وقت کے ساتھ گھٹنے کے بجائے بڑھتی رہے، ہماری نئی نسلیں اسلاف سے بھی زیادہ اِس منزل کے حصول کے لیے کوشاں ہوتی رہیں۔

ہمیں یہودیوں کے مطالبۂ فلسطین سے لاکھ اختلاف ہو اور ان کے طور طریق ہمارے لیے کتنے ہی ناپسندیدہ ہوں لیکن ان کی اس عظیم تاریخی مہم کے استقلال سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ اس مٹھی بھر قوم نے بخت نصر کے عہد سے دورِ حاضر تک یروشلم میں واپس پہنچنے کی آرزو کو اپنے سینوں میں کس خوبی سے گرم رکھا ہے "کتنی عجیب حقیقت ہے کہ اس دربدر ٹھوکریں کھاتی پھرنے والی قوم نے ڈھائی تین ہزار سال سے ارضِ مقدس کی واپسی کو کبھی نہیں بھلایا۔ ہر عام جلسے میں، ہر صبح، ہر سہ پہر اور ہر شام کو، ہر انفرادی دعا میں خواہ یہ طعام کے بعد کی دعا ہو یا رات کو سوتے وقت کی دعا ہو اپنی اس مقدس آرزو کو کسی یہودی نے کبھی فروگزاشت نہیں کیا۔" (ہسٹن سمتھ: انسان کے مذاہب)

ہم نے ترکوں کی حمایت میں خلافت جیسی طوفانی مہم تو چلائی لیکن کشمیر کے لیے کسی طوفانی مہم سے کام شاید نہ چلے۔ ہمیں تو کسی ایسی مہم کی ضرورت ہے جس میں جوش و خروش کا عالم تو بے شک تحریکِ خلافت کا سا ہو لیکن جس میں استقامت

بھی ہو، دم بھی ہو، ایسی تحریک چلانے کے لیے محض پانی کا نعرہ کافی نہیں ہو سکتا، اس تحریک کی بُنیادیں دین اور ثقافت اور آزادی ہی کے ٹھوس ستونوں پر اُٹھائی جا سکتی ہیں۔

۵

اگر اہلِ پاکستان کے لیے ضروری ہے کہ وہ کشمیر کے سلسلے میں کسی ایسے پائیدار موقف کو اختیار کریں جس کی معنویت و اہمیت وقت کی گردشوں میں گُم نہ ہو جائے تو یہ بھی لازم ہے کہ اہلِ کشمیر بھی پاکستان سے آملنے کی آرزو میں کم نہ پڑیں۔ اس بات کا بوجھ بھی ہمارے ہی کندھوں پر ہے کہ اہلِ کشمیر ہماری رفاقت کو عزیز جانتے رہیں اور اس کی ایک ہی صورت ہے کہ اہلِ کشمیر کو یہ یقین ہو کہ ہم محض ان کی سرزمین سے گوناگوں مادی اور معاشی فوائد اُٹھانے کے متمنی نہیں، ہم تو ان سے مل جُل کر اپنی اور ان کی آزادی کی تکمیل چاہتے ہیں، اپنے دین اور اپنی ثقافت کی آبیاری چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم پر سب سے بڑا بوجھ یہی ہے کہ جس دین اور جس ثقافت کی بنیادوں پر ہم کشمیر کے لیے آواز اُٹھائیں ہمارے اپنے یہاں اس کی وہ شرمناک نفی نہ ہو رہی ہو جو آج ہونی شروع ہو چکی ہے اور اگر اسے بروقت شدت سے روکا نہ گیا تو یہ اور بھی اندھی اور بے مہار ہو جائے گی۔ اگر اہلِ پاکستان نام نہاد مسلمان رہ جائیں گے، اسلامی اقدار کا یہاں اسی بے دردی سے خون ہوگا، جس طرح ہو رہا اور ہونے والا ہے تو اہلِ کشمیر آخر ہم سے آملنے میں کیا میٹھا محسوس کریں گے، وہ کیوں نہ ہم سے کسی زیادہ طاقت ور مادی طاقت کے بازو کا

سہارا چاہیں گے۔ اگر ہمیں کشمیر عزیز ہے تو ہمیں پاکستان بھی عزیز ہونا چاہیے ورنہ ہمارا یہ صنم بھی ہمارے ساتھ ہی ڈوب جائے گا۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ (آل عمران ۱۳۹)

(ہمت نہ ہارو اور جی نہ چھوڑو، اگر تم صاحبِ ایمان ہو تو کامیابی تمہاری ہے۔)

ہماری تاریخ کے پریشان اوراق

"مجھے محبت نہ دو، دولت نہ دو، شہرت نہ دو، ان سب کی جگہ ایک صداقت دے دو۔" تھورو

۱

انسان میں یہ بہت منفرد صلاحیت ہے اور زندگی میں یہ بہت حیرت انگیز وسعت ہے کہ انسان جو عقیدے، نظریے، رویّے چاہے اپنالے زندگی سے اس کا دامن بندھا ہی رہتا ہے۔ وہ خُدا سے ہم آہنگ ہو یا خدا سے بیزار، زندگی اسے، موت کی سرحدوں تک، یہ اختیار دئیے ہی رکھتی ہے کہ جس راستے پر وہ چاہے چلتا رہے۔ یہی انسان کا شرف ہے اور یہی اس کی مُصیبت ہے۔ وہ چاہے تو صداقت کی بڑی سے بڑی نشانی کو جھٹلادے اور چاہے تو عیاں سے عیاں جھوٹ کو عینِ حقیقت مان کر عُمر بتا دے۔ مسلمانوں کو ایک عرصے سے یہ فخر رہا ہے کہ تاریخ دانی میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔ اگرچہ اس میدان پر غائر نظر ڈالنا یُوں بھی خاصا بصیرت افروز ثابت ہو سکتا ہے لیکن ہمارے لیے اس شعبۂ علم پر توجہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسی کے وسیلے سے کئی بڑے بڑے جھوٹ اب تک ہمارے یہاں جزوِ ایمان بنے ہوئے ہیں اور جب تک اس کی چھان پھٹک نہ ہو گی کئی بڑی بڑی صداقتیں ہمارے لیے کبھی روشنی نہ پا سکیں گی۔

تاریخ نویسی کی ابتدائی شکل قبائلی وقائع نگاری ہے جس میں انٹ سنٹ جو کسی سے سُنا وہ درج کردیا یا پھر قبیلے کی شان افزوزی کی خاطر حقائق پر خوشنما کا پردہ ڈال دیا۔ مُسلمان مورخ جس عہد میں پیدا ہوئے وہ مغرب والوں کے نزدیک قرونِ وسطیٰ عرف قرونِ جاہلیت کہلاتا ہے۔ اس لیے ان مورخوں کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ نمایاں ہے کہ جب اُنھوں نے شمعیں روشن کی تھیں تو ادوگرد تاریکی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ورنہ ایک ابن خلدون کو چھوڑ کر جس نے تاریخ نویسی کو ایک باقاعدہ علم بنانے پر غور کیا اور اپنے مقدمے کی صورت میں تاریخ کی تنقید لکھنے کی جرأت کی اور ایسا کون مسلمان مورخ ہے جس کا مرتبہ قبائلی وقائع نگاروں سے بلند ہوگا۔ وہی سُنی سنائی باتیں، رطب ویابس اور افراط و تفریط کے وسیع و رفیع کھنڈر۔ نہ تحقیق نہ تفتیش، آتے کو آنے دو کے مصداق الم غلّم کے دفتر۔ ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اندھوں میں کانا راجا۔ مغرب اندھا ہو چکا تھا اور مسلمان مورخوں کی آنکھیں نئے نئے جذبۂ خود اعتمادی نے کچھ کھول دی تھیں۔ ورنہ عیسائی مورخ اور وسی اس، لوسی بی اس وغیرہ کو، اسی قبیلے کا چٹا بٹا سمجھ کر، نظرانداز بھی کر دیا جائے تو قبل از مسیح یونان میں ہیرو دوٹس ہے جسے "ابوالتاریخ" مانا جاتا ہے وہ اپنے سفروں کے دوران باقاعدہ تفتیشی سوالوں کے ذریعے واقعات جمع کرتا تھا اور اس کی شہرت اس لیے بھی معنی رکھتی ہے کہ وہ ہر روایت پر آمنّا وصدقنا نہ کہتا تھا جس طرح ہمارے یہاں طبری اور واقدی وغیرہ کا مشرب ہے۔ وہ حتی الامکان جھوٹ کے انبار سے صداقت کو الگ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

پھر یونان ہی میں تھوکی دائڈس بھی ہے جس کے تازہ ترین مترجم ریکس وارنر کا کہنا ہے:
"آج تک ہیا سیات پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں تھوکی دائڈس کی کتاب
"پیلو پونیسی جنگ" وسیع معنی میں عظیم ترین درجہ رکھتی ہے، اس کا مضبوط اور
متجسس دماغ ایک لمحے کے لیے بھی جذباتیات یا روایتی انداز نظر کا شکار
نہیں ہوا۔" پھر جب یونان کا آفتاب سلطنت روما کا ایک چراغ بن کر رہ گیا
تو اس سرزمین نے پولائی بی اس کو جنم دیا۔ وہ واقعات کی صحت کا اتنا ہی اہتمام
کرتا تھا جتنا تھوکی دائڈس لیکن جہاں تک تاریخ کی حدود کے اندازے کا تعلق
ہے وہ اپنے پیش روسے کہیں آگے تھا۔ اسے تاریخی نشوونما کے تسلسل کا شعور
تھا، وہ یہ جانتا تھا کہ واقعات کا ایک دوسرے پر کیا اثر ہوتا ہے، دنیا میں بسنے
والی مختلف قومیں ایک دوسرے سے جو رشتہ رکھتی ہیں اس پر بھی اس کی گہری
نظر تھی۔ زینافون کو مورخ سے زیادہ ادیب کہہ کر اور بعد میں پلوتارک کو تاریخ نویس
سے زیادہ معلمِ اخلاق کہہ کر ٹال دیا جائے تب بھی یہ تین نام تو ایسے ضرور ہیں، جو
اسلام سے پہلے تاریخ کے میدان میں ایسے جھنڈے گاڑ چکے تھے جو آج تک
لہرا رہے ہیں۔ خود ابن خلدون سے مسلمانوں نے جو سلوک کیا ہے وہ کس سے
پوشیدہ ہے، صدیوں بعد جب مغرب نے اس کے مہتم بالشان کام کے
قصیدے پڑھنے شروع کیے تو ہم نے بھی چوم چاٹ کر اسے گلے لگا لیا۔ مسلمانوں
کو اگر تاریخ کی حدود اور مورخ کے مقاصد کا اندازہ ہوتا تو ہمارے یہاں
جو صورتِ حال ہے وہ نہ ہوتی۔ نئے دور کے چند مصریوں کو چھوڑ کر ہم تو اب بھی
تاریخی روایات کو اپنی باندی سمجھتے ہیں جس کے سپرد یہ فریضہ ہے کہ ہر وقت ہماری

مدح سرائی کیا کرے۔ ہم ایسے خوشامد پسند ہو گئے ہیں کہ کوئی ایک نقطہ ہمارے خلاف کہہ دے تو ہم آگ بگولہ ہو جاتے ہیں اور کوئی سراسر غیر اسلامی انداز نظر سے ہماری تعریف کر دے تو جھٹ اسے گوچنے کے لیے جھولی پھیلا دیتے ہیں کوئی ٹٹ پونجیا اٹھ کر مسلمانوں کی تعریف کر دے پھر خواہ دنیا میں اسے کوئی جانتا ہو یا نہ، مانتا ہو یا نہ، ہمارے یہاں اُسے "شہرۂ آفاق مورخ" کی حیثیت سے تا ابد جینے کا لائسنس حاصل ہو جاتا ہے، اس کی وہ کتاب جس کی ڈھائی سطریں ہماری مدح میں صرف ہوئی ہیں ہمارے یہاں سرکاری خرچ پر ترجمہ ہو کر شائع ہو جائے گی خواہ باہر اس کا پہلا اڈیشن بھی تیس سال میں نہ ختم ہوا ہو۔ "رابرٹ بریفالٹ" کی "تشکیل انسانیت" کا اقبال نے اپنے خطبات میں حوالہ کیا دے دیا گویا یہ کتاب ساتویں آسمان کا تارہ بن گئی حالانکہ اس بھلے آدمی کا اس کتاب کی وجہ سے باہر کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ اقبال کا ذکر آگیا تو یاد آیا ہے، اقبال نے اپنے خطبات میں آئین سٹائن اور وھائٹ ہیڈ کے نظریۂ اضافیت پر باقاعدہ محاکمہ دے رکھا ہے:

"وھائٹ ہیڈ کا نظریۂ اضافیت آئین سٹائن کے نظریۂ اضافیت کی نسبت مسلمانوں کے لیے کہیں زیادہ قابل قبول ہے"۔ (خطبۂ پنجم صـ۱۳۲)

یہ اعلان اس بات کا ثبوت ہے کہ اقبال آئن سٹائن کے نظریے سے بخوبی آشنا تھے لیکن رضی الدین صدیقی صاحب کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب "اضافیت" (مطبوعہ انجمن ترقی اردو) اقبال کی فرمائش پر لکھی تھی تاکہ اضافیت کے بارے میں علامہ کی (ناقص) معلومات میں اضافہ ہو جائے حالانکہ

خطبات کی اشاعت سے پانچ سال پہلے پروفیسر منہاج الدین (اسلامیہ کالج پشاور) کی کتاب "نظریۂ اضافیت" (۱۹۲۵ء) شائع ہو چکی تھی جو رضی الدین صدیقی صاحب کی کتاب سے تین گنا ضخیم اور کئی اعتبار سے جامع ہے۔ صدیقی صاحب کی کتاب اقبال کی وفات کے کہیں بعد شائع ہو سکی (افسوس اقبال اس سے استفادہ نہ کر سکے) کسی نے آج تک ان کے دعوئی کو للکارا نہیں اور ضرورت بھی کیا ہے اور یہی طرزِ عمل ہمارا تاریخ کے سلسلے میں ہے۔ اگر کوئی ہمیں گالیاں نہ دے تو سب ٹھیک ہے اور گالیاں دینے کے ایک لاکھ ایک ہزار ایک سو ایک جواز بھی ہیں تو بھی ہم اسے متعصب کہہ کر ایک طرف بٹھا دیں گے۔

اصل میں ہماری تاریخ میں اتنے پھیلے ہیں اور اس میں اتنا الجھاؤ، تضاد اور بھرتی ہے کہ یا تو آپ اسے بھڑوں کا چھتا سمجھ کر پاس نہ پھٹکیں اور اگر آپ میں پاس پھٹکنے کی ہمت ہو اور آپ کھوٹے کھرے کی جانچ پڑتال کی کچھ شُد بُد بھی رکھتے ہوں تو پھر اچانک آپ کو احساس ہو گا کہ مسلمانوں نے تاریخ کے جھوٹوں پر ایسی زبردست عمارتیں کھڑی کر رکھی ہیں کہ ایک اینٹ کھسکانے سے پوری قوم یا کوئی ایک فرقہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ شخص تو ہماری جڑیں کاٹنے کے درپے ہے۔ اس لیے عقلمندی یہی ہے کہ انسان کان لپیٹے پڑا رہے۔ پچھلے دنوں محمود احمد عباسی نے ایک کتاب "خلافتِ معاویہ و یزید" لکھی تھی۔ جواب تو کسی سے بن پڑا کہ نہیں، یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے ڈائنا میٹ رکھ کر مسلمانوں کے دماغ اُڑا دیے ہیں۔ اب محمود احمد عباسی کوئی ٹائن بی یا اسپنگلر بھی نہیں لیکن اتنی سی ذہانت بھی جب

تاریخ کے میدان کو ٹٹولتی ہے تو ہمارے پیروں تلے کی زمین کھسکنے لگتی ہے۔ کیوں؟ اسی لیے کہ ہم نے مورخ سے صداقت اور تنقید کا ہتھیار چھین کر اس کے منہ میں یا لتو کتے کی زبان ڈال رکھی ہے کہ ہماری مدح میں بھونکا کرے اور بس۔

چلئے مان لیا کہ مغرب اندھا تھا اور مسلمانوں سے اُس نے روشنی پائی لیکن اس میں کیا بڑائی ہے کہ مسلمانوں نے اپنی شمعیں اہل مغرب کے ہاتھ میں دے دیں اور خود اندھے کنگال ہو گئے۔ آج ہم بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ صاحب! مغرب تو اپنی موت آپ مر رہا ہے مگر معاف کیجئے جب کوئی معاشرہ کھٹائیوں سے دوچار ہوتا ہے تو صبح و شام اس کی تقدیریں بدلتی ہیں۔ اگر مغرب مر رہا ہے تو اس کا صرف یہی مطلب ہے کہ مغرب کا ایک رنگ مر رہا ہے، جس طرح کبھی اُس نے مسلمانوں سے روشنی پا کر حیات نو حاصل کی تھی، اب پھر وہ کہیں سے روشنی پا کر آگے بڑھ سکتا ہے، سوال تو یہ ہے کہ کیا مغرب میں جینے کی خواہش نہیں رہی۔ مغربی تہذیب کا ایک دور یقیناً ختم ہوتا محسوس ہوتا ہے لیکن مغرب ایک زندہ حقیقت ہے اور اگر اس میں زندگی کی رمق ہے تو یہ ایک نئی تہذیب کو جنم دے لے گا۔ سوال تو ہمارا ہے کہ ہم جینا ہی نہیں چاہتے کیونکہ ہم بدلنے کے نام کو گالی سمجھتے ہیں یا پھر ایسی مادر پدر آزاد تبدیلی کے قائل ہیں کہ جڑیں بھی اکھاڑ کر اجنبی ہواؤں کے سپرد کر رہے ہیں خواہ یہ ہوائیں ہمیں بھاڑ میں جھونک دیں۔ مغرب کی زندہ رہنے کی خواہش کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ وہاں تہذیب کے نقادوں کو جاسوسی کا پھندا پیش کرنے کے بجائے ان کی باتوں پر توجہ دی جاتی ہے، ان کی کتابیں

پڑھی جاتی ہیں، ان پر مقدمہ چلانے کے بجائے انھیں موقع دیا جاتا ہے کہ وہ لوگوں تک اپنی بات پہنچائیں ۔ ظاہر ہے مغرب میں اب بھی اتنی توانائی تو ہے کہ وہ اپنے بڑے سے بڑے ناقدوں کو سہار سکتا ہے ۔ ہمارے یہاں تو ایک درمیانے درجے کی ذہانت زلزلے برپا کر دیتی ہے، قتل وخون کا بازار گرم کر دیتی ہے ۔

یہ تمہید اس لیے باندھنی ضروری تھی کہ اپنی حالیہ تاریخ کے سلسلے میں بھی جب تک ہم صداقت کو اپنا شعار نہیں بنائیں گے اس وقت تک ہم مانگے تانگے کے یا روایتاً پائے ہوئے تصورات کے تحت جیتے رہیں گے جس طرح چند آدمی گزر جائیں تو مفید زمین پر راستہ سا بن جاتا ہے اور پھر صدیوں لوگ اسی راستے پر چلتے چلے جاتے ہیں اسی طرح جب چند لوگ ایک تصور پیش کرتے ہیں، تو پھر صدیوں لوگ اس ذہنی راستے پر آنکھیں بند کیے چلتے چلے جاتے ہیں ۔ زمانہ صرف سیدھی لکیر نہیں ۔ اس میں گیرائیاں اور پہنائیاں بھی گھٹتی بڑھتی ہیں ۔ ہر دور میں سفر کا ایک نیا خط کھینچنا پڑتا ہے جو ضروری نہیں کہ پہلے خط کی توسیع ہی ہو ۔ ہر دور کا اپنا اسم یا اپنی آیت ہوتی ہے جو اس کا راستہ متعین کرتی ہے بس ایک خدا کی رسی ہی ایسی چیز ہے کہ ہر دور میں ایک رہتی ہے اور اگر یہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو انسان کا وہی حشر ہوتا ہے جو طلسماتی کہانیوں اور اساطیر میں ان شہزادے شہزادیوں کا ہوتا ہے جو بھول بھلیاں میں ڈور کا سرا کھو کر خود بھی کھو جاتے ہیں ۔

یہ بجا ہے کہ معاشرہ خواہ 'صم' 'بکم' 'عمی' کی تصویر ہو تب بھی مورخ یا صاحب نظر یا جانے والے کا فریضہ یہی ہے کہ وہ محبت، دولت یا شہرت کے بجائے صداقت کو اپنا شعار بنائے اور جن باتوں کی اسے خبر ہے یا جنھیں وہ اپنی بصیرت اور سوجھ بوجھ

کی بنا پر صحیح مانتا ہے ان سے معاشرے کو آگاہ کرے کہ شاید کبھی چند لوگ اس آگاہی کے راستے پر بھی چل نکلیں اور کبھی یہی راستہ معاشرے کی شاہراہ بن جائے۔

۲

پچھلے دنوں ایک کتاب شائع ہوئی ہے — "اقبال کے آخری دو سال" مصنّف ہیں ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی۔ یہ کتاب ایک کتاب کے اعتبار سے کیا درجہ رکھتی ہے اور اس کتاب کے نام کا نفسِ مضمون سے کتنا تعلق ہے، یہ سوال نہ پوچھے جائیں تو کوئی خاص حرج واقع نہ ہوگا، بس اتنا کہنا کافی ہے کہ اس کا نام یہ ہونا چاہیے تھا: "پنجاب کی سیاسی تاریخ کے چند سال"۔ یا پھر اسے "تاریخِ مسلم لیگ کا ایک طویل مختصر باب" کہا جا سکتا تھا۔ بہرحال یہ ایک نہایت مطالعہ انگیز اور جوش آفریں کتاب ہے جس کی صرف ایک خُوبی ہے کہ اس میں صداقت کا نہ صرف دعویٰ ہے بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

ہمارے یہاں قائدِ اعظم محمد علی جناح، تحریکِ پاکستان کے پس منظر، اور اقبال کے بارے میں چند ایسے عام تصوّرات اس کتاب سے پاش پاش ہوتے ہیں جو ہمارے غیر متجسّس اور تقلید دشمن ذہنوں نے اِدھر اُدھر سے سمیٹ کر اپنے کھونٹے سے باندھ رکھے ہیں۔ یہ کتاب اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر ہم کچھ جانتے ہیں اور ہمارا حافظہ سلامت ہے اور ہمیں سچ بولنے کی عادت بالکل بھُول نہیں گئی (کیوں بعض اوقات سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہم کس دور میں سچ بولتے

تھے۔ قرآن میں تو رسولِ کریم کو اعرابیوں کا اعتبار کرنے سے بھی خبردار کیا گیا ہے) تو نہ صرف ہمارا ماضی ہم پر روشن ہو سکتا ہے، ہمارا مستقبل بھی اس چراغ کی لَو سے نسبتاً صاف دکھائی دے سکتا ہے۔

قائدِ اعظم کے بارے میں نہ جاننے والے یا غلط بتانے والے یہ تصور پیش کرتے ہیں کہ اُنھوں نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کھڑی کرنے کی فکر میں برِ عظیم کی سیاست کے رنگ میں بھنگ ملا دی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ ہی مسلمانوں کے رہنما بن بیٹھے اور محض اپنی ہٹ دھرمی سے فرقہ وارانہ فضا پیدا کر دی۔ اسی طرح دو قوموں کے نظریے کے بارے میں مسلمانوں کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے کہ ان کے تعصب نے ملک کی آزادی اور سالمیت کے آگے دیوار کھڑی کر دی اور پاکستان گویا متعصب مسلمانوں کی کرتوتوں کا ثمر تھا۔ اقبال کے بارے میں بھی پنڈت جواہر لال نہرو اور ایڈورڈ ٹامسن کی پھیلائی ہوئی افواہ ہے کہ وہ آخر عمر میں نظریۂ پاکستان کے حامی نہ رہے تھے اور اس نظریے کی حمایت اُنھوں نے محض اس لیے کر دی تھی کہ وہ مسلم لیگ کے اُس اجلاس کے صدر تھے جس میں اُنھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ اب ذرا ان تصورات کی صحت کو اس کتاب کی رُو سے ٹٹولیے:

۱۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں وزیرِ ہند مسٹر مانٹیگو ہندوستان آئے اور یہاں کے رہنماؤں سے ملے۔ اُنھوں نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے . . . . .

"ان لوگوں کے بعد جناح آیا جو ایک رعب دار شخصیت اور نہایت مہذب اطوار کا مالک ہونے کے علاوہ بحث و تمحیص کے فن کا بہت بڑا

ماہر ہے . . . . چیمسفورڈ (وائسرائے ہند) نے اس سے بحث کرنے کی کوشش کی لیکن جناح کے سامنے اس کی پیش نہ چل سکی جناح یقیناً بڑا قابل اور ہوشیار آدمی ہے اور یہ کس قدر ظلم ہے کہ ایسے شخص کو ملک (ہندوستان) کے نظم و نسق میں کوئی دخل نہیں۔" (صفحہ ۸۱)

۲۔ بلکہ اس سے بھی پہلے دسمبر ۱۹۱۶ء کا یہ معاہدہ جسے عرفِ عام میں لکھنؤ پیکٹ یا میثاق لکھنؤ کہا جاتا ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی مفاہمت کا ایک یادگار واقعہ ہونے کے علاوہ ہندستان کی آئینی اور دستوری تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسٹر جناح اس تمام کارروائی میں بطلِ جلیل یعنی ہیرو کی حیثیت رکھتے تھے اور اسی موقع پر سروجنی نائیڈو نے انہیں "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ (صفحہ ۷۱-۷۲)

۳۔ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو مسٹر جناح کی دعوت پر ہندستان کے تیس سربرآوردہ اور مختلف الخیال مسلمان لیڈر دہلی میں جمع ہوئے تاکہ فرقہ وارانہ جھگڑوں کو ختم کرنے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مستقل مفاہمت پیدا کرنے کی کوئی تجویز سوچی جائے . . . صدارت مسٹر جناح نے کی . . . ۱۵ مئی ۱۹۲۷ء کو سری نواس آئنگر کی صدارت میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں ہوا جس میں مسٹر جناح کی تجاویز کو من و عن منظور

کر لیا گیا اور سارا ہندستان تہنیت و مبارک باد کے نعروں سے گونجنے لگا (صہ ۲۰۶، ۲۰۹، ۲۱۰)

۴ - پنڈت موتی لال نہرو ایک بڑے وطن پرست اور قوم پرور لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ لیکن تعجب ہے کہ انھوں نے اس بیش بہا افادہ حقیقت کو نہ سمجھا کہ مسٹر جناح کو ٹھکرا کر وہ مسلمان قوم کے ساتھ آبرومندانہ مفاہمت کی تمام امیدوں کا اپنے ہاتھ سے خون کر رہے ہیں۔ جناح کو رد کر دینے کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ طے کرنے کے لیے کانگرس کو سر محمد شفیع اور سر فضل حسین سے گفت و شنید کرنا پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ موتی لال اور شفیع یا موتی لال اور فضل حسین کے درمیان ایک ایسی خوفناک خلیج حائل تھی جس کو پاٹنا دونوں کے لیے ناممکن تھا۔ مسلمانوں میں صرف جناح ایک شخص تھا جو اپنی قوم کو مخلوط انتخاب پر رضامند کر کے ہندستان میں متحدہ قومیت کی بنیاد کھڑی کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ لیکن جب موتی لال کی ضد اور ہٹ دھرمی اور سر فضل حسین کی شاطرانہ چالوں (خصوصاً مسلم کانفرنس دہلی — یکم جنوری ۱۹۲۹ء) نے جناح کو گوشۂ عزلت میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تو کانگرس کا دوسرے مسلمان رہنماؤں سے کسی حسن سلوک کی توقع رکھنا محض خیال خام تھا۔ چنانچہ آئندہ فرقہ وارانہ جھگڑوں نے جو نت نیا رنگ اختیار کرنا شروع کیا اس کی تمام تر ذمہ داری پنڈت موتی لال نہرو کی اسی روش پر عائد ہونی چاہیے۔

(ص ۳۳۳، ۳۳۴)

۵ — ۱۹۳۴ء میں قائدِ اعظم واپس وطن آئے اور اُنھوں نے بدلے ہوئے حالات اور عقائد کے تحت جُداگانہ انتخاب کی سکیم کے مطابق مسلم لیگ کے ایک نئے اور زیادہ عملی پروگرام کا اجرا کیا۔ مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ انتخابات میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا۔ جب مسٹر جناح نے اس بات پر ۔ ۔ ۔ افسوس کا اظہار کیا کہ کانگرس خواہ مخواہ مسلم لیگی اُمیدواروں کے مقابلے میں اپنے (مسلمان) اُمیدوار کھڑے کررہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تو جواہر لال نہرو اس پر سخت گرجے اور برسے۔ اُنھوں نے مسٹر جناح پر نارواحملے کیے اور کہا کہ ہندستان میں مسلمانوں کی جُداگانہ سیاسی ہستی ایک لایعنی اور مضحکہ انگیز دعویٰ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ علامہ اقبال نے اس صورتِ حال سے متاثر ہوکر حسبِ ذیل بیان جاری کیا:

۔ ۔ ۔ ۔ "میرے دل میں پنڈت نہرو کی بہت عزّت ہے۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اُنھوں نے بلاوجہ مسٹر جناح کے ساتھ اُلجھنے کی کوشش کی ہے۔ مسٹر جناح آج مسلمانوں کے سب سے بڑے اور سب سے معتمد علیہ لیڈر ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ پنڈت جواہر لال نہرو واقعی کچھ عرصہ مالوی اور مونجے کی ذہنیت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن حال ہی میں اُنھوں نے فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق کانگرس کی جانبداری کو جس طریقے سے ختم کیا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بھی آخرکار

مہاسبھا کے روزافزوں اثر سے مغلوب ہوگئے ہیں۔ پنڈت نہرو کے اس طرز عمل کو دیکھ کر اب مسلمانوں کو ان پر بھی چنداں اعتماد نہیں رہا۔

علاوہ ازیں پنڈت نہرو کو یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ وہ اس بات کا شور مچاتے پھریں کہ مسٹر جناح مسلمانوں کے متوسط درجے کے بالائی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا مسٹر جناح کو مسلمانوں کے افلاس اور فاقہ زدگی کا کوئی علم نہیں ہے یا یہ کہ وہ (پنڈت نہرو) ہندوؤں اور مسلمانوں کی یکساں نمائندگی کرتے ہیں۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا خود پنڈت نہرو ہندوؤں کے متوسط درجے کے بالائی اور متمول طبقے سے تعلق نہیں رکھتے۔ افلاس اور بھوک کا نام لے لے کر غلط بحث کرنے اور ماسکو سے مانگی ہوئی زبان میں باتیں کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا . . .

مجھے اُمید ہے کہ پنڈت نہرو کو جلد اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ مسٹر جناح مسلمانوں میں کتنی بلند حیثیت اور ارفع مقام کے مالک ہیں اور اس احساس کے بعد وہ مسٹر جناح کو ناراض کرنے کے بجائے ان کی امداد و اعانت سے مستفید ہونے کی کوشش کریں گے جیسے کہ مرکزی اسمبلی کے کانگریسی لیڈر اب تک مستفید ہوتے رہے ہیں مسلمانوں کی طرف سے اگر کسی شخص کو بات کرنے کا حق حاصل ہے تو وہ صرف مسٹر جناح ہیں۔ ممکن ہے پنڈت نہرو اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی بجائے جنت الحمقاء میں رہنا پسند کریں اور اصرار کرتے جائیں کہ مسلمانو

کی نیابت کا حق بھی کانگرس ہی کو حاصل ہے۔ اگر اُنھوں نے ایسی ضد کی تو خود اپنے ہاتھوں سے ہندستان کی آزادی کے راستے میں روڑے اٹکائیں گے ۔ ۔ ۔ (صہ ۳۷۳-۳۷۶)

۱۔ ۷ر فروری ۱۹۳۵ء کو ہندستان کی مرکزی اسمبلی میں قائد اعظم نے جہاں ۱۹۳۵ء کے آئین کے بارے میں یہ کہا تھا :

" یہ نیا آئین اس آئین سے جو اس وقت رائج ہے کہیں زیادہ لغو ہے ـــ میرا جواب سن لیجیے :

پوری سکیم پر اس طرح نظرِ ثانی کی جائے کہ برطانوی ہند میں جلد از جلد مکمل ذمہ دار حکومت قائم ہو سکے " وہاں اُنھوں نے ایک انکشاف یہ بھی کیا تھا ـــ " میں نے خود انگلستان میں مہاتما گاندھی سے درخواست کی تھی کہ اچھوتوں کے ساتھ مفاہمت کر لیجیے ۔ اُنھوں نے ابتدا میں میری بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اچھوتوں سے الگ کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ اس طرح ہندو سماج میں تفرقہ پیدا ہو جائے گا۔ میں نے بار بار درخواست کی اور یقین کیجیے کہ میں نے مسلمانوں سے زیادہ اچھوتوں کے لیے مہاتما گاندھی سے التجائیں کیں۔ شروع میں تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتے تھے لیکن آخر کار اُنھوں نے معاملے کی اہمیت سمجھ لی تو آمادہ ہو گئے۔" (صہ ۴۳۸، ۴۳۹-۴۴۱)

۷۔" اقبال نے اپنے انتقال سے چند مہینے قبل جب کہ وہ بستر علالت پر دراز تھے، پنڈت جواہر لال نہرو کو جوان دنوں لاہور میں میاں افتخار الدین کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے بیغام بھیجا کہ مجھ سے ملتے جائیے گا۔ پنڈت جی کے ساتھ میاں صاحب بھی آئے۔ گفتگو جاری تھی کہ یکایک میاں افتخار الدین بیچ میں بول اٹھے :

"ڈاکٹر صاحب! آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے۔ مسلمان مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگرس کے ساتھ بات چیت کریں تو نتیجہ بہتر نکلے گا۔"

ڈاکٹر صاحب لیٹے ہوئے تھے، یہ سنتے ہی غصہ میں آگئے اور اٹھ کر بیٹھ گئے اور انگریزی میں کہنے لگے :

" اچھا! تو چال یہ ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر مسٹر جناح کے مقابلہ پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں، میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں تو ان کا ایک معمولی سپاہی ہوں" (صہ ۵۴۹، ۵۵۰)

۸۔"اقبال نے دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا تھا اس میں پہلی مرتبہ اپنی ذاتی حیثیت سے نظریۂ پاکستان پیش کیا تھا۔ اس وقت پاکستان کے مطالبے پر مسلم لیگ کی مہر نہ لگی تھی پاکستان کا مطالبہ کوئی دس سال بعد کا واقعہ ہے (۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء) اس سے

اقبال پر صدر کی حیثیت سے کوئی پابندی نہ تھی کہ وہ پاکستان کے نظریے کی حمایت کرتے ۔ اسی طرح وہ آخر عمر تک اس نظریے پر زور دیتے رہے چنانچہ اپنی وفات سے دس مہینے پہلے وہ قائدِ اعظم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

جب تک اسلامی اکثریت کے صوبوں کا ایک الگ فیڈریشن نہ قائم کیا جائے گا ہندوستان میں امن برقرار نہیں ہو سکتا اور نہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تسلط سے نجات ملے گی ۔ کیا وجہ ہے کہ شمال مغربی ہندوستان (پنجاب ، سندھ ، سرحد ، بلوچستان) اور بنگال کے مسلمانوں کو ایک جُدا گانہ قوم تصور کر کے انھیں حق خود ارادی نہ عطا کیا جائے ۔ (ص ۵۶۴)

یہ اقتباسات اپنے مُنہ سے اتنا کچھ کہہ رہے ہیں کہ انھیں مزید کچھ بتانے پر مجبور کرنے کی ایسی ضرورت نہیں ۔ جناح کی حیثیت ان کا کردار ، پاکستان کے مطالبے کا پس منظر ، اقبال کی بصیرت وکمیسوئی ان اقتباسات میں آئینہ ہو رہی ہے ۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے کچھ منتشر اوراق کو جوڑ کر حقیقت کی ایک واضح صورت کو جنم دیا ہے ، کوئی منطق نہیں چھانٹی ، فلسفہ نہیں بگھارا ، پھر بھی معلومات اور صداقت نے بل حل کر بہت سے اندھیرے گوشوں کو روشن کر دیا ہے ۔ اس کتاب کے مسالے میں ہماری کئی بیماریوں کی جو تشخیص چھپی ہوئی ہے ، اس پر بھی کچھ لکھوں گا (ملاحظہ ہو : اگلا مضمون ، ماضی کا مستقبل) فی الحال

آپ ایک تعجب انگیز خبر سُنیئے۔ اگر اس کتاب کی یہ اطلاع صحیح ہے تو دیکھیے کہ جھوٹ مسلمانوں کی ہڈیوں میں کس طرح رچ چکا ہے اور جہاں بھٹک کی عادت سے وہ کس حد تک محروم ہو چکے ہیں! اور اگر یہ غلط ہے تو دیکھیے کہ کون اسے دلیل سے جھٹلاتا ہے :

۹۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا نام غلام محی الدین اور ان کے بڑے بھائی کا نام غلام یٰسین اور تخلص آہ تھا۔ لیکن مولانا نے اپنا نام بتدریج بدلا۔ پہلے محی الدین احمد رکھا۔ پھر عرب بننے کے شوق میں صرف احمد رہ گئے۔ فرماتے ہیں :

"پیر غریب الدیار، عہد و ناآشنائے عصر، بیگانۂ خویش و نمک پرورد ریش، معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے۔"

—— مولانا کا آبائی وطن قصبہ کھیم کرن، تحصیل قصور، ضلع لاہور تھا۔ لیکن مولانا فرماتے ہیں :

"آبائی وطن دہلی مرحوم ہے مگر وطن مادری سرزمین مطہر طیبہ و دارالہجرت سید الکونین و شہرستان نبوّت و وحی ہے۔"

—— مولانا کے دادا کا نام محمد دین عرف عمرا چھیکڑی تھا۔ وہ کھیم کرن میں گائے بھینس کی کھالیں رنگنے کا کام کرتے تھے اور کھیم کرن ہی میں دفن ہیں لیکن مولانا فرماتے ہیں :

"میرے دادا مولانا محمد ہادی دہلی مرحوم کے مشہور خاندانِ علم و فضیلت سے تعلق رکھتے تھے جس میں بیک وقت پانچ پانچ علماء درس و افتاء

اصحاب سلوک و طریقت پیدا ہوئے ہیں۔"

—— مولانا کے والد خیر دین (جو بعد میں صوفی پیر خیر الدین کے لقب سے مشہور ہوئے) دس گیارہ سال کی عمر میں کھیم کرن سے بھاگ کر بمبئی چلے گئے تھے۔ مولانا کے حقیقی چچا یعنی خیر الدین کے بھائی امام دین کا ستر سال کی عمر کے لگ بھگ لاہور میں انتقال ہوا تھا اور ان کی قبر بھی لاہور میں ہے۔ امام دین کے بیٹے یعنی مولانا کے چچا زاد بھائی فیروز دین ککٹ سال ابھی چند سال ہوئے لاہور میں موری دروازے کے اندر ایک چھوٹی سی دکان کرتے تھے۔ ان حقائق کے باوجود مولانا فرماتے ہیں :

" والد مرحوم کے نانا رکن المدرسین مولانا منور الدین اپنے عہد کے مشاہیر اساتذۂ علم و درس اور اصحاب طریقت و سلوک میں سے تھے اور ان مخصوص اصحاب کمال میں سے جن کو اللہ تعالیٰ علوم ظاہر و باطن عطا فرماتا ہے ان کا شمار حضرت شاہ عبد العزیز کے اجلۂ تلامذہ میں تھا اور سلطنتِ مغلیہ کے آخری رکن المدرسین تھے۔"

—— تقسیم ہند کے بعد قصبہ کھیم کرن بھارت میں رہ گیا ہے۔ تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ کھیم کرن کے باشندوں کی درخواست پر مشرقی پنجاب کی حکومت نے کھیم کرن کے چیاد دروازہ کا نام "مولانا آزاد گیٹ" رکھ دیا ہے اور مولانا کا آبائی مکان آثارِ قدیمہ کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے (حاشیہ ص ۴۶-۴۹)

(چلیے صداقت نہ سہی، شہرت تو مل گئی، دولت تو مل گئی، محبت تو مل گئی، انحیار ہی کی جانب سے سہی)

ماضی کا مستقبل

ہر ماضی کا ایک مستقبل ہوتا ہے جو کچھ ہو چکا ہے وہ ختم نہیں ہو گیا۔ اس کے نتائج آگے چلتے چلے جاتے ہیں۔ ایک اچھی بات یوں ہے جیسے ایک اچھا درخت جس کی جڑیں مضبوط ہیں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ وہ ہمیشہ سرسبز رہتا ہے اور ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔ ایک بُری بات یوں ہے جیسے ایک بُرا درخت جس کی جڑیں کمزور ہیں اور ہوائیں اسے اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ پھر اس کے بیج یہاں وہاں پھیل جاتے ہیں اور بُرائی کا ایک جنگل اُگ آتا ہے۔ اس طرح ایک اچھی بات یا ایک صحیح اقدام اور ایک بُری بات یا ایک غلط اقدام مستقبل میں بھی دخل رکھتا ہے۔ کہتے ہیں باپ دادا کے گناہوں کی سزا پوتے بھگتے ہیں مگر یہ بھی تو سچ ہے کہ باپ دادا کی بُرائیوں کے ساتھ ساتھ ان کی اچھائیاں بھی آگے منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ زور لگا کر اپنا راستہ آپ بنالے، یا جب چاہے اپنے ورثے پر اپنے ارادے کی مُہر لگا دے لیکن پھر بھی جہاں تک انسانی زندگی کے فطری عناصر کا تعلق ہے انسان اسی طرح مجبور ہے جیسے فطرت کے دوسرے مظاہر۔ انسان فطرت کی گود میں پلتا ہے، ایک جسم کا حامل ہے اور یہ جسم اس کے ارادے کی اطاعت کے باوجود فطرت کے اصولوں ہی کا تابع ہے۔ آپ لاکھ متقی ہوں، طاہر ہوں، اگر آپ کے باپ دادا

شراب نوشی کرتے رہتے ہیں، آتشک وغیرہ کا شکار رہتے ہیں تو آپ کے جسم کا بیج بدی کے پھول لانے پر مجبور رہے۔ اسی لیے تو سیانے کہتے ہیں کہ پرہیز علاج سے بہتر ہے۔

حسب معمول آج کل ہمارا علاج ہو رہا ہے۔ لیکن اگر ہم پرہیز کرتے تو علاج کی غرض سے پنج سالہ منصوبوں کے شفاخانوں میں اٹکنے کی شاید ضرورت ہی نہ پڑتی، جس خُدا کے نام پر ہم نے یہ ملک لیا تھا ہم اس کے پیچھے چلے ہوتے تو پھر اس خیرالرازقین نے ہمیں بیرونی امدادوں سے مستغنی کیا ہوتا اور اس غالب وناصر نے ہمیں غاصبوں کے مقابلے میں مظفر کیا ہوتا، یوں انتظار میں نہ رکھا ہوتا۔ لیکن ہمیں تو کچھ اور لگن تھی — ہم تو اپنے پُرانے حریف ہندوؤں کی طرح دولت مند بننا چاہتے تھے۔ ہم تو اپنے پُرانے آقا انگریزوں کی طرح صاحب بہادر بننا چاہتے تھے۔ خدا کو ہماری کیا کمی تھی، وہ تو بے نیاز تھا اور ابھی تو ہم جواں سال تھے، چار دن تو فرصت گناہ ملنی ہی چاہیے تھی۔ مگر پروردگار بے حوصلہ ثابت ہُوا اور حسب معمول اس نے حساب کتاب میں جلدی کی۔ بہرحال ہم بُرا بھلا اپنا حساب کتاب کر ہی رہے ہیں تو کیا ہم اس بات پر بھی توجہ دے رہے ہیں کہ جس ماضی کا مستقبل ہمارا حال ہے اس میں ہم نے کون سے بیج بوئے تھے جن کا پیپ بھرا پھل ہمیں برسوں ملتا رہا ہے اور کہیں ہم نے تو نہیں ہم اپنے علاج کے لیے اب پھر اسی برائی کے جنگل ہی میں سے بیج تو نہیں اٹھا لائے یہی وہ مقام ہے جہاں ایک دیانت دار مورخ ہماری مدد کرتا ہے۔

۲

پاکستان میں جو کچھ ہُوا ہے اس کے پیچھے دو اہم باتیں ہیں (۱) عوامی نیابت

کا فقدان اور (۲) حکمرانوں اور سیاست دانوں کا کردار۔ جو کچھ ہُوا ہے وہ انہی دو بنیادی پتھروں کی بُرائی کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ نتیجہ برآمد نہ ہوتا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ کا قانون معطّل ہو گیا ہے یا اُس نے پاکستان کو مزدود کی خدائی کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی کتاب "اقبال کے آخری دو سال" کے حوالے سے میں کچھ باتیں اپنے مضمون "ہماری تاریخ کے پریشان اوراق" میں کر چکا ہوں، اب اس کتاب کی چند معلومات کی بنا پر عوام، حکمرانوں اور سیاست دانوں کے بارے میں کچھ باتیں صاف کرنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ پاکستان کی تحریک میں یقیناً مسلم عوام نے بھی اچھا خاصا حصّہ لیا۔ پورے برطانوی ہند میں اس تحریک نے عوام کے دلوں میں گھر کر لیا اور سات سال کے مختصر عرصے میں قیامِ پاکستان عمل میں آ گیا۔ لیکن عرصے کا یہی اختصار ہماری کئی خرابیوں کا باعث بنا ہے۔ ایک قوم کی تاریخ میں اس طرح کے سات سال بجلی کے ایک کوندے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔۔۔ خاص طور سے ان حالات میں جب کہ آزادی مل ہی رہی تھی اور بٹوارے کی بات کے لیے ہمارے ہم وطن اور غیر ملکی حکمران دونوں اپنے آپ کو آمادہ کر رہے تھے۔ اگر ان سات سالوں میں پوری قوم اس طرح کے کسی کٹھن مرحلے سے گزرتی جس میں سے ایک کروڑ مہاجرین گزرے تھے تو ہو سکتا ہے یہ مختصر عرصہ ایک ایسا دہکتا ہُوا تجربہ بن جاتا جو ہمیں صدیوں تک فعال رکھتا۔ اور تو اور مہاجرین نے بھی اپنے تجربے کو جائدادوں کے تہ بہ تہ ظلمتوں والے سمندر میں ڈبو دیا۔ یُوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایک سوئی ہُوئی قوم ایک لمحے کے لیے جاگی ہو اور کروٹ بدل کر پھر سو گئی ہو۔

سرسیّد، محمد علی، شوکت علی، جناح، ڈاکٹر انصاری، ابوالکلام آزاد وغیرہ چند رہنماؤں کو چھوڑ کر مُسلم قیادت بڑے بڑے رؤسا، امراء، جاگیرداروں اور زمینداروں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ یہی لوگ اسمبلیوں اور کانفرنسوں میں پہنچتے رہے ہیں اور یہی لوگ مسلمانوں کی طرف سے انگریز سے بات کرتے رہے ہیں جب تک مُسلم لیگ نے پاکستان کی تحریک کا اجراء نہیں کیا، خلافت کو چھوڑ کر جو اُن معنی میں سیاسی تحریک نہیں تھی جن معنی میں کانگرس کی تحریک آزادی یا لیگ کی تحریک پاکستان تھی، مسلمانانِ ہند نے ایک جماعت کی حیثیت سے اپنی زندگی کا ثبوت شاید ہی کبھی دیا ہو۔ اس کی وجہ جہاں تعلیم کی پستی اور غلامی کا تسلسل ہے وہاں بڑی حد تک یہ بات بھی ہے کہ ہمارے چند بااثر سیاستدانوں نے سیاست کو عوام کی بیداری کے بجائے شطرنج کی بساط جانا ہے اور یہی کوشش کی ہے کہ ذاتی چالوں سے بازی جیتنے کی کوئی صورت نکالی جائے۔

۱ — میاں فضل حسین مسلمانوں کے بڑے خیرخواہ، ہمدرد اور مخلص رہنما تھے۔ اُن کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اُن کی زیرکی اور ہوشمندی سے انکار نہیں کر سکتا لیکن ان کا کام کرنے کا انداز جُدا گانہ تھا۔ اُنھیں سب سے زیادہ اپنی ذات پر اعتماد تھا اور یہ خود اعتمادی اس حد تک ترقی کر گئی تھی کہ وہ کسی اور کی رائے کو حتی الامکان درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے اس سیاسی رویّے کو کسی قدر وضاحت سے بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ عوام کالانعام ہیں، ان کی سیاسی بصیرت ناقص ہے، اُن سے کسی سیاسی تحریک میں کام لینا عقلمندی کے خلاف ہے، ہم مسلمان قوم کی ضروریات

سے خوب واقف ہوں، اس لیے مجھ پر اور میری بصیرت پر اعتماد کرو اور تمام کام مجھی پر چھوڑ دو۔ (صفحہ ۲۴۸)

(۲) لیکن اس پالیسی کا نتیجہ کیا نکلا۔ خود سر فضل حسین کی زبان سے سنئے:
"مسلمانوں کے بارے میں مجھے سب سے زیادہ فکر یہ ہے کہ انھیں یوں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے کی بجائے اپنی اور اپنے ملک کی بہتری کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ بحالات موجودہ... وہ محض تماشائی بن کر ہندو سیاست دانوں اور حکومت کی باہمی جنگ کا نظارہ دیکھ رہے ہیں.... ہمارے پروگرام میں یہ چیز بھی شامل ہونی چاہیے کہ تعمیر و ترقی کی مقامی تحریکوں میں زیادہ قوت پیدا کی جائے.... ورنہ اندیشہ ہے کہ اس دوڑ میں ہم ابنائے وطن سے پیچھے رہ جائیں گے۔" ۲۹ر جولائی ۱۹۳۱ء (صفحہ ۲۵)

(۳) حالانکہ یہی سر فضل حسین تھے جنھوں نے ۱۹۳۰ء میں جب وہ وائسرائے کی کونسل کے رکن منتخب ہو کر دہلی چلے گئے تھے، پنجاب کے گورنر کو لکھا تھا کہ وہ مسلمانوں میں سے فلاں فلاں شخص کو بلا کر تاکید کریں، کہ سرحدی مسلمانوں کی ہمدردی میں لوگوں کو مشتعل نہ کیا جائے۔ پشاور میں قصہ خوانی بازار کے دردناک حادثے کے بعد، جس میں انگریزوں نے دو سو مسلمانوں کو بھون کر رکھ دیا تھا، چاہیے تو یہ تھا کہ پشاور سے مدراس تک کے

مسلمان جاگ اُٹھتے اور بیک آواز اپنے بھائیوں کا قصاص طلب کرتے لیکن وہ قوم جس نے چند سال قبل ترکوں کے مصائب سے بے قرار ہو کر خلافت جیسی ہمہ گیر تحریک چلائی تھی سرحد کے مسلمانوں پر جور و ستم کی بارش دیکھ کر بھی جنبش نہ کر سکی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی بیاسی بے حسی کا اس سے دل خراش منظر کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا (صہ ۲۴۵، ۲۴۸)

۴۔ یہی سر فضل حسین تھے کہ کانگرس کی سول نافرمانی کا اثر دُور و نزدیک پھیلنے لگا اور بعض مسلمان لیڈروں نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی تحریک سے الگ تھلگ رہنا خود ان کی قوم کے لیے مفید نہیں . . . . تو میاں فضل حسین نے فوراً پنجاب میں زمیندارہ لیگیں قائم کرائیں اور ان لیگوں کے ذریعے سے پنجاب کے دیہات میں کانگرس کے خلاف وسیع پیمانے پر پراپگنڈہ کیا گیا ہندوستان کے تمام صوبوں کی دیہاتی آبادی سول نافرمانی کی تحریک میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شامل تھی۔ لیکن پنجاب کی دیہاتی آبادی کو چھوئی موئی کے پودے کی مانند اس طرح محفوظ رکھا گیا تھا کہ اس پر سیاسیات کے شجرِ ممنوعہ کا سایہ بھی نہ پڑ سکتا تھا۔ (صہ ۲۴۹)

۵۔ احرار کی تحریک کو میاں فضل حسین نے جس طرح ختم کیا وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ مسلمانوں میں کسی عوامی تحریک کے وجود کو گوارا نہ کر سکتے تھے حالانکہ احرار کی تحریکِ کشمیر نے ثابت کر دیا تھا کہ مسلمانوں کی خاکستر میں اب

بھی ایسی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں جو ہوا کے ایک جھونکے سے شعلوں کی طرح لپکنے لگتی ہیں مسلمان جو کانگرس کی سول نافرمانی کے ہنگامے دیکھ دیکھ مرعوب ہوئے جارہے تھے اب مطمئن تھے کہ ان کے دست و بازو میں بھی اتنی قوت ہے کہ وہ کشمیر کے متکبر و مغرور حکمران کو سرنگوں کر سکتے ہیں۔" (صد ۲۵۴)

ان اقتباسات میں سر فضل حسین کو موردِ الزام ٹھہرانے کے بجائے توجہ اس بات پر دینی چاہیے کہ ہندوستانی مسلمان ایک جماعت کی حیثیت سے اپنے حقوق کے سیلے نہیں لڑتے، ان کے چند بُرے یا بھلے رہنما اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق کچھ کرتے رہتے ہیں اور بس نتیجہ اقبال کے الفاظ میں یہ نکلا کہ "جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اُن میں صحیح لیڈر شپ مفقود ہو چکی ہے اور سیاسی میدان چند حد درجہ نالائق مقدر آزماؤں کے قبضے میں چلا گیا ہے" (صد ۲۷۰) چنانچہ اقبال نے جب قائدِ اعظم کو مسلمانوں کی قیادت کا سب سے زیادہ اہل پایا تو ان سے بھی یہی درخواست کی کہ:

۶۔ "لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کیا وہ بدستور ہندوستان کے مسلمانوں کے بالائی طبقوں کی ایک جماعت بنی رہے گی یا اُن مسلمان عوام کے ایک اجتماعی ادارے کی صورت اختیار کرے گی جنھوں نے اب تک معقول وجوہ کی بنا پر لیگ سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اُس سیاسی جماعت کے زندہ رہنے کا اب کوئی امکان نہیں جو عامۃ المسلمین کی حالت سدھارنے یا ان کی فلاح و بہبود کے کاموں کی طرف توجہ کرنے سے گریز کرتی

ہے۔" (صہ ۴۱۵)

تحریکِ پاکستان کے مختصر سے لمحے کو چھوڑ کر اہلِ پاکستان میں عوامی قیادت کے فقدان نے جو شدت اختیار کیے رکھی ہے یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ عوام اور حکومت دو ایسے دیوار بند خانوں میں بٹتے رہے ہیں جنھیں نہ ایک دوسرے سے دلچسپی ہوتی ہے نہ غرض۔ جس طرح کے لوگ ہمارے یہاں حکمرانی اور قیادت کی مسندوں پر فائز رہے ہیں اگر عوام ہوشمند ہوتے تو یقیناً ان لوگوں کے لیے کوئی جائے امان نہ چھوڑتے۔ اسی طرح اگر ہمارے حکمران اور سیاستدان عوام کو ساتھ لے کر چلنے کی عادت رکھتے تو عوام کی معاشی اور اخلاقی حالت کا جنازہ بھی اس دھوم دھام سے نہ نکلتا۔ آج ہم پختونستان کے ڈھونگ سے جز بز ہوتے ہیں، دیہاتی اور شہری کی تفریق سے جلتے ہیں، صوبائیت اور تسلیت سے بیزار ہیں، اس بات پر حیران ہیں کہ عوام بہتری کی خاطر بدلنے پر کیوں مائل نہیں ہوتے؟ اس موقع پر ہمیں سوچنا چاہیے کہ ان تمام مظاہر کے پیچھے کن عوامل کا ہاتھ ہے اور ہمیں یہ بھی فکر کرنی چاہیے کہ اگر ہمارے یہاں بنیادی جمہوریتوں کی قسم کا کوئی پروگرام کامیاب نہ ہوا تو کیا ایک مرتبہ پھر یہ مظاہر اپنے آپ کو نہیں دہرائیں گے۔ عوام کو نظر انداز کیا گیا، انھیں جھنجھوڑ کر بیدار نہ کیا گیا، فعال نہ بنایا گیا تو یہی کچھ بار بار ہوتا رہے گا اس کے بغیر تو عوام محض ردِ عمل کے اہل رہ جائیں گے، فساد اور بغاوت ہی کر سکیں گے، یا پھر پڑے سوتے رہیں گے۔

☆

۳

ہم نے اپنے اہلکاروں کی چھان پھٹک کرنے کی ایک کوشش کی ہے کہ ان میں سے کون بددیانت، کام چور یا رشوت خور ہے۔ کیا ہم سمجھتے ہیں کہ اس طرح کا ہنگامی علاج ان خرابیوں کی جڑیں کاٹ دے گا؟ جب تک ان خرابیوں کی بنیاد نہیں اُکھاڑی جائے گی تب تک نئی شاخیں، نئی راہیں پیدا ہوتی چلی جائیں گی۔ بس جس طرح کسی دیرینہ بیماری میں مریض دوا پیتا چلا جائے تو کچھ افاقہ رہتا ہے، اُدھر اُس نے دوا چھوڑی اُدھر بیماری نے سر اٹھایا، ظاہر ہے کہ اُس کو صحت یابی تو نہیں کہا جا سکتا۔ جب تک ہم اہلکاروں کے انتخاب کا معیار نہیں بدلتے ــ اُنھیں عوام سے مل جل کر کام کرنے اور عوام کو تعمیر و ترقی کے لیے مائل کرنے کے انداز نہیں سکھاتے، انھیں یہ حقیقی احساس نہیں دلاتے کہ پوری قوم ان کا محاسبہ کر رہی ہے، انھیں یہ نہیں بتاتے کہ وہ عوام کے لیے ہیں عوام ان کے لیے نہیں اس وقت تک بنیادی طور سے کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم پلٹ کر اپنی حالیہ تاریخ کے پریشان اوراق کی شیرازہ بندی کریں تو ہمیں اپنی بہت سی سماجی بدحالیوں کی جڑیں دکھائی دے سکتی ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ہم ان جڑوں کو اکھاڑ پھینکیں یا جڑوں کو جوں کا توں رہنے دیں اور چند خشک پتے جھاڑ کر سمجھیں کہ آئندہ برائیوں کا یہ جنگل میٹھے رس بھرے پھل لایا کرے گا۔

۷۔ شہری اور دیہاتی آبادی کی جو تفریق پیدا کر دی گئی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھے لکھے سمجھ دار شہری امیدواروں کی نسبت کم علم دیہاتی نوجوانوں کو اعلیٰ ملازمتیں ملنے لگیں۔" اگر براہِ راست تقرر یا نامزدگی کا سوال آتا تھا تو

ایک ایم اے پاس شہری مسلمان پر ایک ایسے دیہاتی مسلمان کو ترجیح دی جاتی تھی جو محض میٹرک یا ایف اے تک تعلیم یافتہ ہوتا تھا۔ مثلاً اگر مقابلے کے امتحان کے ذریعے سے پراونشل سول سروس کی دس اسامیوں کو پُر کرنے کا موقع آتا تھا تو حکومت اعلان کر دیتی تھی کہ ان دس اسامیوں میں سے چار اسامیاں مسلمانوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ادھر جب امتحان کا نتیجہ نکلتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ کامیاب اُمیدواروں کی فہرست میں جو سب سے پہلے دس امیدوار ہیں ان میں سے صرف دو مسلمان آئے ہیں۔ اس صورت میں بقیہ دو اسامیوں کو پُر کرنے کے لیے حکومت اپنے اختیار خاص سے نامزدگی کا طریقہ اختیار کرتی تھی۔ قاعدے کی رو سے چاہیے تو یہ تھا کہ کامیاب امیدواروں میں سر فہرست جن دس اُمیدواروں کے نام تھے اُن کے معاً بعد علی الترتیب جن دو مسلمانوں کا نمبر تھا انھیں نامزد کر دیا جاتا تا کہ کسی کی حق تلفی نہ ہونے پاتی لیکن حکومت اس قاعدے کو بالائے طاق رکھ کر محض اپنی خوشنودی اور صوابدید سے ایسے لوگوں کو نامزد کر دیتی تھی جو تعلیمی قابلیت میں پست ہونے کے باوجود بعض مصلحتوں کی وجہ سے حکومت کے منظور نظر ہوتے تھے۔ اس طرز عمل کا ایک بیّن لیکن بے حد تلخ نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا ایسا عنصر داخل ہو گیا جو ہندو اہلکاروں کے مقابلے میں بے استعداد، کم سواد اور نا اہل تھا۔ انجام کار اس کا خمیازہ پُوری قوم کو بھگتنا پڑا اور اغیار نے قوم کی قوم پر نالائقی کا الزام تھوپ دینے سے دریغ نہ کیا۔" (صہ ۱۸۷، ۱۸۸)

یہ بات اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ کر رہی ہے کہ جب پاکستان بنا تو ہمارے اعلیٰ سرکاری افسروں میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو اپنی قابلیت کی بنا پر نہیں بلکہ شہری اور دیہاتی کی تفریق، برادریوں کے زور، پارلیمنٹ کے مسلمان ممبروں کے رسوخ وغیرہ کی وجہ سے آگے آگئے تھے۔ بے شک اب یہ کچھ نہ ہوتا ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ اور نہیں تو اتنی بات ہمیں یاد ہی رکھنی چاہیے کہ ماضی میں جو کچھ ہوا اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ اب ذرا سیاست داتوں کی طرف آئیے۔ یہاں بھی ہم نے تحقیقاتی بورڈ بٹھا کر بہت سے ماہرین جوڑ توڑ کو ملکی سیاسیات سے کچھ مدت کے لئے . . . .

. . . .

خارج کر دیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو گیا۔ اگر ہم نے اہل سیاست کے کردار کو پیش نظر نہ رکھا، ان کی غرض مندیوں کا احتساب نہ کیا تو کل پھر ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جائے گا اور وہی کچھ، وقت کی تبدیلی کی وجہ سے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ دہرایا جائے گا جس نے اب تک ہماری لٹیا ڈبوئے رکھی ہے۔ پاکستان میں جن لوگوں کو سیاست کی کرسیوں پر جگہ ملی انھوں نے جو کچھ کیا وہ اس کے علاوہ اور کیا کر سکتے تھے، اُن کا ماضی اسی مستقبل کو جنم دے سکتا تھا۔

۸۔ مجھے یہاں ایک نہایت تکلیف دہ اور افسوسناک بات کا ذکر کرنا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک اس کا ذکر نہ کر لیا جائے ماضی کی اس داستان کو آگے بڑھانا میرے لیے ناممکن ہے۔ جب سے پنجاب میں سر سکندر حیات خاں کی وزارت قائم ہوئی تھی نواب زادہ لیاقت علی خاں کا ذاتی رویہ ہمارے

متعلق (پنجاب مسلم لیگ، جس کے صدر علامہ اقبال تھے) بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اُن کی امداد و اعانت اور تائید و حمایت کلیتہً سر سکندر کے لیے وقف ہو چکی تھی۔ لیاقت آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے۔ وہ مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمینٹری بورڈ کے ممبر تھے لیکن انھوں نے بورڈ سے استعفیٰ دے دیا تھا اور مسلم لیگ کی بجائے نیشنل ایگریکلچرل پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن ۱۹۳۷ء لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یو۔ پی کی یہ پارٹی گویا پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کا مثنیٰ اور ہمزاد تھی۔ لیاقت کے استعفیٰ نے عجب صورت حال پیدا کر دی تھی۔ ابھی چند مہینے ہوئے وہ لیگ کے جنرل سیکرٹری منتخب کیے گئے تھے۔ اب ان کے استعفیٰ کے بعد لیگ کا کوئی سیکرٹری نہیں تھا (صہ ۳۵۷) مسٹر جناح جن مشکلات میں اس وقت گھرے ہوئے تھے اُن کا صحیح اندازہ آج نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تن تنہا آل انڈیا مسلم لیگ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوئے تھے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے مستعفی ہو جانے کے بعد ساری خط و کتابت مسٹر جناح کو خود کرنی پڑتی تھی۔ اُن کے پاس کوئی ٹائپسٹ بھی نہیں تھا۔ خطوط اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اُس وقت اُن کی عمر ساٹھ سال ہو چکی تھی (صہ ۳۸۷ - ۳۸۸ - ۳۸۹) جہاں تک ان (لیاقت علی خاں) سے ہو سکتا تھا وہ ہر موقع پر سر سکندر کی مدد اور ہماری مخالفت کرتے تھے۔ اس دوران میں کئی بار ایسے مواقع پیش آئے کہ ہم راستی پر تھے اور سر سکندر کا رویّہ غلط تھا لیکن نواب زادہ مرحوم نے ہمیشہ سر سکندر کا ساتھ دیا۔

"نواب زادہ لیاقت علی خاں کے خاندان کے تمام لوگ اور جملہ اعزہ و اقارب کرنال میں رہتے تھے جنھیں آئے دن حکومت پنجاب کی امداد و اعانت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ سر سکندر بڑے زیرک اور ہوشیار آدمی تھے اُنھوں نے نواب زادہ مرحوم کے اس کمزور پہلو کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ خود لیاقت علی خاں کے بڑے بھائی نواب زادہ سجاد علی خاں پنجاب اسمبلی کے ممبر اور یونینسٹ پارٹی کے رُکن تھے۔ سر سکندر اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کے درمیان ہر قسم کا نامہ و پیام انھی کے توسل سے ہوتا تھا۔ یہاں ایک ایک بات کا علم تھا لیکن مصلحت کی مجبوریوں نے ہماری زبان و قلم پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔ ہم سرپرست مسٹر جناح کے تفکرات میں اضافہ نہ کرنا چاہتے تھے (صہ ۶۱۷، ۶۱۸)

۹۔ ۳۷ء کے الیکشن میں پنجاب سے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے سات اُمیدواروں میں سے صرف دو کامیاب ہوئے یعنی ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی خاں لیکن اس سلسلے میں سب سے تعجب انگیز واقعہ یہ ہے کہ راجہ غضنفر علی خاں نے اپنی کامیابی کے بعد بورڈ کے دفتر میں قدم رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اس کے بجائے وہ سیدھے یونینسٹ پارٹی کے جلسے میں پہنچے اور جاتے ہی اعلان کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کو ترک کر کے یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو گئے ہیں (صہ ۳۶۹) اگر بات یہیں تک رہتی تو معاملہ زیادہ خطرناک صورت اختیار نہ کرتا لیکن ستم یہ ہُوا کہ یونینسٹ پارٹی کے اسی جلسے میں راجہ

غضنفر علی خاں کا خیر مقدم کرتے ہوئے سر سکندر حیات نے جو تقریر کی اس میں اُنھوں نے فرمایا :

"راجہ صاحب میری مرضی اور میرے ایما سے مُسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن شروع ہی سے اُنھوں نے میرے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد وہ فوراً یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے" (ص ۳۶۹)

۱۰ - ۳۷ء کے الیکشن کے لیے سردار مظفر علی قزلباش نے مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ کو درخواست دی تھی۔ تحصیل لاہور سے دو امیدواروں کی درخواستیں موصول ہوئی تھیں۔ ایک میاں عبدالمجید دوسرے قزلباش بورڈ نے یہ امر واضح کر دیا تھا کہ اگر کسی شخص کو بورڈ نے اپنا امیدوار نامزد نہ کیا تو وہ شخص کسی اور پارٹی کے ٹکٹ پر یا اپنے طور پر الیکشن میں کھڑے ہونے کا مجاز نہیں ہوگا۔ . . . اور جب بورڈ نے میاں عبدالمجید کو اپنا امیدواراً نامزد کیا تو مظفر علی خاں قزلباش یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر ان کے خلاف کھڑے ہو گئے۔

۱۱ - "یو پی میں بھڑائچ کے حلقے سے مسلم لیگ کے اُمیدوار اصغر علی کامیاب ہوئے تھے لیکن اسمبلی کے ایوان میں داخل ہونے سے قبل ہی فوت ہو گئے۔ مسٹر جناح نے بیّن انداز میں فرمایا تھا کہ یہ نشست مسلم لیگ کی ہے اور

ہم اسے اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں جانے دیں گے۔ مگر حیرت ہے کہ یو۔ پی مسلم لیگ نے کانگرس کے امیدوار (رفیع احمد قدوائی) کے مقابلے میں اپنا اُمیدوار کھڑا کرنے سے انکار کر دیا اور یہ سو فی صدی یقینی نشست بلا مقابلہ کانگرس کے حوالے کر دی۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت عام طور پر یہ افواہ مشہور تھی کہ چودھری خلیق الزماں کی درپردہ کوشش سے رفیع احمد قدوائی کامیاب ہوئے ہیں۔ [خلیق الزماں یو۔ پی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر تھے۔ مسٹر جناح نے انھی دنوں بیان دیا تھا کہ "مسٹر خلیق الزماں نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے ہاں کے حالات سے مجھے مطلع کریں گے۔ میں ان کو اس سلسلے میں کئی بار یاد دہانی کرا چکا ہوں لیکن گزشتہ تین ہفتوں کے مسلسل انتظار کے باوجود اُنھوں نے مجھے کوئی اطلاع نہیں بھیجی۔ میں ان کی پُراسرار خاموشی کا مطلب سمجھنے سے معذور ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ فریقِ ثانی ــــ کانگرس ــــ کے ساتھ ایسی کوئی مفاہمت نہیں کریں گے جسے انجام کار ان کے صوبے ہی کے مسلمان نہیں بلکہ پُورے ہندوستان کے مسلمان رد کرنے پر مجبور ہو جائیں" (صہ ۲۰۴)] چودھری خلیق الزماں ہی کے ایماسے مسلم لیگ نے اپنا امیدوار کھڑا نہیں کیا تھا۔ واقعہ ہے کہ رفیع احمد قدوائی کے اسمبلی میں داخل ہو جانے کے بعد سیاسیات نے ایک ایسا رُخ پلٹا [نیشنلسٹ مسلمانوں کا مسئلہ] جو ہر اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے پریشان کن اور مسلم لیگ کے لیے نقصان رساں ثابت ہوا (صہ ۲۰۰-۲۰۹)

۱۲- میاں افتخار الدین اس زمانے میں نئے نئے کانگرس میں شامل ہوئے تھے۔ حُسنِ خدمات کے بدلے جواہر لال سے جلد از جلد خوشنودی کا پروانہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ میاں افتخار الدین نے یہی مناسب سمجھا کہ سب سے پہلے اپنی ہی برادری پر سیاسی ڈاکا ڈالیں۔ چنانچہ اُنھوں نے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور ڈاکٹر ستیہ پال سے کہہ سُن کر میاں عبدالعزیز کو کانگرس کا ٹکٹ دلا دیا۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ گوپی چند بھارگو اور ستیہ پال اس واقعے سے قبل میاں عبدالعزیز کے نام، کام اور شکل وصورت سے بھی واقف نہ تھے۔ خود میاں افتخار الدین کی اس وقت یہ حالت تھی کہ وہ صرف دو سال قبل اپنی تعلیم ختم کرکے انگلستان سے واپس آئے تھے اور سن وسال کے اعتبار سے ہنوز اسی منزل میں تھے جسے بقول شخصے "جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ سیاست کے آنار چڑھاؤ، مسلمانوں کے قومی مزاج اور مولانا ظفر علی خاں [جن کے خلاف کانگرس اپنا مسلمان اُمیدوار کھڑا کر رہی تھی تاکہ یہ بات تسلیم کرائی جائے کہ کانگرس مسلمانوں کی بھی اسی طرح جماعت ہے جس طرح ہندوؤں کی] کے شاندار ماضی سے قطعاً بے خبر تھے۔ اسی لیے ان سے ایسی حرکت سرزد ہوگئی جس سے پورے پنجاب کے مسلمانوں کا سر شرم وندامت سے جھک گیا اور سینہ غم وغصہ کا محشرستان بن گیا (صد ۴۱۱-۴۱۲)

حاجتِ مشاطہ نیست رُوئے دل آرام را

مشرقی پاکستان کا مسئلہ

تجزیہ

۱

پاکستان دُنیا کے نقشے پر ایک ایسا ملک ہے جس کے دو حصّوں کے درمیان خشکی اور تری کے ہزاروں میل پھیلے ہوئے ہیں۔ دیکھنے کو اس دُوری میں جُغرافیائی اور حربی کمزوری بھی دیکھی جا سکتی ہے لیکن کوشش کی جائے تو شاہین کے یہ دو پھیلے ہُوئے بازو آفتاب کو للکارتے ہوئے بھی نظر آ سکتے ہیں۔ خیال و خواب ہی میں نہیں، عمل و حقیقت میں بھی۔ سوال سیدھا ہے کہ کیسے؟ اور یہ سوال بہت معنی خیز بلکہ پریشان کُن بھی ہے کہ آج کل اس نوخیز سرزمین کی یہ دو آنکھیں کسی ایک مرکز پر جمی ہونے کے بجائے، ایک دُوسرے سے ہٹ کر دیکھنے میں لگی ہیں، ان میں رفیقوں کا رشتہ کارفرما محسوس نہیں ہو رہا، رقیبوں کا رشتہ اُبھرتا محسوس ہوتا ہے۔

علم کا عملی یا افادی پہلو یہی ہے کہ جب ہم کسی معاملے کو جان لیتے ہیں تو اس پر قابو پانا ممکن ہو جاتا ہے اور جب تک کسی معاملے کو کُھلی آنکھوں سے دیکھنے کی جرأت نہ کی جائے، جب تک کسی معاملے کو دل و دماغ پر وا ہونے کا رستہ نہ دیا جائے اس پر ہماری دسترس امکان کے دائرے سے خارج رہتی ہے۔

سرسیدنے اپنے دور میں انگریزوں کو سمجھنے کی جرأت کی اور ہندی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی داغ بیل ڈالی، بڑی حد تک اُس دور کے، اپنے حق میں معنید امکانات کے لیے، عملی صورت اختیار کرنے کی راہ کھولی۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اپنے دَور میں انگریزوں کو سمجھا اور چند ہی سالوں میں ایک الگ اور آزاد ملک قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے اپنے ہمسایہ، اپنے قریب بسنے ہوئے ہندوؤں کو سمجھنے کی کوشش کبھی نہ کی اور آج تک اُن سے کسی نہ کسی محاذ پر مار کھاتے چلے آتے ہیں۔ یہ تو دوسروں کو سمجھنے کی بات تھی، یہی حال اپنوں کا ہے۔ جب اپنوں کو بھی نہیں سمجھا جاتا، یا انھیں غلط سمجھا جاتا ہے تو وہ بھی آہستہ آہستہ بیگانے بنتے چلے جاتے ہیں۔ کیا قدرت کا دیا ہُوا یہ ایک عظیم موقع نہیں کہ ہم اب بھی اپنے خولوں میں سے سر نکال کر اپنے رفیقوں کو سمجھنے کی ابتدا کریں اور یُوں اُس رفاقت کو پھر سے زندہ کرنے کی بسم اللہ کریں جس کے نتیجے میں چند ہی برس پہلے مشرقی اور مغربی پاکستانیوں نے مل جل کر اس "سلطنت خداداد" کے لیے جدوجہد کی تھی اور اسے ممکن بنا یا تھا۔ کیا یہ ایک بہت اہم صداقت نہیں کہ اس رفاقت کے بغیر جو تعلق ہم میں ہوگا اس کی نوعیت لازماً رقابت کی ہوگی۔

کیا ہم آج یہ کہہ سکتے ہیں کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان رقابت نہیں؟ اگر ہم یہ کہیں گے تو یہ حقیقت سے روگردانی ہوگی اور میرے خیال میں یہ حکومت ہی نہیں، ہر سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے والے پاکستانی کی ذمہ داری ہے کہ اس حقیقت سے آنکھیں پھیرنے کے بجائے اس کا سامنا کرے، اسے جاننے پہچاننے

کی کوشش کرے تاکہ یہ نہ ہو کہ کسی روز کوئی ایسا دھماکا ہو جائے یا کوئی دوسری خود غرض جماعت یا حکومت اس بات میں کامیاب ہو جائے کہ ہماری وحدت کا شیرازہ ہی بکھر جائے، ہماری وحدت کا وہ شیرازہ جو ہماری باہمی افہام و تفہیم کے فقدان کی بنا پر اب بھی بڑی حد تک بکھرنے کو مچل رہا ہے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ پاکستان کے دونوں حصے ایک دوسرے کی اہمیت سے منہ موڑنے کی بھیانک حماقت کر رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان جب اپنی جانب نگاہ اٹھاتا ہے تو اسے ہر طرف افلاس اور تھکاوٹ ملتی ہے۔ اس کا ذمہ دار وہ مرکز سے بھی زیادہ مغربی پاکستان کو ٹھہراتا ہے۔ مغربی پاکستان اس کے نزدیک آستین کا وہ خونخوار سانپ ہے جو اس کی رگوں سے زندگی نچوڑے جا رہا ہے؛ زر مبادلہ مشرقی پاکستان کمائے اور ترقی مغربی پاکستان میں ہو۔ ادھر مغربی پاکستان یہ سمجھتا ہے کہ مشرقی پاکستان تو نحیف و نزار ڈھوک ننگے بنگالیوں کا دیس ہے جس کے دفاع کا بوجھ خواہ مخواہ مغربی پاکستان پر پڑا ہوا ہے، یہ لوگ اگر الگ ہونے پر تُلے ہوئے ہیں تو کیا ہے، ہو جانے دو انہیں الگ۔ اندر سے مغربی پاکستان بھی جانتا ہے کہ مشرقی پاکستان الگ نہیں ہونا چاہتا لیکن اس نے حقیقت کو نظر انداز کر کے، مشرقی پاکستان کے وجود کو دل میں جگہ نہ دینے کا یہ بہانہ بنا رکھا ہے اور اس ضمن میں مشرقی پاکستان کی یہ دلیل واقعی اٹل ہے کہ مشرقی پاکستان کے الگ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہونا ہے تو مغربی پاکستان الگ ہو جائے۔ مشرقی پاکستان میں تو تقریباً ساڑھے چھ صد آبادی ہے، اکثریت بھی کبھی اقلیت سے الگ ہوتی ہے، یہ کام تو اقلیت کے کرنے کا ہے۔ ادھر مشرقی پاکستان بھی یہ

جانتا ہے کہ مغربی پاکستان کے بھی مسائل ہیں، وہاں پنجاب ہی نہیں وہاں بلوچستان، سندھ اور سرحد بھی ہیں کہ میلوں آدم زاد کا نشان نہیں اور پانی کو آدمیوں کے ساتھ زمین بھی ترستی ہے لیکن اُس نے اپنی نگاہیں کراچی اور لائل پور پر ہی گاڑ رکھی ہیں کہ دیکھیے یہ شہر کس طرح مشرقی پاکستان کی پٹ سن کی آمدنی نگل نگل کر پھُولتے جا رہے ہیں۔ اب یہ عالم ہے کہ مغربی پاکستان سے جو لوگ کاروبار وغیرہ کے ضمن میں مشرقی پاکستان آتے جاتے ہیں وہ وہاں باقاعدہ مُوٹ کیسے جاتے ہوئے ان سے اوٹے ٹوٹے کی جاتی ہے اور اس مہم میں وہاں کے عوام ہی نہیں اب وہاں کی حکومت کے کارکن بھی شامل ہوگئے ہیں۔ اب یہ حالت ہے کہ جب کسی ملکی بنک کی کوئی ایسی شاخ جو مشرقی پاکستان میں ہے کچھ روپیہ کاروبار کی مدمیں مغربی پاکستان کی کسی برانچ کو منتقل کرنے لگتی ہے تو اُس کے کارکن سو دفعہ سوچتے اور پُوچھتے ہیں کہ آخر یہ روپیہ اُدھر کیوں جا رہا ہے۔ اب تو یہ دن آگیا ہے کہ مرکزی حکومت جن مشرقی پاکستانیوں کو یہ سمجھ کر خاص طور سے وہاں متعین کرتی ہے کہ یہ صاحبان بڑے بے تعصب اور بڑے اتحاد پسند ہیں جب وہ چند مہینے مشرقی پاکستان میں گزارتے ہیں اور وہاں پھیلا ہوا جذبات کا سیلاب اُنھیں بھی چھُوتا ہے تو اُن کی گویا آنکھیں ہی بدل جاتی ہیں۔ وہ اوّل تو اس پہلی رفیقانہ فضا کو یاد ہی نہیں کرسکتے جس کے تحت وہ اُن عہدوں پر بھیجے گئے تھے اور اگر انھیں یہ یاد آتی بھی ہے تو وہ زبانِ حال سے یہ کہتے محسوس ہوتے ہیں ـــــ مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ۔

مشرقی پاکستان کے اس طرزِ عمل میں بڑے بڑے سیاسی معنی پڑھے گئے ہیں۔

سہروردی کی گرفتاری اور طلباء کے ہنگاموں کو ایک اور تبدیلی سے ملا کر دیکھنے کی کوشش بھی ہوئی ہے اور وہ تبدیلی ہے امریکی سفیر راؤنٹری کی واپسی کہ جنوب مشرقی ایشیا کے وفاق (سیٹو) کو کمزور پڑتے دیکھ کر، یا اُسے مضبوط بنانے کے لیے، یا پورے پاکستان کی اس وفاق میں دلچسپی کو چین سے حالیہ معاہدوں کی روشنی میں ایک حد تک کم ہو جانے کے امکان کے باعث امریکی حکومت نے یہ سوچا ہو گا کہ اگر مشرقی پاکستان ایک الگ ملک بن جائے تو اسے اپنے دفاع کے لیے سیٹو کا وجود بے حد ضروری محسوس ہو گا۔ اس طرح امریکہ کے لیے ایک کھلا میدان پیدا ہو جائے گا اور مشرقی پاکستان کو اپنی موجودہ مقدار سے کہیں زیادہ امریکی اقتصادی امداد بھی حاصل ہُوا کرے گی۔ اب اس الزام کو دیکھیے جو مرکزی حکومت کی جانب سے سہروردی پر لگایا گیا ہے کہ وہ کسی بیرونی طاقت سے ساز باز کر رہے تھے اور طلباء کو ان کی گرفتاری پر احتجاج کرتے دیکھیے اور راؤنٹری صاحب کو واپس واشنگٹن جاتے۔ مگر میں اس تفسیر کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنی اس بات کو دیتا ہوں کہ مشرقی پاکستان میں جنرل اعظم خاں کس طرح ایک زبردست عوامی ہیرو بنے۔ میرے نزدیک جنرل اعظم اس سلسلے میں خاص قصوروار نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ اُن سے وہی کچھ ہُوا ہے جو ایک دردمند اور مخلص انسان سے ایسے موقعوں پر ہوتا ہے۔ مشرقی پاکستان سے جس طرح وہ رخصت ہوئے ہیں (جس طرح لوگوں نے انھیں رخصت کیا ہے اس سے بحث نہیں) اس سے ظاہر ہے کہ خود انھیں بھی احساس تھا کہ وہ کس حادثے کا شکار ہوئے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ برسوں کی دوستی

اور رفاقت اور وفا پر حرف آگیا ہے لیکن اس معاملے پر ہماری تھوڑی سی سپر بچا لے سے اُس مسئلے پر کچھ روشنی پڑنے کی توقع ہے جس پر آج ہم سوچنے نکلے ہیں یعنی مشرقی پاکستان کا مسئلہ۔ جنرل اعظم مشرقی پاکستان کے اسلی طوفانی اور سیلابی احساس میں بہ گئے کہ مشرقی پاکستان میں کتنی غریبی ہے، کیسی بے چارگی ہے، انھیں مغربی پاکستان کے مقابلے میں وہاں ایسی نچلی سطحیں نظر آئیں جو انسانیت کے لیے کسی طرح روا نہیں اور وہ ترحم کے جذبات سے مغلوب ہو کر اہل مشرقی پاکستان کے ساتھ ہو لیے۔ اس طرح وہاں مغربی پاکستان کے خلاف بھڑکتے ہوئے جذبات کو ہوا ملی۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اعظم خاں یہ سب کچھ کسی ذاتی غرض کے لیے کر رہے تھے، نہیں، وہ تو اپنے خلوص سے مار کھا گئے، ترس کا شکار ہو گئے۔

حالانکہ اس موقع پر دیانت اور حقیقت بینی کی ضرورت تھی، اُس دیانت اور حقیقت بینی کی جو دوسرے کو اعتماد میں لے کر اُس کی کوتاہیوں سے اس طرح پردہ اٹھاتی ہے کہ بُرا بھی محسوس نہیں ہوتا اور اصلاح احوال کی راہ بھی کشادہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ جنرل اعظم یہ کام کر گزرنے کے اہل تھے، انھوں نے مشرقی پاکستان میں اپنے دن رات کے معمول سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالی تھی، اب یہ چاہیے تھا کہ وہ ان لوگوں پر ان کے مسائل کو اس طرح کھولتے کہ انھیں وہ پہلو بھی نظر آ جاتے جو خود انھی کی ہمت کے انتظار میں تھے، خود انھی کے ہاتھوں سنور سکتے تھے۔ لیکن جو حالات نے پیش کیا وہ کچھ اور ہی تھا۔ شاید یہ بات کھل کر ہمارے سامنے اب تک آئی ہی نہ تھی کہ مشرقی پاکستان کا اصل مسئلہ ہے کیا اور اسے کون سلجھا سکتا ہے اور کس موقع پر حالات کو کس رُخ موڑنے کی کوشش ہونی چاہیے۔

۲

جب پاکستان قائم ہوا تو پنجاب کے ساتھ بنگال کی بھی تقسیم عمل میں آئی جو لوگ برعظیم ہند کی سیاسی تاریخ سے واقف ہیں ان کے لیے بنگال کی تقسیم نئی بات نہ تھی۔ اس سے بہت پہلے لارڈ کرزن کے عہد میں بھی بنگال، مشرقی اور مغربی، دو حصوں میں بٹا تھا۔ ڈھاکہ میں کرزن ہال آج بھی اس بات کی یادگار رہے کیونکہ یہ اصل میں مشرقی بنگال اسمبلی کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس موقع پر ہندوؤں کی طرف سے بہت احتجاج ہوا تھا اور یہ تقسیم ختم کر دی گئی تھی۔ اس ایک بات سے پتا چل سکتا ہے کہ بنگال میں ایک بلبے عرصے سے دو الگ الگ کیمپ بنتے ہوتے تھے۔ ایک وہ علاقہ تھا جس کا مرکز کلکتہ تھا یا دوسرے لفظوں میں شہری، مہذب، تعلیم یافتہ اور کاروباری اور صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ علاقہ۔ دوسرا علاقہ مشرقی بنگال تھا جو اَب مشرقی پاکستان ہے اور جو کلکتہ یا مغربی بنگال کے مقابلے میں دیہاتی، غیرمہذب، اَن پڑھ اور کاروباری اور صنعتی لحاظ سے پس ماندہ اور تمام تر زراعتی رقبہ تھا۔ ان دو علاقوں میں حسد اور جلن کا تعلق تھا۔ "کلکتہ" اس تعلق کی سب سے اُجاگر تصویر رہا ہے۔ یہاں یا سارے مغربی بنگال میں مشرقی بنگال کو حقارت اور تحقیر سے دیکھا جاتا تھا — جاہل، گنوار، بھکاری۔ نراد، سی، چودھری کی کتاب "آٹو بائیوگرافی آف این اَن نون انڈین (ایک غیرمعروف ہندوستانی کی آپ بیتی) کا باب: کلکتہ، اس تصویر پر بہت اچھی روشنی ڈالتا ہے کہ ان دو بنگالوں میں ایک دوسرے کے لیے کیسے کیسے جذبات تھے۔ مشرقی بنگال نے ان حالات سے جو کچھ سیکھا وہ اپنی جگہ ایک ردِعمل کی حیثیت رکھتا ہے — اپنے مقابلے میں تمدنی اعتبار سے بہتر لوگوں پر اعتبار نہ

کرنا، انھیں اپنا دشمن سمجھنا۔ مشرقی پاکستان ہی پورے برّعظیم ہند کا وہ خطّہ ہے جو دہشت پسندوں کا سب سے بڑا گڑھ رہا ہے۔ یہیں کمیونزم نے بھی اپنے مضبوط ترین مورچے بنائے رکھے ہیں۔ یہیں نذرالاسلام کی انقلابی شاعری مقبول رہی ہے ورنہ "کلکتہ" میں تو ٹیگور تک اسے خاطر ہی میں نہیں لایا گیا۔ مشرقی پاکستان ہی میں آروبندو گھوش جیسا انقلابی قائد پروان چڑھا جسے اگر روحانی تجربات اور جانب نہ کھینچ لے جاتے تو وہ گاندھی کا سب سے اہم مدِّ مقابل ثابت ہوتا اور مشرقی پاکستان کے ضلع کھلنا ہی نے بابو سبھاش چندر بوس کو جنم دیا تھا جو گاندھی کا ایک اور زبردست حریف تھا اور ملکی سیاست میں جوش و جنون کی علامت یہ انقلابیت یا غور سے دیکھیں تو ردّعمل کی یہ عادت مشرقی پاکستان کے سوچنے سمجھنے والے طبقے (انٹیلی جنسیا) کا وطیرہ چلا آرہا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد جب مشرقی پاکستان میں زرعی اصلاحات کی گئیں تو زمینداروں کا طبقہ جو غلط یا صحیح طور پر دیہاتی جماعتوں کا فطری قائد تھا وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہو گیا جو نامرادی (فرسٹریشن) کا شکار رہتے۔ نامرادی کا یہی احساس ہے جو اب عوام میں بھی گھر بناتا جا رہا ہے، کیونکہ سارا پڑھا لکھا اور کھاتا پیتا طبقہ تو اس کی لپیٹ میں آہی چکا ہے اور زمینداروں کی عوام اور علاقوں سے دلچسپی کم ہو جانے کے بعد ان کی جگہ لینے کے لیے نئی قیادت کوئی اُبھری نہیں۔ لوگ جائیں تو کدھر سوچیں تو کیا؟ طبیعتوں میں ردّعمل، نفرت اور انقلاب کی خُو ہے ہی۔ چنانچہ نتیجہ: ہنگاموں پر ہنگامے۔

مشرقی پاکستان اپنی اس ہنگامہ پسندی پر ناز بھی کرتا ہے۔ اُس کے خیال

ہیں مغربی پاکستان ایک ایسا بند اور بے جان معاشرہ ہے جسے پرواہی نہیں کہ اُس پر حکومت کی جانب سے کیا لاد اجا رہا ہے، اُسے تو بس دولت کمانے کی دُھن ہے خواہ آزادی کا سانس نصیب ہو یا نہ ہو۔ اس الزام میں صداقت بھی ہے لیکن اتنی ہی کہ زندگی میں اطاعت اور انحراف دونوں ضروری ہیں۔ نہ ہر وقت کا انحراف درست ہے نہ اندھی اطاعت۔ مغربی پاکستان یقیناً مشرقی پاکستان سے احتجاج کرنے کا ولولہ مستعار لے اور وقت وقت پر اس سے کام بھی لے لیکن کیا مشرقی پاکستان نے قسم ہی کھائی ہے کہ اطاعت کے اُصول کو کبھی ہاتھ نہیں لگانا۔

پاکستان کے دونوں حصّوں کے مزاج میں بنیادی فرق ہے۔ مغربی پاکستان خصوصاً سرحد اور پنجاب ایسا علاقہ ہے جہاں لوگوں کو صدیوں کے انتشار نے ایک خاص کردار عطا کر دیا ہے۔ اور یہ کردار ایک طرح کی خود اعتمادی اور آزادہ روی یا آنادی سے ہے۔ یہ بات یُوں ہے کہ آئے دن کے حملوں اور بدلتی ہوئی حکومتوں اور جنگوں نے اِس خطّے کی تاریخ کے ساتھ ساتھ یہاں کے لوگوں کو بھی متنوع بنا دیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہاں کے لوگ بہت سے پیشے اپنا چکے ہیں بلکہ یہ بھی کہ ایک ہی شخص اپنے آپ کو وقت وقت پر اس طرح ڈھال لیتا ہے کہ جو پیشہ چاہے اختیار کر لیتا ہے۔ پھر انگریز کے عہد میں مغربی پاکستان خصوصاً پنجاب اور سرحد فوجوں کی بھرتی کا سب سے اہم گڑھ رہے ہیں۔ لاکھوں انسان فوجی خدمات کی انجام دہی کے لیے ملک کے مختلف حصّوں بلکہ عظیم جنگوں کے دوران میں بیرونِ ملک آتے جاتے رہے ہیں۔ اس بات نے ان لوگوں میں اور ان کے ذریعے سے ان کے متعلقین میں بڑی کرداری لچک پیدا کر دی ہے۔ پھر یہ فوجی فتح مند فوجی تھے۔ اس خصوصیت نے

ان میں ایک طرح کا ہمت افزا اعتماد پیدا کر دیا ہے کہ ہم آنے والے حالات سے نبٹ ہی لیں گے، جو ہو سو ہو۔ ان کی اس لچک، اس قبولیت اور اس اطاعت کو وہ لوگ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں جو ان تجربات سے خود نہیں گزرے۔ ان کی ان صفات کو بے ضمیری، بے کرداری اور "ٹوڈیت" کے مترادف گردانا جاتا ہے جیسا کہ مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کو ان خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ اس ضمن میں کسم نائر کی حالیہ کتاب: بلوسمز ان دی ڈسٹ (دھول میں کلیاں) کے بعض حصے بڑے بصیرت افروز ہیں۔ مصنفہ نے بھارت کے تمام علاقوں میں پھر کر اور رہ کر اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں میں اور اُن کے ماحول میں کیا کیا تبدیلیاں ہو رہی ہیں؟ اور ہو رہی ہیں یا نہیں ہو رہیں تو کیوں؟ اُس نے ان پنجابیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے جو پاکستان سے آ کر بھارت میں آباد ہوئے ہیں کہ ان لوگوں نے حیرت انگیز کام کیے ہیں، وہ لوگ جنھوں نے کبھی کھیتی باڑی نہ کی تھی، نہ صرف اُنھوں نے بلکہ اُن کے آبا نے بھی یہ کام نہ کیا تھا، وہ بے حد اچھے کسان ثابت ہو رہے ہیں اور ایسے کسان جنھوں نے کبھی صنعت میں دخل نہ دیا تھا ایسی ایسی صنعتیں کامیابی سے چلا رہے ہیں جو اُن کے علاقے میں پہلے کبھی کسی نے نہ کی تھیں۔ ان کے مقابلے میں بنگال والوں کے بارے میں اُس کا یہ کہنا ہے کہ اُن کی عادتیں بہت راسخ ہیں اور یہ لوگ نئے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈالتے، وہ کام جو اُنھوں نے ہاتھوں سے نہیں کیے اُنھیں کرنے پڑ جائیں تو اپنی تذلیل سمجھتے ہیں خواہ ان میں فائدہ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر اس کرداری فرق کو اہمیت دی جائے تو ایک بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ مغربی پاکستان کی معاشی ترقی میں حکومت کا اتنا ہاتھ نہیں جتنا یہاں کے

باشندوں کی آزادانہ روش کا ہے اور مشرقی پاکستان میں اگر زیادہ ترقی پہلے یا اب نہیں ہوئی تو اس میں خود مشرقی پاکستانیوں کے عادات و اطوار کو بھی بہت دخل ہے۔

اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک اور مسئلے میں بھی رقابت کا احساس اُبھرا ہے۔ یہ ہے عہدوں کا مسئلہ۔ جب پاکستان بنا تو پورے برِّعظیم ہند میں جتنے بھی مسلمان عہدہ دار تھے اُن سے پوچھا گیا تھا کہ وہ پاکستان جائیں گے یا بھارت میں رہیں گے۔ بیشتر لوگوں نے پاکستان جانا چاہا اور ایسے سب لوگ دوسرے مہاجرین کے ساتھ مغربی پاکستان میں آ بسے۔ اب اگر اس طرح مغربی پاکستان میں بسنے والوں کی تعداد عہدوں کے اعتبار سے زیادہ ہے تو اس میں مغربی پاکستان کا کیا قصور ہے؟ ہاں میں یہ مانتا ہوں کہ ایک سلسلے میں مغربی پاکستان کے مہاجر یا غیر مہاجر عہدہ داروں کا دافعی قصور ہے اور وہ یوں کہ جب یہ لوگ مشرقی پاکستان میں تعینات ہو کر شروع شروع میں گئے ہیں تو اُنھوں نے وہاں کے عوام سے رابطہ اور بھائی چارہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، وہاں یہ حضرات بالکل انگریز افسروں کی طرح طنطنہ دکھاتے اور شان جتاتے رہے ہیں، مسلمان عوام کے بجائے کلچر کی تلاش میں امیر کبیر ہندو خاندانوں سے میل جول بڑھانے میں لگے رہے ہیں اور ان کی اس روش نے قدامت پسند لیکن ساتھ ہی "کلکتہ" کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے مشرقی پاکستانیوں کی نفرت کو اپنے حوالے سے مغربی پاکستان بھر کے خلاف بھڑکانے میں حصّہ لیا ہے، وہی نفرت جو طنطنہ دکھانے اور شان جتانے والے مغربی بنگال کے لیے وقف رہتی تھی اب اس کا رُخ بڑی آسانی سے مغربی پاکستان کی جانب پھر گیا۔

پاکستان بنا تو تین اہم عناصر ایسے تھے جن کے رشتے میں ملک کے یہ دونوں

باز و مربوط تھے۔ سب سے پہلا عنصر تھا اسلام۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا اور اس کا مقصد یہ بتایا جاتا تھا کہ جب ایک الگ اور آزاد خطۂ زمین مسلمانوں کے زیر اثر آجائے گا تو وہاں اسلام کے قانون کی حکومت ہوگی۔ ہُوا یہ کہ اس دعوے کی ہماری منافق نسلوں کے ہاتھوں خوب مٹی پلید ہُوئی اور پچھلے پندرہ سال میں اس دعوے نے نامراد پھیلانے کے سوا کچھ نہ کیا۔ نہ کسی کو اس کا اندازہ تھا کہ دورِ حاضر میں اسلام کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اور نہ کسی کے دل میں یہ نیت تھی کہ اسلام کو آگے آنے دیا جائے۔ بس نام لینے میں ضرور ایک سے ایک آگے تھا، مغربی پاکستانی ہو یا مشرقی۔ جو لوگ برسرِ اقتدار آتے رہے ان کی تعلیم اور تجربہ مغربی تہذیب سے اس طرح بندھا تھا کہ وہ اسلام کا نام لینے سے زیادہ اس کی کوئی خدمت کر ہی نہیں سکتے تھے۔

دوسرا عنصر تھا قیادت۔ پاکستان کے بانی قائدِ اعظم محمد علی جناح نہ مشرقی پاکستان کے رہنے والے تھے، نہ مغربی پاکستان کے۔ وہ پیدا بے شک کراچی میں ہوئے تھے لیکن ان کا تعلق بمبئی سے تھا۔ اُن کا سیاسی مرتبہ برِ عظیم ہند میں ایسا بلند تھا کہ مسلمان تو ایک طرف وہ پورے ہندوستان کے ایک عظیم ترین قائد تھے۔ اُن کی قیادت میں مُلک کے یہ دونوں حصّے یہ احساس رکھ سکتے تھے کہ ملک کی باگ ڈور ایسے ہاتھوں میں ہے جو عصبیت اور علاقائیت سے بہت بالا ہیں۔ جب قائدِ اعظم خُدا کو پیارے ہوگئے تو کوئی بھی رہنما ایسا قدآور نہ تھا کہ اسے پُورا ملک اپنے قائد کی حیثیت سے قبول کرتا بلکہ یُوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پس ماندگان میں کسی کو یہ توفیق نہ ہُوئی کہ وہ ملک کے دونوں حصوں کو کوئی ایسی راہ دکھاتا جس پر چلتے ہوئے انھیں عصبیت اور علاقائیت میں ڈوبنے کی فرصت یا موقع ہی نہ ملتا۔

تیسرا عنصر تھا زبان۔ قیام پاکستان سے پہلے جب ہندوؤں کے مقابلے میں ایک الگ قوم ہونے کا دعویٰ کیا جاتا تھا تو اسلام کے قوانین اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ ایک مشترکہ قومی زبان کا نام بھی بدنام کیا جاتا تھا اور وہ تھی اُردو زبان۔ اس دعوے نے ہندوؤں کو تو اُردو سے برگشتہ کیا ہی، بعد میں پاکستان کے دونوں حصّوں کو بھی ایک دُوسرے سے دُور ہٹانے میں حصّہ لیا جب ملک میں نمائندہ قیادت نہ رہی اور اسلام کا کہیں دُور دُور سایہ بھی نظر نہ آیا تو لوگوں نے قومی مسائل سے نگاہیں پھیر کر اپنے علاقائی اور عصبی رجحانات میں کھو جانا ہی مناسب سمجھا۔ جب ہر دوسرے معاملے میں اپنی الگ حیثیت منوانے پر زور دیا جانے لگا تو زبان کے مسئلے نے بھی سر اُٹھایا۔" مغربی پاکستان والے بے شک اپنی اپنی بولیوں سے دامن چھڑا لیں لیکن مشرقی پاکستان والے تو اپنی بولی: بنگلہ ہی بولیں گے" اب یہ عالم ہے کہ مشرقی پاکستان میں اُردو بول کر آپ راستہ بھی دریافت نہیں کر سکتے، کوئی جواب ہی نہیں دے گا۔ اُردو جو کبھی قُرب کا سامان تھی اب دُوری کا نشان بن گئی ہے۔

۳

کیا ہمارے مسئلے کا یہ حل ہے کہ آبادی کے تناسب سے عُہدے اور نشستیں بانٹ لی جایا کریں؟

اگر اکثریت ہی کی بنا پر سب فیصلے ہونے چاہئیں تو پھر آخر ایک زراعتی ملک میں اس بات کا اہتمام کیوں نہیں کیا جاتا کہ عہدوں اور نشستوں پر اسی فی صد لوگ زراعت پیشہ طبقے سے تعلق رکھنے والے فائز ہوں۔ اسی طرح اس ملک میں اگر صرف

بندرہ فی صد پڑھے لکھے لوگ ہیں تو انھیں یہ حق کیوں دے دیا جائے کہ وہ باقی پچاسی فی صد ان پڑھوں کے حصے کے عہدوں اور نشستوں پر بھی قابض ہوں۔ ملکی معاملات میں اکثریت آخری قدر نہیں ٹھہر سکتی۔ مغربی پاکستان میں پنجاب کو جو حیثیت حاصل ہے وہ سب کے سامنے ہے لیکن وَن یونٹ کے سلسلے میں اسے کہاں کہاں اپنی اکثریت کی بنا پر حاصل حقوق سے دست بردار نہیں ہونا پڑا۔ تقریباً ہر جگہ پر اسے ساٹھ کے بجائے چالیس فی صد پر راضی ہونا پڑا ہے کس لیے، محض اس لیے کہ مغربی پاکستان کے وہ پس ماندہ علاقے جو پنجاب کی نسبت ترقی کے زیادہ محتاج ہیں انھیں ترقی کرنے کے زیادہ مواقع حاصل ہوں۔ یہی وہ جذبہ ہے جس سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اگر مشرقی پاکستان میں زیادہ غریبی ہے، اسے زیادہ ترقی کی ضرورت ہے تو ضرور وہاں زیادہ رقم خرچ کرنی چاہیے لیکن یہ مسئلہ اگر محض اکثریت کی بنا پر حل کیا جائے گا تو بہت سے علاقے ترقی و اختیارات میں بالکل پیچھے رہ جائیں گے۔ پھر اس ضمن میں یہ بات ہرگز نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ نری زیادہ سرمایہ کاری یا زیادہ عہدوں اور نشستوں سے ترقی وجود میں نہیں آجایا کرتی۔ جب تک مشرقی پاکستان میں بدلے ہوئے حالات کے مطابق بدلنے اور نت نئے کاموں کو انجام دینے کی صلاحیت اور خواہش نہیں ابھرتی، ترقی کی کیا اُمید کی جاسکتی ہے۔ اگر وہاں کے عوام ہزار ہا کاموں کو ذلیل اور گھٹیا سمجھیں گے یا اگر وہاں کے زمیندار، سرمایہ دار اور دانشور نامرادی کے احساس میں جکڑے رہیں گے اور ردِ عمل ہی ان کا طرزِ عمل رہے گا، ان میں اطاعت کے اصُول کو جڑ پکڑنے کا موقع نہیں ملے گا تو پھر وہاں ایسے حالات کیونکر پیدا

ہو سکتے ہیں کہ ترقی کی رفتار قائم ہو اور بڑھتی چلی جائے۔

مشہور ماہر اقتصادیات پروفیسر جان گالبریتھ (مصنف: انلوائنٹ سوسائٹی، سابق امریکی سفیر: بھارت) نے پچھلے دنوں اپنے ایک اہم مضمون: اقتصادی امداد کا مثبت راستہ (فارن افیئرز: اپریل ۱۹۶۱ء) میں پسماندہ ممالک کی ترقی کے بارے میں چند نہایت اہم نکات پر بحث کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک زیادہ پسماندہ علاقوں میں چند بنیادی سہولتیں مہیا نہ کی جائیں گی وہاں سرمایہ کاری بیکار جائے گی۔ سب سے پہلے تو تعلیم عام ہونی چاہیئے تاکہ لوگوں میں معاملات کو سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو اور ان کی وہ عادتیں جو انہیں آگے بڑھ کر بدلتے ہوئے وقت کا ساتھ دینے سے روکتی ہیں وہ ٹوٹ جائیں۔ پھر ملک میں ایک طرح کے سیاسی امن وامان یا سلامتی کی فضا بھی بہت ضروری ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ جب تک اقتصادی ترقی کا فائدہ براہِ راست عوام کو نہیں ہوتا وہ کیسے اس میں اپنی دلچسپی کو مسلسل قائم رکھ سکتے ہیں — چند ہی مہینوں میں وہ نامرادی کے احساس کا شکار ہو جائیں گے۔ اگرچہ پروفیسر گالبریتھ نے پاکستان کی مجموعی ترقی سے متاثر ہو کر اسے اس بنیادی سہولتوں کے اُصول کا پابند نہیں گردانا لیکن جہاں تک مشرقی پاکستان کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ اُصول ہر طرح سے اہمیت رکھتا ہے۔ اگر وہاں حکومت یا بڑے بڑے سرمایہ داروں کی طرف سے بڑے بڑے کارخانے قائم کر کے یہ سمجھ لیا گیا کہ قومی آمدنی میں چونکہ بہت اضافہ ہو گیا ہے لہٰذا اللہ اللہ خیر سلا تو یہ پالیسی یقیناً غیر حقیقی اور غلط ہو گی اور اس کا نتیجہ کچھ بہتر نہ نکلے گا کیونکہ عوام جو زراعت سے منسلک ہیں انھیں براہِ راست فائدہ نہ پہنچے گا۔ بالآخر تو

فائدہ سب کو پہنچتا ہی ہے لیکن اگر بیچ میں بہت لمبا وقفہ پڑے تو ایک ایسا طبقہ جو پہلے ہی بے صبری کا شکار ہے اس کے لیے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا بہت آسان ہو جاتا ہے، خصوصاً جب ہنگامہ آرائی کو ایک قدر سمجھا جاتا ہو۔

تو پھر ہمارے اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ تجزیاتی سطح پر تین باتیں سامنے آتی ہیں:

ایک بات یہ ہے کہ ملک کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں رہنی چاہیے جو صوبائیت اور عصبیت سے بالا ہوں تاکہ اُن کی مرکزی حیثیت ملک کے دونوں حصوں کو قومی معاملات پر توجہ دینے پر مائل رکھے۔ ورنہ یہ فطری بات ہے کہ دونوں حصے اپنی اپنی جغرافیائی حدوں میں قلعہ بند ہو کر اپنے اپنے اغراض و مقاصد کے حصول میں جُٹ جائیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستانیوں کو ایک دوسرے کے وجود اور ضروریات سے آنکھیں بند کرنے کے بجائے حقیقت کو، خواہ وہ تلخ ترین ہو، قبول کرنا سیکھنا چاہیے تاکہ وہ کسی ایسے مہیب حادثے کی لپیٹ میں نہ آجائیں جو انھیں خواہ مخواہ جُدا کر دے۔

تیسری بات یہ ہے کہ مشرقی پاکستانیوں کو یہ بات جان لینی چاہیے کہ خُدا بھی اسی قوم کی حالت بدلتا ہے جو خود اپنے حالات بدلنے کی کوشش کرے۔ مرکزی یا صوبائی حکومت کتنی ہی ہمدرد ہو جب تک مشرقی پاکستانیوں کا کرداری جمود برقرار ہے کوئی ترقیاتی معجزہ رونما نہیں ہو سکتا۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کا رشتہ تو زوجین کا رشتہ ہونا چاہیے ــــ وہ

رشتہ جس میں متعلق ہو کر فریقین میں ایسا توازن پیدا ہو جاتا ہے جیسا لارنس کی زبان میں ستاروں کے درمیان ہے، وہ رشتہ جو میاں بیوی یا دوستوں یا محبت کرنے والوں کے درمیان ہوتا ہے، وہ رشتہ جسے پنجاب کے لوگ اپنی اس بولی میں کھولتے ہیں ــــ " تیری میری اک جندڑی تینوں تاپ چڑھے میں ہونگاں" توازن کے اس رشتے میں کیا کھو یا کیا پایا کا حساب و جمع دو کے انداز سے نہیں ہوتا، جب ایک کو ضرورت ہوتی ہے تو دوسرے کی زندگی کا یہی حاصل ہوتا ہے کہ اس کی ضرورت پوری کرے۔ جس طرح وہی گھر اور وہی تعلق صحیح معنی میں زندہ ہوتا ہے جہاں آزادی کے ساتھ ہم آہنگی بھی کارفرما ہو اسی طرح اگر ہم بھی چاہتے ہیں کہ زندگی میں ساتھ ساتھ چلیں تو آزادی اور ہم آہنگی کی تلاش ہمارا مقصد ٹھہرنا چاہیے۔ آزادی اس طرح اُبھرے گی کہ ہم اپنے دامن کی گرد دوسرے کے چہرے پر جھاڑنے کے بجائے اپنے گریبان میں جھانکیں، اپنی کرداری خامیوں کی اصلاح کریں اور یوں جذباتی طور سے اپنے قدموں پر کھڑے ہوں۔ صرف یہی جذباتی استقامت مثبت یا آزاد طرزِ عمل کو جنم دے سکتی ہے۔ ہم آہنگی تب اُبھرے گی اگر ہم محض اپنی ذات پر ساری توجہ مرکوز رکھنے کے بجائے ملکی سطح پر سوچیں۔ ہمسائے یا رفیق یا دوسرے بازو کی ضروریات کو بھی اہمیت دیں، اس کے وجود کو دل میں تسلیم کریں۔

باتیں تو ہم پورے عالمِ اسلام کی وحدت کی بھی کرتے ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ ایک ملک کے دو بازو بھی مل کر آزادی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے ہم آہنگ نہیں ہو رہے۔

ترکیب

یہاں تک میرا کام آسان تھا۔ لیکن میں اس کام کو یہیں چھوڑ دوں تو اس کی صورت یہ بنے گی کہ ایک معاملے کو الٹ پلٹ کر پھر وہیں کا وہیں رکھ دیا گیا ہے۔ یہ گھپلا تو خیر غلط ہے ہی کہ جس زاویے سے اس مسئلے کا میں کوئی ترکیبی حل پیش کروں گا وہ لازماً حرفِ آخر ہوگا لیکن یہ بھی درست و جائز نہ ہوگا کہ میں اس اُلجھے ہوئے مسئلے کی کڑیوں کو کسی ڈھب سے بھی جوڑ کر نہ دکھاؤں ۔۔۔ کسی ایسی ترکیب کی جھلک نہ پیش کروں جو اس مسئلے کے سلجھاؤ کے لیے ایک طرح کا نقطۂ آغاز بن سکے ۔۔۔ ایک وحدانی زندگی کی خشتِ اوّل ثابت ہو سکے۔

میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں زوجین کا رشتہ ہونا چاہیے۔ قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق کائنات کی قوتوں اور چیزوں میں باہم زوجین کا رشتہ کارفرما ہے اور اسی رشتے کے وجود میں قانونِ فطرت یا خدائی قوانین پنپ سکتے ہیں۔ جب یہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، جب قوتوں اور چیزوں کے درمیان آزاد اور ہم آہنگ توازن ٹوٹ جاتا ہے تو وہ گویا صراطِ مستقیم سے ہٹ کر گمراہی میں پڑ جاتی ہیں۔ زوجین کے رشتے کی عظیم ترین مثال عورت اور مرد کا تعلق ہے۔ خدا نے اس انتہائی گہرے تعلق کو کھیتی کی مثل سے سمجھایا ہے ۔۔۔ تمھاری عورتیں تمھاری کھیتی ہیں۔ لیکن ہم نے کبھی کھیتی کی اہمیت کو محسوس کرنے اور اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ پاکستان ایک زراعتی ملک ہے۔ یہاں کے اسی فی صد باشندے کھیتی باڑی کرتے ہیں لیکن ہمیں اپنی کھیتی ذرا بھی عزیز نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں کھیتی کو خدا بنا لینا چاہیے لیکن یہ بھی تو نہیں کہ

ایک چیز کی جائز قدر و منزلت نہ کی جائے۔

پچھلے کئی سالوں سے ہم، اور جب سے صنعتی انقلاب نے مغرب سے نکل کر مشرق پر دھاوا بولا ہے دُنیا کا بیشتر حصّہ زراعت کی اہمیت سے غافل رہنے کی حماقت کر رہا ہے۔ ہمارے جیسے غریب ملک توانی جگہ رہے روس جیسی آمریت اور امریکہ جیسی جمہوریت بھی زراعت کے مسئلے میں مطمئن نہیں، وہاں بھی ابھی تک زراعت کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ روس جتنی پیداوار چاہتا ہے اسے حاصل نہیں ہو رہی اور امریکہ میں وافر پیداوار کے باوجود زراعت پیشہ لوگ نامرادی کے احساس کا شکار ہیں۔ اصل میں حالیہ تاریخ میں معاشرتی ترقی کے لیے صنعت کے وجود کو جس طرح بڑھا چڑھا کر اہمیت دی گئی ہے اُس سے زراعت ایک طرح سے پسماندگی کی علامت بن گئی ہے۔ اس طرح یہ ہوا ہے کہ صنعت کو اکثر معاشروں میں اُگنے کی مُہلت دینے کے بجائے مسلّط کر دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ ہوا ہے کہ شہری اور دیہاتی زندگی میں بے تحاشا تفریق ابھر آئی ہے۔ اب شہر زندگی کا نشان سمجھے جانے لگے ہیں۔ زندگی کے تمام تر لطف کا مرکز اب شہر بن گئے ہیں۔ گاؤں والے شہروں کی جانب یوں دیکھنے لگے ہیں جیسے وہ ایک ایسی جنّت ہیں جو ان پر بند ہے۔ شہروں میں آزادی ہے، وہاں دلچسپیاں ہیں، وہاں عیش و تفریح کا سامان ہے۔ ادھر گاؤں میں قدامت پسندی ہے، یہاں کا رہنا سہنا، یہاں کے مزے فرسودہ ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو گاؤں میں پیدا ہوتے ہیں جب پڑھ لکھ جاتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ شہروں میں آباد ہوں، بے شک وہاں ان کی خاص عزّت بھی نہ ہو، وہاں اُنھیں زیادہ مالی فائدہ بھی نہ ہو لیکن وہ شہر کی آزادانہ فضا کو گاؤں کی

گھٹن پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ گاؤں سے بھی کٹ جاتے ہیں اور شہروں میں کاروباری طبقوں کو دولت سمیٹتے دیکھ کر اور خود اس سے محروم رہتے ہوئے نامرادی کے بے مہر ہاتھوں میں جکڑے چلے جاتے ہیں۔

یہی کچھ مشرقی پاکستان میں ہوا ہے۔ سونے پر سہاگہ کہ زرعی اصلاحات نے اس زمیندار طبقے کی جڑیں بھی گاؤں سے اکھاڑدی ہیں جو اپنے اغراض کے لیے ہی سہی دیہات میں بسا ہوا تھا اور گاؤں والے اس کی وجہ سے کچھ نہ کچھ اپنی جگہ مستقیم تھے۔ اب یہ طبقہ بھی شہری زندگی کی تلاش میں ہے اور گاؤں کے عام آدمی بھی گاؤں کی زندگی سے مایوس ہونے لگے ہیں۔ آخر وہ کیوں نہ شہروں کی روشنیوں سے آنکھیں سینکیں لیکن شہری اور دیہاتی زندگی کی تفریق سارا کھیل بگاڑ دیتی ہے۔ گاؤں میں زندگی نامیاتی ORGANIC ہے، یہاں زندگی کے مشاغل کا ایک دوسرے سے تعلق ہے اور چیزیں آہستہ آہستہ بتدریج تکمیل کو پہنچتی ہیں۔ شہر میں زندگی تکراری یا مشینی MECHANICAL ہے، یہاں روزمرہ کاموں کی مسلسل تکرار ہے، یہاں انسان کسی مشین کی ایک کل ہے، جو کچھ وہ بناتا ہے ضروری نہیں کہ وہ اسے خود بھی استعمال کرے یا یہ بھی جانتا ہو کہ اسے کون لوگ کس طرح استعمال کریں گے۔ شہروں میں اُن دیہاتیوں کی گنجائش نہیں جن کی عادتیں راسخ ہو چکی ہیں اور جنھیں مشینی کاموں کی مہارت نہیں۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ لہٰذا: نامرادی۔

ہمارے یہاں ایک بڑا کھپلا ہے۔ ہم چونکہ ابھی تک یہ طے نہیں کر سکے کہ ہمیں زندگی کن اصولوں کے تحت گزارنی ہے اس لیے ہماری زندگی کے مختلف شعبوں میں کوئی ربط نہیں۔ کسی شعبے میں ہم ایک اصول کے تحت کچھ تبدیلیاں برپا کرنا چاہتے

ہیں تو کسی میں بالکل ایسا اُصول اپنا لینے میں عار نہیں سمجھتے جو پہلے اُصول سے کچھ بھی تعلق نہ رکھتا ہو۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک اسلام کا نام لینے کے باوجود ہم نے اسلام کی روشنی کے آگے بے نیتی اور بے علمی کی بہت سی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی کے مختلف شعبے متضاد نظریوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ ہم اپنے سیاسی ڈھانچے کو بدل دیتے ہیں کہ یہ ہمارے حالات اور ہمارے لوگوں کے مزاج سے لگا نہیں کھاتا لیکن بعض دوسرے شعبوں خصوصاً اقتصادی میدان کے بارے میں یہ بالکل نہیں سوچتے کہ اس میں بھی کسی ایسی تبدیلی کی گنجائش ہے جس کی مدد سے یہ اتنا کھٹک نہ رہے اور ہمارے لوگوں کے مزاج سے ہم آہنگ ہو جائے۔ پھر کسی ایک اقتصادی معاملے میں تو فیصلہ کرتے ہیں کہ زراعت کی ابتری میں بڑی بڑی زمینداریوں کا ہاتھ ہے لہٰذا زرعی اصلاحات نافذ کر دی جائیں لیکن دوسری طرف ایک اور اقتصادی مسئلے میں ہمارا طرزِ عمل یہ ہے کہ صنعت کے سلسلے میں بڑی بڑی اجارہ داریاں اپنے ہاتھوں سے قائم کرتے چلے جا رہے ہیں۔

مشرقی پاکستان (اور بڑی حد تک مغربی پاکستان بھی) جس نامرادی کا شکار ہے اس کے پیچھے ہماری یہ دوعملی پالیسی بہت اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ ہمارا تو اس ضمن میں یہ مسلک ہونا چاہیے کہ ہماری زندگی کے مختلف شعبے باہم دگر چین کی طرح پرورش و ترقی پائیں۔ اگر صنعت اور زراعت ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر بھی چل سکتی ہیں تو کیوں نہ چلیں۔ صنعت کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن کیا صنعت کے عروج کا مطلب لازماً یہی ہونا چاہیے کہ زراعت کا زوال ہو۔ صنعت کیلئے

مشرقی پاکستان کا مسئلہ حل نہیں کر سکتی۔ مشرقی پاکستان کی روز افزوں آبادی اور زراعتی زمین کی شدید کمی اس بات کی متقاضی ہے کہ ایسے پیشے سامنے آئیں یا لائے جائیں جو زراعت پیشہ اکثریت کو بے جڑ کیے بغیر، انھیں دیہات سے اکھاڑے بغیر انھیں قبول بھی ہوں اور ان کے لیے مفید بھی ہوں اور جن میں اس قدر وسعت ہو کہ اتنی بے تحاشا آبادی ان میں کھپ جائے۔ کروڑوں روپے سے لگنے والا ایک کارخانہ زیادہ سے زیادہ ایک ہزار آدمیوں کو ملازمت دے سکتا ہے اور وہ بھی ایسے لوگوں کو جو نامیاتی کے بجائے مشینی زندگی گزارنے کی اعصابی سکت رکھتے ہوں اور مختلف مشینی مہارتوں کے حامل ہوں۔ اس کے برعکس اگر ہم چھوٹی صنعتوں کو، اور زراعت بھی اپنی جگہ ایک صنعت ہے، یہ موقع دیں کہ وہ گاؤں گاؤں پھیل جائیں تو اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ گاؤں والوں کو اپنے روایتی کاموں کے ساتھ ساتھ نئے رجحانات کو ہضم کرنا بھی آ جائے گا اور وہ ایک دم ایک سطح یا طرز زندگی سے کٹ کر کسی دوسرے متضاد اسلوب کو اپنانے میں جو ذہنی اور اعصابی دقتیں اور الجھنیں پیدا ہوتی ہیں ان سے بھی محفوظ رہیں گے۔ چھوٹی صنعتیں ہی آبادی کو کھپا سکتی ہیں اور انھی میں یہ صفت ہے کہ زراعت پیشہ آبادی انھیں بآسانی اپنا لے۔ یہ پرانی زندگی کے بہترین عناصر کو قائم رکھنے اور نئی زندگی کے قریب لانے کا مؤثر ترین ذریعہ بنائی جا سکتی ہیں۔

چھوٹی صنعتیں بے شک ہماری اقتصادی زندگی کی معراج نہ ٹھہریں اور ہم بھاری صنعتوں کے قیام کو ضرور عمل میں لائیں، بات جو ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ زندگی کے وہ ڈھنگ جو لوگوں پر مسلط کیے جائیں اور جن کی جڑیں نہ ہوں

وہ نامرادی کا احساس پھیلاتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ربط پیدا کریں اور جو لوگ جن شعبوں میں بہتر کام کر سکتے ہیں انھیں ان شعبوں کی معنویت اور اہمیت کا احساس دلائیں۔ اگر زراعت ہمارے لیے ضروری ہے تو زراعت پیشہ لوگوں کی ضروریات کا ہمیں خیال کرنا ہوگا۔ کیوں نہ ہم گاؤں گاؤں وہ سہولتیں اور تفریحات بہم پہنچائیں جن کی وجہ سے اب گاؤں والے شہر کی زندگی کو ترسی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ کیوں نہ ہم فیکٹریوں کے ساتھ ساتھ سکولوں، کالجوں بلکہ یونیورسٹیوں کو عین دیہاتی علاقوں میں قائم کریں تاکہ ان میں تعلیم پانے والے نوجوان دیہات سے کٹ کر نہ تو دیہات کو اپنی خدمات سے محروم کریں اور نہ خود شہروں میں محض آزادی و تفریح کے لالچ میں دھکے کھائیں۔ کیوں نہ ہم دیہات میں بھی کھیلوں اور تماشوں کا سامان مہیا کریں اور سب سے بڑھ کر اپنی قومی زندگی میں جہاں ہم ادیبوں، فنکاروں، تکنیکی ماہروں، سرکاری افسروں، سماجی کارکنوں کی عزت افزائی کرتے ہیں وہاں زراعت پیشہ اکثریت عظیم کے بہت سے ایسے افراد کو بھی کیوں نہ انعامات اور اعزازات سے نوازیں جو ہر سال زراعت اور دیہاتی زندگی کے مختلف معاملات میں سوجھ بوجھ، محنت کارکردگی اور اختراع کا ثبوت دیتے ہیں۔ اچھے کاشت کاروں کو زراعت کے نئے طریقے سیکھنے کیلیے دوسرے ملکوں میں بھیجنے کا بندوبست بھی ہونا چاہیے۔ اس سے بڑی حماقت کیا ہو سکتی ہے کہ ہم نئی زندگی یا نئی منزلوں کے کھوج میں اپنے موجودہ ذرائع کو پامال کر دیں۔ زراعت ہمارا سرمایہ ہے اور ہمیں سوچنا چاہیے کہ اس سے متعلقہ عوام کی صلاحیتوں سے ہم قومی زندگی میں ربط اور طاقت پیدا کرنے کے لیے کیا

کام لے سکتے ہیں۔ ہماری زراعت جو اب پسماندگی کی علامت ہے ہماری تخلیقی کوششوں سے صنعتی اور معاشی ترقی کے لیے بہترین پلیٹ فارم بن سکتی ہے۔ سوال تو یہی ہے کہ زراعت پیشہ عوام کے اعتماد نفس کو ٹھیس نہ پہنچائی جائے اور ان کے نامیاتی طرز زندگی کو صنعت سے اس طرح بتدریج آشنا کیا جائے کہ صنعت زراعت کی رفیق بن جائے نہ کہ رقیب۔

صنعت کے سلسلے میں اور شہری زندگی کے سلسلے میں بھی ہمیں ایک بات کو مدِ نظر رکھنا ہوگا۔ جب انسان ایسے کام کرتا ہے جو مشینی ہوتے ہیں تو اس کا ان کاموں سے دلی تعلق ختم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسے یہ پتا نہیں ہوتا کہ کسی مشین کے جس پرزے کو وہ ہر روز ہزاروں مرتبہ چلاتا یا بناتا ہے وہ کس کام آتا ہے اور یوں وہ ایک طرح کی سنگدلی یا بے تعلقی کی عادت پختہ کرتا چلا جاتا ہے۔ مزدوروں اور کسانوں بلکہ تمام ترافراد کو جب تک یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں اس سے ان کے ساتھ ساتھ ان کے کن کن ہم وطنوں کا کس کس طرح تعلق ہے اس وقت تک ان کے کام کی معنویت ان پر نہیں کھلتی، ان کے کام کی تقدیس ان پر واضح نہیں ہوتی۔ مختلف پیشوں کو بے ہوا بند کروں میں قید رکھنے کے بجائے ہمیں چاہیے کہ انھیں شفاف چار دیواریاں عطا کریں کہ ان شیشے کی دیواروں میں سے ہر کارکن یہ دیکھ رہا ہو کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اور جو کچھ دوسرے کرتے ہیں ان کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ مزدوروں کو کسانوں کے کام کا علم ہونا چاہیے۔ کسانوں کو دست کاروں سے لے کر ہماری صنعتوں کے کارکنوں تک کے کام کی نوعیت اور معنویت کا احساس رہنا چاہیے۔

یہی معاملہ دانشوروں (اینٹلی جینسیا) کا ہے عقل کا استعمال اپنی جگہ تجزیاتی اندازِ نظر پیدا کرتا ہے۔ چیزوں کو سمجھنے کے لیے انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے دیکھنا پڑتا ہے۔ اس اندازِ نظر کا نقصان وہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقیقت حال اپنے پورے منظر میں ان لوگوں کے سامنے نہیں رہتی جو لوگوں کی عقلی سطح پر رہنمائی کرتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ تجزیاتی اندازِ نظر جو بنیادی طور پر مشینی اندازِ نظر کے قریب ہے دانشوروں کی ہمدردی کو ورکروں یا مزدوروں پر مرکوز کر دیتا ہے کیونکہ دونوں کا طرزِ عمل کسانوں کے برعکس غیر نامیاتی ہوتا ہے مشینی طرزِ عمل یا تجزیاتی اندازِ نظر چونکہ تکرار کی کیفیت کا حامل ہوتا ہے اس لیے اس سے تھکن اور اکتاہٹ کا پیدا ہونا فطری ہے لہٰذا انقلاب کا نعرہ لگایا جاتا ہے لیکن یہ انقلاب چونکہ ورکروں یا مزدوروں کے ذریعے برپا کیا جاتا ہے اس لیے اس کا نتیجہ پھر مشینی زندگی ہی نکلتا ہے اور ایک مرتبہ پھر وہی تکرار اور تھکن اور اکتاہٹ۔ جب تک دانشوروں کا طرزِ عمل تجزیاتی رہے گا وہ ورکروں پر تکیہ کرتے رہیں گے اور کسانوں کو نظر انداز۔ اس کا یہی حل ہے کہ ان تینوں گروہوں کو آس پاس بسنے اور ایک دوسرے کو اور ایک دوسرے کے کام کی معنویت کو سمجھنے کا موقع مہیا کرنا چاہیے۔ کھیت، فیکٹری اور مدرسے کا نکاح بڑا ہی ضروری ہے۔

جس طرح میاں بیوی یا محبت کرنے والے باہم مل کر جو کچھ پیدا کرتے ہیں اس میں تقدس اور سرور کی کیفیت ہوتی ہے۔ اسی طرح جب تک مشرقی پاکستان یا مغربی پاکستان یا کہیں کے بھی مزدور اور کسان اور دانشور یہ محسوس نہیں کرتے کہ جو کچھ مل جل کر وہ پیدا کرتے ہیں اس میں لطف ہے اور وہ مقدس ہے اس وقت تک

کہیں بھی کوئی سچی زندگی پیدا نہیں ہو سکتی اور مشرقی پاکستان میں تو خصوصاً۔

اور جب تک مشرقی پاکستان کی اپنی علاقائی وحدت کے اندر زندگی کے مختلف شعبوں میں ربط پیدا نہیں ہوتا اس وقت تک یہ اُمید عبث ہے کہ وہ صحیح الدماغی سے پُورے پاکستان کے بارے میں سوچ سمجھ سکے اور کوئی صحت مند طرزِ عمل اختیار کر سکے اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے لائحہ عمل کو بھی متشکل ہونے کا موقع ملتا ہے —— اگر ہم مشرقی پاکستان سے رفاقت کی توقع رکھتے ہیں تو ہمیں اس کی ترقی و تعمیر میں دل و جان سے حصّہ لینا چاہیے۔ صرف اسی طرح پُورا پاکستان آگے بڑھ سکتا ہے۔

پاکستان اور خُدا کا خوف

اسلامی قانون کی پہلی شرط

اگر ہم حیاتِ انسانی کے موجودہ منظر پر ذرا گہری نظر ڈالیں تو اس انتشارِ عظیم میں ہمیں ایک کچی رسی اپنے قریب ہی دکھائی دے جائے گی جس میں دورِ حاضر کے تمام عناصر کسی نہ کسی رنگ سے جکڑے ملیں گے۔ یہ رسی محض دیکھنے میں کچی ہے ورنہ اربوں انسانوں، سیکڑوں مُلکوں اور اس بھری دنیا کے عمیق و رفیع مسائل کے بوجھ سے کب کی ٹوٹ چکی ہوتی۔ نہیں، یہ خدا کی وہ رسی نہیں جسے مضبوطی کے ساتھ تھامنے کا ہمیں حکم تھا کہ اُسی کے رشتے سے انسانیت پارہ پارہ ہونے کے بجائے ایک رہ سکتی تھی اور اُسی کے طفیل دلوں میں اُلفت اور دشمنوں میں بھائی چارہ پیدا ہو سکتا تھا (آل عمران — ۱۰۳) ہم نے تو اُس رسی کو مقدس سمجھ کر طاق پر رکھ دیا تھا۔ ہم تو اب اُسی آگ کے گڑھے کے مُنہ پر کھڑے ہیں جس سے خدا ہمیں بچانا چاہتا تھا۔ ہم ماشاء اللہ صاحبِ ارادہ و اختیار لوگ ہیں، اپنی راہ آپ ڈھونڈنی پسند کرتے ہیں — ہاں، تو یہ رسی خُدا کی رسی نہیں، ہمارے اپنے ہاتھوں کی بٹی ہوئی رسی ہے جس سے ہم نے اپنے اور اپنی زندگی کے ہر شعبے کے گلے میں پھندا ڈال رکھا ہے — یہ خوف کی رسی ہے جس نے ہماری جانوں، ہماری معاشرت، ہماری قومی اور بین الاقوامی زندگی کو باندھ رکھا ہے۔

خوف، چاروں طرف، اُوپر اور نیچے، ہر انسانی چہرے اور ہر انسانی دل میں خوف کے اندھیروں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ خوف ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے، خوف ہماری غذا ہے، خوف وہ تحفہ ہے جو ہم دوستوں کو پیش کرتے ہیں، خوف وہ دھمکی ہے جو دشمنوں کو دی جاتی ہے، خوف ہماری زندگی ہے، خوف ہمارا خُدا ہے۔

انسانی زندگی اپنے ہر رُوپ میں آدم کے دو بیٹوں کی مثال بن کر رہ گئی ہے جنھیں ایک دوسرے سے جان اور مرتبے کا خطرہ لاحق ہے۔ مشرق کو مغرب کا خوف ہے، مغرب مشرق کے اُبھار سے لرز رہا ہے۔ امریکہ کو روس کا خوف ہے، روس کا ہر قدم امریکہ کے مقابلے میں برتری جتانے کی کوشش ہے۔ کیمونزم کو جمہوریت کا خوف ہے، جمہوریت کیمونزم کے "جھوٹے خدا" کو ڈھانے پر کمربستہ ہے۔ ذرا اِدھر چلے آئیے: بھارت کو چین کا خوف ہے، پاکستان کو بھارت کا خوف ہے، خود پاکستان میں مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کا خوف ہے، مغربی پاکستان میں سندھیوں اور پٹھانوں کو پنجابیوں کا خوف ہے، پنجابیوں کو یو پی والوں کا خوف ہے۔ ایک اور زاویے سے دیکھئے تو شیعوں کو سُنیوں کا خوف ہے۔ سُنیوں کو شیعوں کے علاوہ وہابیوں کا خوف ہے۔ وہابیوں کا تازہ خوف فتنۂ انکارِ حدیث ہے اور تو اور ذاتی سطح پر بھی ہماری زندگی خوف ہی سے متعین ہو رہی ہے —— ہمسایوں کا خوف، ہم عصروں کا خوف، روزگار کا خوف، موت کا خوف بلکہ زندگی کا خوف، مسرت کا خوف، لذت کا خوف، انسانی امکانات اور انسانی مقدّر کا خوف۔ یہ ایک بچاری جان اور یہ ہماری زندگی کتنے خوفوں میں

گھری ہوئی ہے۔" رات کی صورتیں لوگوں کو کیا سہانے خیال سمجھاتی ہیں اور لوگ کیا میٹھی نیند سوتے ہیں مگر میں ہوں کہ خوف اور کپکپی نے ایسا دبوچا ہے کہ میری ہڈی ہڈی کو ہلا ڈالا ہے۔" ایوبؑ کے یہ دو بول دورِ حاضر کے ماتھے پر کھُد چکے ہیں گہرے، بہت گہرے۔

مگر ایوبؑ کو تو کسی اور ہی خوف نے گھیر رکھا تھا۔

دورِ حاضر کے وجودی فلسفیوں کے مرشدِ خاص، کارکے گارڈ، اپنی کتاب: نظریۂ خوف، کا خاتمہ یوں کرتے ہیں: "بات جہاں سے چلی تھی وہیں آ رکی ہے، جب نفسیات، خوف کے بارے میں، اپنی بولی بول چکے تو اُسے چاہیے کہ اسے خدا کے حوالے کر دے۔" تو چلیے ذرا ہم بھی دیکھیں کہ دورِ حاضر کی نفسیاتی کیفیت کے بارے میں جب ہم نے یہ اندازہ کر لیا کہ خوف کی چھاپ اس کے چپّے چپّے پر لگی ہے تو اس خوف کو خدا کے سپرد کرنے کا نتیجہ کیا ہو گا۔ ہم اپنی بحث پاکستان تک محدود رکھیں گے۔

خدا کہتا ہے: "اب منکرینِ حق اس بات سے مایوس ہو چکے ہیں کہ تمھارے دین کو پہنچنے نہ دیں چنانچہ اب تمھیں ان سے خوف کھانے کی حاجت نہیں، تمھیں بس میرا خوف ہونا چاہیے ــــ میں نے تمھارے لیے تمھارا لائحہ عمل وایمان مکمل کر دیا ہے اور یوں تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ہے۔ میری رضا یہی ہے کہ تم دینِ اسلام پر کاربند رہو۔" (المائدہ ــ ۳) یہ آیت بلکہ آیت کا ٹکڑا قرآن کی آخری ترین آیت سمجھا جاتا ہے کہ رسول اللہؐ اس وقت ہزارہا مصائب و مشکلات سہنے کے بعد ایک ایسی مملکت کی بنیاد ڈال چکے ہیں جہاں خدا کے اصولوں کو انسانی زندگی میں برتنے کا پورا

موقع ہے لیکن جس خُدانے اس مملکت کو ممکن بنایا ہے اب وہ آخری مرتبہ تنبیہہ کر رہا ہے کہ ایسا نہ ہو تمھیں سرفرازی ملی ہے تو تم خُدا ہی کو بُھول جاؤ۔ زندہ قومیں کو زندگی نت نئے مقام سے للکارتی ہے بلکہ دعوتِ مبارزت دیتی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ زندگی کے چھل بل ہمیں زندگی کی حقیقت سے غافل کر دیں۔ افسوس کہ ہم غافل ہو گئے اور بالکل غافل ہو گئے۔

ہم لڑکے بالے سے تھے کہ گلیوں میں کدکڑے لگاتے ہوئے، مکانوں کی دیواروں پر لکھتے ہوئے، گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگاتے تھے: پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ۔ یُوں تو پاکستان بھی ایک حد تک ہندوؤں سے مسلمانوں کے خوف کا نتیجہ تھا لیکن محض ایک حد تک۔ اور یہ خوف پچھلے چودہ سال میں ساڑھے پانچ سو مرتبہ بجا ثابت ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کا یہ دعویٰ بھی تو تھا کہ ہم یہ ملک اس لیے چاہتے ہیں کہ یہاں ہم اپنے معبودِ حقیقی کے بتائے ہوئے رستے پر آزادانہ چل سکیں گے — پاکستان کا مطلب یہی تھا جن حالات میں پاکستان بنا ہے اور جس طرح اکیلے ایک شخص نے کہیں ایک ذرا سی کمزوری دکھائے بغیر ایک بے عمل اور بے حس قوم کو اس ساحلِ مُراد پر آتارا ہے وہ انسانی تاریخ کا ایک حیرت افروز ورق ہے۔ اس مجذوب کی بڑ کا جو جو مذاق اُڑاتے اور اپنے پرائے نے اس منزل کے آگے اپنے زعم میں جو جو دیوارِ چین کھڑی کی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی تو ہے نہیں کہ کوئی یہ بھانڈے چوراہوں میں پھوڑتا پھرے۔ مجھے تو بس اتنی بات کہنی ہے جسے سب جانتے ہیں کہ وہ پاکستان جو پہلے دیوانے کا خواب تھا ایک زندہ مطالبہ بنا پھر یہ مطالبہ پُورا ہو گیا، قائدِ اعظم کی حیات میں اس کے

اقتصادی دیوالیے کی نوید بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی، لیاقت علی خاں کے دَور میں اس کی سیاسی موت کی خبر کی بھی تردید ہوگئی — اور تو اور یہ گاڑی بعد کے بے لگام سالوں میں بھی اتنی بے قابو نہ ہوئی کہ اپنے مسافروں سمیت کسی گڑھے میں گر کر بے نشان ہو جاتی۔ آپ کچھ بھی کہیے کہ اس کا باعث یہ تھا یا وہ تھا، میں تو یہی کہوں گا کہ اس ملک کے بارے میں جھوٹ یا سچ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ یہاں خُدا کا قانون چلے گا سو خدا ہی نے اس کے مطالبے میں لوگوں کے دِل کو جمع کیا، خدا ہی نے اس مطالبے کی تعبیر ممکن بنائی، خدا ہی نے اسے اب تک سنبھالے رکھا کہ وہ لوگوں کو خوب ڈھیل دینے کا عادی ہے اور اب خدا ہی نے ایسے لوگوں کو سامنے آنے کا موقع دیا ہے جنھیں یہ دعوےٰ ہے کہ وہ ایک ایسا قانون بنا کر یہاں واقعی نافذ بھی کریں گے جو خُدا کا قانون ہوگا۔ لیکن میں بھی کچھ کہنے پر اکتفا نہ کروں گا، میں یہ بھی کہوں گا کہ خدا کی ڈھیل طویل تو ضرور ہوتی ہے لیکن جب یہ پوری ہو جائے تو کسی کے بھی بس میں نہیں ہوتا کہ اسے ایک لحظہ ہی آگے پیچھے کھسکا سکے (یونس - ۴۹)

سوال یہی نہیں کہ اب ہم جو قانون بنائیں گے وہ اسلامی قانون ہوگا یا نہیں۔ سوال اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے: کیا ہم خُدا کے قانون کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟ سچ تو یہ ہے کہ اگر ہم نے خُدا کو موت کی نیند نہ سُلا دیا ہوتا تو ہمیں اپنی زندگی کو خُدا کے اصولوں پر ڈھالنے کے لیے کسی نام نہاد اسلامی قانون کے انتظار کی یُوں ضرورت نہ ہوتی۔ یہ سب دفتر ہائے فقہ اور گلدستہ ہائے روایات تو صدیوں بعد کی پیداوار ہیں، نبی کریمؐ اور ابوبکرؓ و عمرؓ کے لیے تو اللہ ہی کافی تھا، قرآن حکیم

ہی اُس دَور میں ایک "کتاب" تھی اور بس۔ اور یہ کتاب ویسی کی ویسی اب بھی موجود ہے۔ پھر ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے ؟ عقل کی کہ اس کی روشنی میں ہم اپنی زندگی میں خُدا کے قانون کو جاری وساری کر سکتے ہیں ؟ بالکل غلط عقل سے پہلے ہمیں اپنے گریبان میں مُنہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ہم تو خدا سے مکر کر رہے ہیں۔ ہم تو صریحاً منافق ہیں۔ اگر ہم منافق نہ ہوتے تو یُوں دھڑتے سے خُدا کا نام لے کر، خُدا کے نام منسوب اس ملک میں وہ اُدھم ہرگز نہ مچاتے جواب تک ہم مچاتے رہے ہیں۔ ہم تو اسلام کے نام سے بھی دل ہی دل میں کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ یہ تو محض بشرماشرمی ہیں ہم اسے اپنے ساتھ گھسیٹ لیتے ہیں ورنہ کیا ہم جانتے نہیں کہ اسلام تو ایک کانٹوں بھری سیج ہے اور آج کل کی اس ایٹمی دُنیا میں دقیانوس کے زمانے کا اسلام بے چارہ کیا تیر مارے گا۔ اسلام پر اگر ہمیں اندر سے اعتبار ہوتا، خدا کو اگر ہم موجود جانتے، کوئی حیات میں اسی کے حکم کو کارفرما محسوس کرتے، یا مختصراً یُوں کہیے کہ ہمیں خُدا کا کچھ بھی خوف ہوتا تو ہم اس بات کے منتظر نہ بیٹھے رہتے کہ کوئی ڈنڈے کے زور سے ہمیں خدا ترس بنا دے۔ ایسے معاملات میں جبر و اکراہ کی گنجائش ہوتی تو خدا خود ہی لوگوں کو ہدایت دے کر یہ جھنجھٹ ختم کر دیتا۔ ڈنڈے سے، یا قانون سے لوگوں کو اسلام پر کاربند نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام تو ایک بیج کی طرح دلوں ہی میں جڑ پکڑتا ہے اور دلوں کی گرمی ہی میں پھُولتا پھلتا ہے۔ اس کے نظام میں منافقوں کے لیے کوئی جگہ نہیں اس لیے کہ منافقوں کو اللہ نے منکرینِ خدا میں شامل کیا ہے (التوبہ-۴۹) اور قرآن کی کتنی ہی سُورتیں منافقین کے بیان سے بھری ہوئی ہیں اور ان کے آئینے میں ہمارا کالا مُنہ صاف نظر آتا ہے۔

برِ عظیم ہند میں مسلمانوں کی تاریخ میں دو مرتبہ اسلامی قانون نافذ ہوا۔ غیاث الدین بلبن کے عہد میں اور پھر اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں۔ نتیجہ؟ ان دونوں کی حیات تک جب تک کہ ان کا ڈنڈا لوگوں کے سر پر رہا یہ قانون بھی جاری رہا، ادھر ان کی آنکھ بند ہوئی اُدھر ہماری تاریخ کے سب سے گھناؤنے باب کھل گئے۔ جو جا ہلیت اور جو ظلم ان دونوں کے بعد اس ملک میں برپا ہوا وہ اس بات کی عبرت افروز مثال ہے کہ کوئی قانون جب اُوپر سے نافذ کیا جاتا ہے اور اس کی جڑیں لوگوں کے دلوں میں نہیں ہوتیں تو اس کے خلاف یونہی ردِ عمل ہوا کرتا ہے۔ چلیے میں یہ تسلیم کر لیتا ہوں، اور خدا کرے کہ ایسا ہی ہو، ہمارا نیا قانون بہت ہی صحیح خطوط پر گڑھے، اُس کی رُوح خالصتاً اسلامی ہو، لوگوں کے لیے اس پر عمل کرنا بھی محال نہ ہو، اس کے نفاذ میں کفایت بھی ہو تو کیا جب تک لوگوں کے دلوں میں اس قانون کا احترام نہ ہو گا، اس قانون کی خاطر وقتاً فوقتاً اپنے اوپر پڑنے والی زد کو خوشی برداشت کرنے کا حوصلہ نہ ہو گا اس وقت تک ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ قانون برتنے کے لیے بنا ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ اس قانون کی حیثیت کسی بھی دوسرے قانون کی ہو گی جس سے ہم وکلا کی مدد سے بچنے کی تدابیر کرتے رہتے ہیں۔ کیا اس بات کی کھلی مثالیں نہیں کہ قانون کے اندر رہتے ہوئے قانون کو توڑا جاتا ہے۔ اسلامی قانون بھی اس سلوک سے مستثنیٰ نہیں۔ اسی لیے تو خدا کو کہنا پڑا تھا کہ نافرمانی کے ظاہر کے ساتھ ساتھ اس کے باطن سے بھی بچنا چاہیے۔ (الانعام – ۱۲۰) ابو الکلام آزاد کے "تذکرہ" پر بہت سے لوگوں کو بہت سے اعتراض ہیں لیکن میری نگاہ میں اس کی ایک خوبی بہت اہم ہے کہ اُس نے اسلامی قانون کے کئی محافظوں کا پول

کھولا ہے کہ وہ کس طرح ذاتی بچاؤ کے لیے اس قانون کو عجبہ دیتے تھے۔

اسلامی قانون کی حقیقت اتنی ہے کہ یہ ایمان کے معاملے میں اقرار بالّلسان ہے لیکن افسوس کہ ایمان تصدیقؔ باالقلب کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اور یہ کام منافقو کا ہے کہ وہ دین کے ایک حصّے پر تو رضا مند ہو جائیں اور ایک کے سلسلے میں معذرت چاہ لیں۔ شراب خانے بند کر دینے سے شراب نوشی بند نہیں ہُوا کرتی لوگ گھروں میں بھٹیاں بنا لیا کرتے ہیں۔ زنا کو حرام یا جُرم قرار دینے سے لوگ باعصمت نہیں ہو جاتے، لوگ رات تو رات دن دہاڑے یہ صعف لپیٹ دیتے ہیں۔ قانون اکیلا کیا کر سکتا ہے۔ جب تک اندر سے دل ساتھ نہ دے گا آپ کروڑوں روپے زمین کی شوریدگی مٹانے کے لیے جمع کریں گے اور انجینئر مصنوعات ٹیوب ویل کے تیل کو کالے بازار میں بیچ دیا کریں گے۔ ہوگا کیا؟ ایک دن یہ شوریدگی انجینئر صاحب کے بنگلے کی بنیاد وں تک پہنچ جائے گی اور وہ ڈھے جائے گا۔ تو کیا ہم اس ملک کا بھی انجام چاہتے ہیں؟ جو جانتے ہیں وہ جانتے ہیں جو نہیں جانتے وہ جان لیں کہ ہم یہی چاہتے ہیں۔ ہمارے دلوں کی ٹیڑھاب ہماری آنکھوں میں تیرتی دکھائی دیتی ہے، ذرا ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھیں، صاف پتا چلے گا کہ ہم ایک مجرم قوم ہیں —— خُدا سے بھاگے ہوئے۔ اسی لیے تو ہماری زندگی کے چپّے چپّے پر دُنیا کے خوف کی مہریں لگی ہیں۔ ہم خُدا کے خوف سے بھاگے اور دُنیا کے خوف میں اسیر ہو گئے۔ ایک خوف کی جگہ ان گنت خوف —— خوف کا جہنم۔

خُدا کہتا ہے "سُن لو، جس نے اپنا سر خُدا کے آگے جھکا دیا اور بھلائی کو

اپنا وطیرہ بنالیا اس کے لیے اللہ کے پاس بڑا اجر ہے اور اس کے لیے نہ خوف ہے نہ ملال ہے "۔ (البقرۃ — ۱۱۲) اگر خوف و ملال ہی ہماری زندگی کا عنوان ہے تو پھر کیا عجب ہے کہ ہم نے اپنا سر خدا کے آگے جھکایا ہی نہیں اور بھلائی نے ہمیں چھوا بھی نہیں۔ مگر خوف سے نجات دینی ہی تھی تو خدا نے اپنا خوف کیوں باقی رکھا ؟ خدا کے خوف سے خوف کی ضرورت نہیں۔ خوف ہمیں اپنے آپ سے ہونا چاہیے کہ "نفس تو بُرائی کی طرف جھکاتا ہی ہے"۔ خدا کا خوف تو اسے ہو جو خدا کا مجرم ہے۔ خدا نے انسانوں کو اپنے بارے میں جو بات سب سے پہلے بتائی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ فوری طور سے رحمت کرنے والا اور دائم رحمت کرتے رہنے والا ہے —— بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ پھر اللہ کہتا ہے "میں نے انسانوں کے معاملے میں اپنے لیے یہ طے کر لیا ہے کہ ان پر رحمت ہی رحمت کرتا رہوں"۔ (الانعام — ۵۴) اب یہ ہمارا اپنا ظرف ہے کہ اس کی جانب سے اُٹھنے والی رحمت کی گھٹاؤں کے آگے ہوا و ہوس کی دیوار کھڑی کر کے اس رحمت کو اپنے لیے زحمت بنالیں (النساء — ۷۹)

تو کیا ہم دُنیا کے خوفوں کو پس پُشت ڈال کر خدا کے خوف کی جنّت میں داخل ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں ؟ میرے خیال میں سورۃ النور کی یہ آیت اس مقام پر ہمیں روشنی بخش سکتی ہے :

" تم میں سے جو لوگ صاحبِ ایمان ہیں اور صالح اعمال جن کا شیوہ ہے ہم پہلی اچھی قوموں کی طرح انھیں زمین کا حاکم بنا دیں گے، پھر جو دین ہم نے ان کے لیے چُنا ہے ہم اسے نافذ و کارفرما کر دیں گے اور جن خوفوں میں

یہ لوگ پہلے ڈرے رہتے تھے انھیں ہم امن سے بدل دیں گے "
(النور: ۵۵)

سیاسی جماعتیں اور جمہوریّت

۱

چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ یہی رشتہ طرزِ زندگی اور نظریۂ زندگی کا ہے۔ زندگی کے کسی شعبے میں ہم جو طریقے اختیار کرتے ہیں وہ ہمارے فلسفۂ حیات کی غمازی کرتے ہیں۔ اگر ہمیں یہ دعوےٰ ہے کہ ہم ایک دین کے پیرو ہیں اور سیاسی زندگی اس دین کی ہمہ گیری سے باہر نہیں تو ہمیں ایک نظر اُن اداروں پر ڈالنی ہی چاہیے جنھیں دورِ حاضر کی یلغار نے ایسے اُونچے استھانوں پر لا بٹھایا ہے کہ ہم اپنا خدا رکھتے ہوئے بھی ان بالانشین بُتوں کو بآسانی اپنی آستینوں میں تلاش کر سکتے ہیں۔

دورِ حاضر کے بُتوں میں جمہوریّت کی مغربی صُورت کا مقام سب سے بلند ہے۔ یہ ایک ایسا بُت ہے کہ مغربی تعلیم کے شکاروں کو تو خیر اس پر دین و دُنیا بھینٹ چڑھانی ہی چاہیے مگر اس کی قوتوں کا اندازہ تو اس بات سے ہوتا ہے کہ عوام النّاس بھی اسے اپنے خُون سے خوش رکھنے پر تیار ہو چکے ہیں۔ اس بُت کی مقبولیّت کا راز اس دلکش دلیل میں ہے کہ اس کی شکل ہر شخص سے ملتی ہے۔ ہر شخص اس بُت کے چہرے کے مقام پر اپنا چہرہ نصب دیکھتا ہے۔ اس کی سرفرازی میں ہر شخص کو اپنی سرفرازی نظر آتی ہے۔ اہلیت صفر ہے یا سَو، اب ہر شخص کو

رائے رکھنے، رائے کا اظہار کرنے، حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔
اس طرزِ جمہوریت کو یسوع مسیح کے اس قول نے جنم دیا تھا کہ قیصر کو قیصر کا اور خدا کو خدا کا حق ادا کرو۔ صدیوں کی جِلا پاکر یہ قول مِل کے سیاسی افکار کی صورت طلوع ہوا اور انگریزی تسلّط کے راستے ہم بھی اس کی روشنی سے فیض یاب ہوئے۔ آزادی پر مِل کا مضمون اُن چند کتابوں میں سے ہے جو اُردو میں فوراً ہی ترجمہ ہوگئیں جن لوگوں نے ہم پر سیاسی غلبہ پایا تھا جب ہم نے اس غلبے کے خلاف کامیاب جدوجہد کی تو اس کی جگہ ان لوگوں کے سیاسی افکار ہم پر حکومت قائم کر چکے تھے اور دلوں پر حکومت کچھ کم اہم نہیں ہوتی خواہ وہ ہماری آنکھوں میں کھٹک پیدا نہ کرے۔ ایشیا کے بعد یہی حکومت اب افریقہ میں بھی گُل کھلا رہی ہے ۔۔ مغرب کے سیاسی تسلّط کے بعد مغرب کے سیاسی نظریات کا تسلّط۔ لیکن کیا ہمیں یہ تسلّط زیب دیتا ہے؟ کہنے کو تو ہم کہہ دیں گے کہ نہیں مگر جہاں تک حقیقتِ حال کا تعلق ہے یہ دعوےٰ سراسر جھوٹ ہے۔ ایک الگ نظریۂ حیات رکھنے کا نعرہ لگا کر ہم نے ایک مملکت کھڑی کی تھی لیکن آج تک ہمارا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ اس بنیاد پر جو عمارت بنے اس کا اس نظریے سے کوئی تعلق نہ ہو۔
اِس مقام پر چھٹ پٹ یہ سوال داغا جائے گا کہ اسلام تو جمہوریت کا داعی و پُشتیبان ہے، پھر یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ پاکستان میں جمہوریت کا اطلاق اسلام سے ہم آہنگ نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس ضمن میں اسلام میں جمہور یا عامیوں پر کبھی اعتماد نہیں کیا گیا اور اس کی وجہ سیدھی ہے کہ عامی اس اعتماد کے مستحق ہی نہیں ہو سکتے۔ نام نہاد جمہوریت کا قرآن میں کہیں ذکر بھی نہیں،

ذکر ہے تو اس بات کا ہے کہ عوام الناس کی اکثریت جاہل ہوتی ہے اور اکثریت کوئی فیصلہ کُن قدر نہیں۔ اس موضوع پر قرآن حکیم کی بیسیوں آیات میں سے صرف دو پر اکتفا کیجیے۔ سورۃ الانعام کی ایک سو سولھویں آیت ہے:

(۱) وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۔

(اور اگر تُو زمین پر بسنے والوں کی اکثریت کی رائے پر چلے تو یہ لوگ تجھے خدا کے رستے سے بھٹکا دیں گے۔ یہ لوگ محض گمان پر چلتے ہیں اور جھوٹ ان کا شیوہ ہے)

سورۃ الفرقان میں اُن لوگوں کی طرف متوجہ کر کے جنھوں نے اپنی خواہشات کو خدا بنا رکھا ہے اللہ یہ فیصلہ سُناتا ہے:

(۲) اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ ۴۴

(کیا تُو سمجھتا ہے کہ لوگوں کی اکثریت سُنتی ہے اور غور و فکر کرتی ہے۔ نہیں، (اکثر) لوگ تو جانوروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہیں)

انسانوں کی اکثریت کا یہی عالم ہے کہ وہ اپنی خواہشات کے دائرے سے نہیں نکلتے اور یہ صفت جانوروں کی ہے۔ عوام کالانعام کا محاورہ بے سند نہیں۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ عوام کی سطح بھی بلند ہوتی رہتی ہے اور یہ ممکن ہے کہ آج کا ایک عامی اپنی معلومات کے اعتبار سے پچھلے ادوار کے حکماء سے سبقت لے جائے

لیکن ہر دور کے معاملات کو سمجھنے کے لیے ماضی کے نتائج اور مستقبل کے اندازوں کی ضرورت کو اس دور کے عامی پورا نہیں کر سکتے۔ یہ کام اس دور کے اُولوالالباب کیا کرتے ہیں اور اعلیٰ سوجھ بوجھ کا بلند ترین مرتبہ رکھنے والے انسانوں کی رائے کا احترام واجب ہے اور بس۔

اس تشریح کا منشا یہ نہیں کہ اسلام میں جمہوریت کی تلاش کو غلط ثابت کیا جائے۔ مقصد یہ ہے کہ اسلام اگر جمہوریت کی کسی صورت کو قبول کرتا ہے تو اسے آلائشوں سے پاک کر کے سامنے لایا جائے۔ ہُوا یہ ہے کہ مغربی تہذیب و افکار کے سیلاب نے مشرقی دنیا کو جس طرح روندا ہے اس سے اہلِ مشرق میں ایک طرح کی مدافعانہ روش اُبھر آئی ہے۔ دُنیا پر حکومت کرنے والی تہذیب کی ہیبت اور کارکردگی سے ہم نے ایسی مار کھائی ہے کہ اب ہم اپنے دین و افکار میں ایسے عناصر کی کھوج میں لگے رہتے ہیں جنھیں ہم مغرب کے مقابلے میں یہ کہہ کر پیش کر سکیں کہ ہم تم سے پیچھے نہیں، تمھارے مقابلے میں کچھ کم ترقی پسند نہیں۔ جمہوریت کے سلسلے میں بھی ہم نے یہی کچھ کیا ہے۔ یہ مانتے ہوئے کہ جمہوریت کا مطلب انسانی ترقی کی معراج ہے ہم نے اسے اسلام کے سر تھوپ دیا ہے۔ محض اس ایک گنجائش نے کہ (اجتماعی) معاملات میں (اے نبی! — اے سربراہِ حکومت) ان (دوسرے مسلمانوں) سے مشورہ کر لیا کرو۔ (آلِ عمران: ۱۵۹) ہمارے ہلکے دماغوں کو یہ ڈھیل دے دی ہے کہ ہم نے جمہوریت کے مغربی انداز کو اپنی زندگی سے کھیلنے کی کھلی چھٹی دے دی ہے۔ اس کی انتہائی بصیرت افروز مثال یہ ہے کہ اس جمہوریت کے "گندے چھلوں" سے پاکستان کو "نجات" دلانے

کے لیے جو مارشل لاء نافذ ہوا تھا اس کے سربراہ کو اس جمہوریت کے بے حد مؤثر عالمگیر تشہیری نظام نے جلد از جلد اختیارات عوام کو لوٹانے پر مائل کر دیا۔ گویا ساڑھے تین سال کے بلنے عرصے نے عوام کو جانوروں کی سطح سے اُٹھا کر، خواہشات کی اسیری سے نجات دلا کر اس لائق بنا دیا تھا کہ اب وہ کاروبارِ حکومت کی مقدس امانت سنبھال لیں۔

اللہ نے انسانوں میں امتیاز کیا ہے، کچھ کو اُس نے حکمت عطا کی ہے اور کچھ حکمت سے محروم رہتے ہیں اور اس کا کہنا ہے کہ جنھیں حکمت دی گئی انھیں گویا بہت کچھ دیا گیا جو دوسروں کی نسبت بہتر ہے۔ (البقرۃ: ۲۶۹) سورہ لقمان کی بارھویں آیت یہ واضح کرتی ہے کہ حکمت کا کیا مفہوم ہے۔ اس کے مطابق لقمان کی حکمت نے اسے خدا کا شکر بجا لانے کا راستہ دکھایا۔ گویا حکمت کا مطلب خدا کا شکر بجا لانا ہے یا دوسرے لفظوں میں خدا کی دی ہوئی نعمتوں اور صلاحیتوں کو بہترین طریقے سے صرف کرنے کا نام حکمت ہے۔

اب یہ بات کوئی دُور کی کوڑی تو نہیں کہ خدا نے ملکی معاملات میں جن لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا ہے وہ حکمت کے حامل ہی ہو سکتے ہیں نہ کہ وہ لوگ جنھیں خدا بہرے گونگے اندھے کہتا ہے اور جن کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں کیونکہ وہ خدائی قوانین کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتے اور اپنی صلاحیتیں، جن میں علم و فضل بھی شامل ہے، خدا کی راہ میں صرف نہیں کرتے، اس سے ذاتی یا اپنے حواریوں کے فوائد کی راہ صاف کرنے کے سوا کوئی کام نہیں لیتے۔

جب ہم جمہوریت کی اس محدود گنجائش کو پھلانگ کر، اہلِ حکمت سے مشورے

کے بجائے جمہور کے استصواب کی جانب چل کھڑے ہوتے ہیں تو ہم ایک نہایت اہم نکتے کو نظرانداز کر جاتے ہیں اور اسی نکتے سے اس مضمون کا آغاز ہوا تھا: زندگی کے کسی شعبے میں ہم جو طریقے اختیار کرتے ہیں وہ ہمارے فلسفۂ حیات کی غمازی کرتے ہیں۔ اُس فلسفۂ حیات کی نہیں جس کا ہمیں دعویٰ ہے بلکہ اس کی جس پر ہم عملاً قائم ہیں۔ جب علی عبدالرازق نے الاسلام و اصول الحکم لکھی تو مصر میں بڑا ہنگامہ برپا ہوا کیونکہ یہ شخص اسلامی طرزِ حکومت کے سلسلے میں خلافت کے نظریے کو اٹل نہیں گردانتا۔ ابھی حال ہی میں اس کتاب کا اُردو میں بھی ترجمہ ہوا ہے اور اس کے مترجم (راجہ ف۔م۔ ماجد صاحب) نے بڑی کاوش سے اپنے دیباچے میں اس کتاب کے نظریات پر اخلاقی رائے پیش کی ہے۔ لیکن ذرا دیکھیں تو پیچھے کتنے طویل عرصے سے عالم اسلام میں دین وسیاست کی اسی تفریق کا سکہ رائج چلا آرہا ہے اور کچھ لوگوں کی رائے میں پاکستان جس خلجان میں بتلا ہے وہ یہی ہے کہ دورِ حاضر میں اسلامی طرز کی حکومت قائم کی بھی جاسکتی ہے یا نہیں، ان لوگوں کے خیال میں پاکستان کے اربابِ اختیار نہ تو اس کوشش سے منحرف ہو رہے ہیں اور نہ انھیں اس کی کوئی راہ نظر آتی ہے (کینٹویل سمتھ: اسلام ان موڈرن ہسٹری) ہاں تو جس طرز کی جمہوریت کا بُت ہم اپنی آستینوں میں چھپائے پھرتے ہیں اس کے پیچھے کون سا فلسفۂ حیات کارفرما ہے؟

یہ جمہوریت سیاسی جماعتوں کے ذریعے سے متشکل ہوتی ہے۔ ہر سیاسی جماعت کا الگ نقطۂ نظر ہوتا ہے اور پارلیمنٹ میں جو قوانین منظور ہوتے ہیں ان کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ یا تو یہ اکثریت کی حمایت کے حامل ہوتے ہیں اور ایک گروہ جو لاکھوں

عوام کی رائے کی نمائندگی کا دعویٰ رکھتا ہے وہ اُن کا مخالف ہوتا ہے یا پھر یہ توانین سمجھوتے بازی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس طرح جو فلسفۂ حیات سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کے مسائل کے بارے میں کوئی سا نقطۂ نظر بھی نافذ ہو جائے وہ قانونی حیثیت رکھے گا۔ گویا ہر نقطۂ نظر میں صحت کا پہلو ہو سکتا ہے۔ یہیں دین و سیاست کی تفریق عیاں ہو جاتی ہے لیکن ایک ایسی قوم جسے یہ دعویٰ ہو کہ اس کے پاس خدا کا قانون ہے اور زندگی صرف اسی قانون کے تحت گزارنی چاہیے وہ یہ بے لگام طرزِ حکومت کس مُنہ سے اپنا سکتی ہے ؟

اسلام یقیناً کوئی بند مذہب نہیں کہ اس میں ہر چیز پہلے سے طے کر دی گئی ہو اور انسانی غور و فکر کی گنجائش ہی نہ چھوڑی گئی ہو لیکن یہ کوئی مادر پدر آزاد طرزِ حیات بھی نہیں کہ ہر نقطۂ نظر اس کے مطابق صحت کا حامل سمجھ لیا جائے۔ انسان کا اپنا وہ تو کوئی بھی معز وضہ گھڑ کر اسے انسانیت کی نجات کا واحد راستہ سمجھ سکتا ہے لیکن خدا کا قانون تو ایک ہی ہے جو آفاق و انفس میں جاری و ساری ہے۔ صرف وہی انسانی طرزِ عمل باثمر ثابت ہو گا جو اس قانون سے ہم آہنگ ہو۔ خدا نے انسان کی انفرادی اور سماجی تعمیر پر اتنی توجہ دی ہے کہ وراثت اور ازدواجی تعلقات کی تفاصیل تک طے کر دی ہیں۔ پھر یہ سمجھنا کہ وہ حکومت جیسے اہم ترین اجتماعی مسئلے کو ان چھوا چھوڑ گیا ہے زیادتی ہے۔ خدا نے اس ضمن میں جو اُصول بیان کیا ہے وہ یہی ہے کہ کمتر اپنے سے برتر کی اطاعت کرے۔ سب سے پہلی اطاعت خود خدا کی ہے، پھر خدا کے رسول کی جن کے سپرد امیر ملّت کی حیثیت سے خدا کے قانون کو نافذ کرنا بھی تھا۔ اور یوں یہ اطاعت قوم کے ہر امیر یا قائد کی طرف منتقل

ہوتی چلی جاتی ہے۔ (النساء : ۵۹) اب چونکہ ملت کا قائد اطاعت کا مستحق ہوتا ہے تو یہ ضروری ہے کہ وہ ملت کا ایک بہترین فرد ہو۔ وہ اس خدمت کو انجام دینے کا بہترین اہل ہو جو لوگوں کو معروف پر کاربند رکھنے اور منکر سے باز رکھنے کے ضمن میں اس پر عاید ہوتی ہے۔ سورہ الحجرات کا پہلا رکوع نبی کریم کے حوالے سے اطاعتِ امیری کے اُصول پر روشنی ڈالتا ہے لیکن اس سے امیر یا قائد کی بلند ترین صلاحیتوں کا وجود اور ان صلاحیتوں کا خدا کے اصولوں کے مطابق خرچ ہونا بھی شرط ٹھہرتا ہے۔ اب اس امیر کے لیے خدا کا حکم یہ ہے کہ اجتماعی معاملات میں دوسرے مسلمانوں سے مشورہ کر لیا کرو (آلِ عمران: ۱۵۹) لیکن جب اکثریت کی یہ حالت ہو کہ وہ اپنی ہی وقتی خواہشات اور فوری ضروریات میں پھنسی ہو اور اہل حکمت ہی سُوجھ بُوجھ رکھتے، خُدا سے ڈرتے اور ایمان میں راسخ ہوں تو مشورہ صرف اُنھی سے ہو سکتا ہے۔ مشورے کا لغوی مفہوم یہ ہے کہ جس طرح شہد کی مکھیاں اپنی اپنی محنت سے مسالا جمع کر کے چھتا بناتی ہیں اور اس چھتے کو نچوڑ کر شہد حاصل کر لیا جاتا ہے اسی طرح امیر یا قائد ملک کے بہترین انسانوں سے مشورہ لے کر ان سے کچھ تجاویز مرتب کرے گا جو اصولی سطح پر خدا کے قوانین کی تابع ہوں گی اور عملی سطح پر انسانی زندگی کی پرورش و تعمیر کے لیے بیش از بیش کار آمد۔ جب مشورے کی یہ نوعیت ہو تو کسی مشورہ دینے والے کا یہ حق نہیں کہ اگر اس کے مشورے پر امیر یا قائد نے عمل نہیں کیا تو وہ بغاوت کرے یا لوگوں میں نفتہ بپا کرے۔ ہاں وہ یہ ضرور کر سکتا ہے کہ اپنے مشورے کے حق میں دلائل جمع کرتا رہے دلائل کی مدد سے دوسروں کو اس کا قائل کرے کیونکہ دلیل ہی ایک ایسی کسوٹی ہے

جسے خُدانے کسی چیز یا خیال کی موت وحیات کے لیے جائز قرار دیا ہے۔ (الانفال ۴۲ :

اس طرح جس جمہوریت کی اسلام میں جگہ ہے وہ یوں کام کرے گی کہ ملک یا ملّت کا ایک بہترین فرد اس کا قائد ہوا ور یہ قائد ملک یا ملّت کے چند بہترین انسانوں سے مشورہ کرتے ہوئے باہم مربوط عوام کی قیادت کرے ۔ قرآنِ حکیم کے مطابق جماعت بازی کی ملّتِ اسلامیہ میں کوئی گنجائش نہیں ۔ تفرقہ دینی ہو یا سیاسی خُدانے اس کی ہرگز اجازت نہیں دی ۔ جس طرح وحدتِ خداوندی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا شرک ہے اسی طرح امت کا شیرازہ بکھیرنا بھی منع ہے ۔ اُمت ایک ایسی وحدت ہے جسے پارٹیوں میں نہیں بانٹا جاسکتا (الانبیاء : ۹۲) کہ اس طرح اس کی ہوا اُکھڑ جائے گی (الانفال : ۴۶) خُدا کے نزدیک تو انسانوں کی صرف دو پارٹیاں ہیں : حزب اللہ اور حزب الشیطان (الحشر : ۱۹، ۲۲) اب اگر ہم حزب الشیطان (شیطانی جماعت) نہیں کہلانا چاہتے تو ہماری صرف ایک ہی جماعت ہوسکتی ہے اور اس جماعت کو خُدانے اپنے مددگاروں یا ساتھیوں کا لقب دیا ہے ـــ كُونُوٓا أَنصَارَ اللّٰهِ . . . (الصّف : ۱۴)

قرآن تو ہماری صرف دو وحدتوں کا قائل ہے : (۱) پوری ملّت اسلامیہ (۲) ایک فرد ـــ مومن ۔ ہاں وہ مومنوں میں حفظِ مراتب کو بھی مانتا ہے کہ کچھ کو کچھ پر حکمت کے اعتبار سے فضیلت حاصل ہوتی ہے اور ان لوگوں کو وہ مقرب کا لقب دیتا ہے ۔ یہ خدا کے بھی مقرب ہوتے ہیں اور امیر کے مقرب بھی انھی کو ہونا چاہیے اور یہی مشورے کے لائق ہیں ۔

یہاں میں حکمت کے مفہوم کو ذرا مزید واضح کرنا چاہوں گا۔ اس کا مطلب خالی خولی علم وفضل ہرگز نہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے سورۂ لقمان کے حوالے سے عرض کرچکا ہوں اس کا کام تو انسانی صلاحیتوں کو بہترین طور سے (یعنی خدا کے اصولوں کے مطابق) صَرف کرکے اس کا شکر بجا لانا ہے۔ اگر ہم یہ جان سکیں کہ انسانی صلاحیتوں سے کیا مُراد ہے تو امید ہے ہمارا کام آسان ہوجائے گا۔ انسانی زندگی کی تین سطحیں ہیں: (۱) شخصی بقا (۲) اجتماعی بقا (۳) ذہنی و روحانی نشوونما۔ انسانوں کی اکثریت کو خدا نے اسی لیے جانوروں سے تشبیہ دی ہے کہ وہ پہلی دو سطحوں سے اُوپر نہیں اُٹھتی اور یہ دو سطحیں انسانوں اور جانوروں میں مشترک ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان دو سطحوں کی جائز قدر و منزلت نہ کی جائے۔ ان کی حد تک خدا نے انسانوں کو باہم برابری کا مستحق ٹھہرایا ہے اور خون کی حرمت اس پر سب سے بڑی دلیل ہے۔ انسان کی حد تک ان دو سطحوں کی مناسب پرورش بڑی حد تک اس کی روحانی نشوونما کی ذمہ دار ہوتی ہے مگر انسانوں کے بنیادی حقوق کو انھی دو سطحوں تک محدود رکھنا چاہیے۔ ہر شخص جو زندہ ہے اور معاشرے کے تانے بانے میں کوئی مقام رکھتا ہے اسے جینے اور مناسب ترقی کرنے کے مواقع ضرور حاصل ہونے چاہئیں۔ لیکن ہر ایسے شخص کو لازماً یہ حق دینا کہ وہ اجتماعی معاملات میں دخل دے غلط ہے۔ یہ حق صرف ان لوگوں کا ہے جو روحانی نشوونما کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور حکمت کا پھل پاتے ہیں۔ اب روحانی نشوونما کے دو راستے ہیں جو باہم مل کر ہی بااثر بنتے ہیں: عقل اور جذبات۔ حکمت ان دو اجزا کا مناسب توازن ہے۔ خالی عقل کی سنگینی

اِنسانی زندگی کو بے رس کر دیتی ہے اور خالی جذبات کی پیروی اسے بے راہ کر دیتی ہے۔ اور حکمت کے اس توازن کو انسانی زندگی کی پہلی دو سطحوں کو نظر انداز کر کے حاصل کیا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ حکمت تو انھی پر اضافہ ہے ـــ انسان خود نہ ہوگا اس کا معاشرہ نہ ہوگا تو اس کی حکمت کہاں سے آئے گی یا کس کام کی۔ اس طرح اجتماعی معاملات میں جن لوگوں سے مشورہ لیا جائے گا وہ وہی ہوں گے جو انسانی زندگی کی تینوں سطحوں کو جانتے پہچانتے، ان کی ضروریات کو سمجھتے، ان کی تعمیر و ہم آہنگی کے لیے کوشاں ہوں گے۔ یہ کام ماہرین کے سپرد بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تو کنوئیں کے مینڈک ہوتے ہیں، زندگی کی کسی ایک تفصیل کے بارے میں انھیں بے شک وسیع تر معلومات ہوں لیکن زندگی کی نبض کا اُنھیں احساس نہیں ہوتا، انسان کی ضروریات کا اُنھیں لحاظ نہیں ہوتا ـــ انسان جو اتنی طویل و عریض، وسیع و قیمتی حقیقت ہے کہ حقیقتِ مطلق کے بعد اس کا بھی کچھ ٹھکانا نہیں۔

۲

کیا میرے اس بیان کی تائید تاریخِ اسلام کے کچھ واقعات کر سکتے ہیں؟ کیا اِسلامی تاریخ ہمیں یہ بتا سکتی ہے کہ اسلام میں جمہوریت کا جو عنصر رہا ہے اس کی شکل کیا تھی؟ رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خیر البشر تھے، انسانِ کامل تھے، حرف قرآن کے متبع نہیں تھے۔ ایک نبی کی حیثیت سے ان کا انسانی فرض تھا کہ وحی کی پابندی بھی کریں۔ ان کی اس پابندیِ وحی کو خدا نے مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ ان کے بعد جو شخص وحیِ الٰہی کی پیروی میں دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہوگا وہ امت کی امامت کے لائق گردانا جائے گا۔ اور وحی کی پابندی محض اللہ اللہ

کرنا تو یہ نہیں کہ رسول اللہ کے غزوے، ان کی ازدواجی زندگی، عرب جیسے غیر متحد ملک پر ان کی حکمرانی اس کی بہت بڑی دلیلیں ہیں۔ تو کیا رسول اللہ نے کبھی استصواب رائے کرایا یا آپ کا مسلک محض اہل الرائے مومنوں سے مشورہ کرنا رہا؟ آپ کو تو خدا نے آلِ عمران کی اسی مشورے والی آیت کے آخری حصے میں یہ حکم دیا تھا کہ جب تو دوسروں کی پیش کی ہوئی آراء کی مدد سے معاملات کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے کوئی عزم کر لے (کہ یہ کام کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا) تو پھر (ان لوگوں کے بجائے) تیرا توکل خدا پر ہونا چاہیے اور بس۔ اس آیت سے یہ طے ہو جاتا ہے کہ مشیروں کے مشورے سے کوئی نتیجہ برآمد کرنا قائد کا کام ہے خواہ وہ نتیجہ ان مشیروں کے مشورے کے متوازی ہو یا نہ ہو۔ یہ مشورہ ہی ہوتا ہے نہ کہ حکم۔ اور یہ بھی طے ہے کہ اصل ذمہ داری قائد ہی پر آتی ہے کہ وہ آخری فیصلہ کرے۔ تاحیات، ابوبکر اور عمر، رسول اللہ کے دست و بازو کی حیثیت سے، آپ کے مشیروں کی حیثیت سے، حاضر خدمت رہے۔ شیخین کو اس بات نے بھی دوسروں سے ممتاز کر دیا تھا یعنی رسول اللہ کے حضور میں ان دو بزرگوں کی جو حیثیت تھی وہ خود ان کے بلند ترین کردار پر مہر تصدیق کا حکم رکھتی تھی۔ چنانچہ جب آپ خدا کو پیارے ہوئے تو اُمّت کو ابوبکر کی قیادت میں جمع ہونے میں دیر نہ لگی۔ پھر جب تک ابوبکر منصب خلافت پر فائز رہے وہ برابر مسلمانوں میں سے بہترین دماغوں، خصوصاً عمر سے، مشورہ کرنے کے اصول پر کاربند رہے لیکن ایسے کتنے ہی واقعات ہیں مثلاً اسامہ بن زید کی روانگی، زکوٰۃ کے منکروں پر سختی، مرتدین سے جنگ کہ انھوں نے مشوروں کے باوجود صرف اپنی بصیرت پر بھروسا کیا اور

کامیاب رہے۔ اسی بھروسے کا ایک مظہر یہ تھا کہ اُنھوں نے عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

جب عمرؓ خلیفہ ہوئے تو وہ بھی مشورے ہی کے اُصول پر چلے نہ کہ انتخاب عام کے۔ اور جب ان کا وقت آگیا تو اُنھوں نے آئندہ خلیفہ چُننے کے لیے صرف چند ایسے آدمیوں کی کمیٹی بنائی جنھیں وہ بہترین مُسلمان سمجھتے تھے۔ اس کمیٹی نے جس شخص کا انتخاب کیا وہ عثمانؓ تھے اور عثمانؓ کے ابتدائی عہد میں اسلام کی اشاعت کی نظیر نہیں ملتی۔

لیکن جب ملّت مشورے، فرد کی بہترین صلاحیتوں پر اعتماد اور ملّت کی وحدت کے بنیادی اُصول سے منحرف ہو گئی اور پارٹیوں میں بٹ گئی اور افراد یا اہلِ حکمت کے مشوروں کے بجائے قائدین سیاسی نوعیت کی جماعتوں کے مشورے پر چلنے لگے تو کیا ہُوا - یہ ہُوا کہ اسلام کے حیرت انگیز عروج کو قیام کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ اس کا زوال شروع ہو گیا اور اسلام کی چند بہترین شخصیتیں اس کا شکار ہو گئیں ــــ عثمانؓ، علیؓ، حسینؓ۔ جب لوگوں نے علیؓ سے ان کے عہدِ خلافت کی ابتری کے بارے میں پُوچھا تو اُنھوں نے کہا تھا ــ "پہلے خلفاء کو مجھ جیسے مشیر میسّر تھے لیکن میں ایسے مشیروں سے محروم ہو گیا۔"

۳

اب ذرا ان دو چار لوگوں کی باتوں پر بھی غور کر لیا جائے جنھیں نئی دنیا اہلِ حکمت کی حیثیت سے جانتی ہے۔ سب سے پہلے جمہوریت کے بارے میں وہائٹ ہیڈ کی یہ بات لیجیے: "ہم انگریز اور امریکی لوگ 'جمہوریت' کی اصطلاح کی تشریحات میں خاص

طور سے کوتاہ واقع ہوئے ہیں، یُوں محسوس ہوتا ہے کہ جو طرزِ معاشرت ہماری مقرر کردہ تعریف کی ہو بہو نقل نہ ہو ہم اسے جمہوریت کے دائرے ہی سے خارج سمجھتے ہیں۔" (مکالمات ۳۲) انگریز اور امریکی تو ایک طرف رہے خود ہمارا یہ حال ہے کہ ہم ہر اُس طرزِ معاشرت کو غیر جمہوری لہٰذا غیر ترقی یافتہ گردانتے ہیں جو انگریزی یا امریکی طرزِ معاشرت یا جمہوریت کی نقالی نہ ہو اور کسی دُوسرے طرز کے جمہوری نظام کو قبول کرنے، آزمانے، رائج کرنے کا موقع دینے کے بجائے "مکمل جمہوریت" کے نعرے لگاتے پھرتے ہیں۔

وھائٹ ہیڈ کے بارے میں پاکستانیوں کے لیے یہ یاد دہانی شاید دلچسپ ہو کہ اقبال نے اس کی مذہب اور فطرت کے بارے میں آراء سے اتفاق کیا ہے اور اُس کے نظریۂ اضافیت کو آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کے مقابلے میں زیادہ قابلِ قبول گردانا ہے۔ وھائٹ ہیڈ بیسویں صدی کا عظیم ترین فلسفی ہی نہ تھا، وہ حساب دان بھی تھا، سائنس دان بھی، ماہرِ تعلیم بھی اور ایک دیندار انسان بھی۔ اسے واقعی صاحبِ حکمت کہا جا سکتا ہے۔

اب جماعت بندی یا سیاسی جماعتوں کے بارے میں سیمون ویل کی رائے ملاحظہ کیجیے۔ یہ ایک جوانا مرگ فرانسیسی دوشیزہ تھی جس کی بے پناہ انسانی بصیرت کی ٹی ایس ایلیٹ نے یُوں داد دی ہے کہ اس کی تحریر پڑھتے ہوئے ہم ایک ایسی صاحبِ نظر خاتون کی شخصیت سے دوچار ہوتے ہیں جس کی نظر کی مثال اولیا ہی کا حصہ ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں فرانسیسی حکومت نے اس خاتون

سے درخواست کی تھی کہ وہ فرانس کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ایک رُوداد مرتب کرے۔ اس درخواست پر سمون ویل نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے: نیڈ فار رُوٹس (جڑوں کی ضرورت)۔ یہ اقتباس اسی کتاب سے ہے۔

"اجمالاً، آزادیِ اظہار سے متعلق تمام مسائل صاف ہو جاتے ہیں اگر ہم تسلیم کر لیں کہ یہ آزادی ذہانت کی ایک ضرورت ہے، اور یہ کہ ذہانت کا واحد مقام انسانی وجود ہے، مگر اس وجود کو انفرادی حیثیت سے دیکھنا ہوگا۔ اجتماعی ذہانت نام کی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ کسی گروہ یا پارٹی کو آزادیِ اظہار کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں کیونکہ کسی گروہ یا پارٹی کو اس کی ذرّہ برابر ضرورت نہیں ہوتی۔

"بلکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر ہم آزادیِ خیال کی حفاظت چاہتے ہیں تو یہ قانون بنا دینا چاہیے کہ کوئی گروہ یا پارٹی کسی رائے کا اظہار کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔ کیونکہ جب جماعتیں رائے رکھنا شروع کر دیں تو وہ اپنی آراء کو اپنے اراکین پر مسلط کرنے لگ جاتی ہیں۔ جلد یا بدیر یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ افراد زیادہ یا کم اہم مسائل کے بارے میں اپنی سچی رائے کے اظہار سے کم و بیش رُک دیے جاتے ہیں کیونکہ اُن کی رائے پارٹی کی رائے سے مختلف ہوتی ہے۔ ان کے لیے صرف یہ چارۂ کار رہ جاتا ہے کہ وہ پارٹی کے اندر رہ کر اپنی رائے کے اظہار سے باز رہیں یا پھر پارٹی کو چھوڑ دیں لیکن جس گروہ سے انسان متعلق ہوتا ہے اسے چھوڑنے میں ہمیشہ تھوڑی بہت تکلیف ہوتی ہے ــــ خواہ اس کی نوعیت جذباتی ہی ہو۔ اور جس طرح عملی میدان میں خطرہ اور تکلیف ایک لحاظ سے صحت مند اور ضروری عناصر

ہیں اسی طرح وہ ذہانت کے لیے غیر صحت مند اثرات کی حیثیت رکھتے ہیں خوف، خواہ بہت ہی عارضی ہو ہماری ذہانت کے انتہائی نازک نظام کو گڑ بڑا کر رکھ دیتا ہے، اگر حوصلہ مضبوط ہو تو یہ نظام مقابلے کے لیے تن جاتا ہے اگر کمزور ہو تو ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور دونوں صورتیں ذہانت کے آزادانہ عمل میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ اس اعتبار سے تو دوستی بھی ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔ ذہانت اسی وقت سے مدھم پڑ جاتی ہے جب کسی کے خیالات کا اظہار، عیاں یا نہاں طور سے، ایک چھوٹے سے لفظ 'ہم' کے دُم چھلّے سے مزین ہو۔ اور جب ذہانت کی روشنی مدھم پڑنے لگے تو وہ وقت دُور نہیں رہتا جب بھلائی کرنے کی خواہش ہی ختم ہو جاتی ہے۔

"فوری، عملی حل تو یہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں ختم کر دی جائیں۔ پارٹیوں کی دھینگا مشتی ناقابلِ برداشت ہے۔ ایک پارٹی (جیسا کہ فاشزم اور کمیونزم کے تحت ہوتا ہے — ح ر) اور بھی بڑی برائی ہے۔ بس ایسی سیاسی زندگی ہو جس میں سیاسی جماعت یا جماعتوں کو کوئی دخل نہ ہو۔ آج کل ہمیں یہ خیال بڑا انوکھا اور پُر خطر معلوم ہوتا ہے۔ یہ اور بھی اچھا ہے کیونکہ ہمیں ضرورت بھی کسی انوکھی چیز کی ہے لیکن' حقیقت میں، یہ محض ۱۷۸۹ء (انقلابِ فرانس — ح ر) کی روایت کی جانب واپسی ہے۔ اس وقت کے لوگوں کے نزدیک یہی ایک راستہ تھا۔ جس طرح کی سیاسی زندگی پچھلے پچاس سال سے ہم گزار رہے ہیں انھیں یہ ایک بھیانک خواب معلوم ہوتی۔ انھیں کبھی یقین نہ آتا کہ عوام کا کوئی نمائندہ اس حد تک عزتِ نفس کھو بیٹھے گا کہ کسی پارٹی کا 'پالتو' رکن بن کر رہ جائے گا۔

"پھر، روسو نے واضح طور سے دکھا دیا تھا کہ کس طرح پارٹیوں کی کش مکش

سے جمہوریہ خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ اس نے اس کے اثرات کی پیشین گوئی کر دی تھی۔ اس کی کتاب: سوشل کنٹریکٹ (معاہدۂ عمرانی) کا مطالعہ لوگوں کو اب ایک مرتبہ پھر کرنا چاہیے۔ درحقیقت آج کل جہاں کہیں بھی سیاسی جماعتیں تھیں، جمہوریت دم توڑ چکی ہے۔" (پہلا حصّہ۔ باب: آزادئ رائے)

میں نے اس مضمون کے پہلے حصّے میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام کے دائرے میں رہتے ہوئے جو جمہوریت پنپ سکتی ہے اس میں جماعتوں کے بجائے افراد کو اہمیت حاصل ہے۔ اصل میں کسی معاشرے یا تہذیب کی تعمیر میں اعلیٰ صلاحیتوں کے افراد کا خونِ جگر ہی بنیادوں کا کام کیا کرتا ہے۔ نیشنل ازم اور جمہوریت نے عامیوں کو شخصیات پر ترجیح دی ہے اور یوں قبولِ عام بے شک حاصل کر لیا ہے لیکن اپنے ہی ہاتھوں اپنا گلا بھی گھونٹا ہے کہ اب روز بروز ان لوگوں کا تناسب معاشروں میں کم ہوتا جاتا ہے جو نئی دنیا کے نئے تقاضوں کو سمجھتے ہوں اور انسانی زندگی کی تمام سطحوں سے ہمدردانہ واقف ہوں۔ اس شدید بلکہ ہیبت ناک غلطی کو جس طرح الیکسز کیرل نے محسوس کیا ہے شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ ہاں اورٹیگا ای گاسیٹ نے بھی کیا ہے لیکن اس کی کتاب: ریوولٹ آف دی ماسز (عامیوں کی بغاوت) ایک ایسی مربوط دلیل ہے کہ اس سے اقتباس دینا کتاب کے اسلوب سے ناجائز سلوک کے مترادف ہے۔ نوبل انعام یافتہ سائنسدان اور انسانیت کے لیے بے مثال درد کے حامل ڈاکٹر الیکسز کیرل نے اس موضوع پر اپنی دو انتہائی وقیع کتابوں: (۱) مین دی اَن نون (اَن جانا انسان) اور (۲) ری فلیکشنز اون لائف (زندگی پر دانشی)

میں بحث کی ہے۔ ان کتابوں سے باترتیب چند سطریں پیش کرتا ہوں:

(۱) "فرد اور انسان کے بارے میں نظریات کے اُلجھاؤ نے ایک اور غلطی پیدا کر دی ہے اور یہ ہے جمہوری مساوات۔ یہ اُگو ہی امر، اب مختلف قوموں کے تجربات کے تھپیڑوں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ رہا ہے۔ اس لیے اس بات پر اصرار کرنا غیر ضروری ہے کہ یہ نظریہ غلط ہے۔ لیکن اس کی کامیابی حیرت انگیز حد تک طویل ثابت ہوئی ہے۔ اتنے لمبے عرصے تک انسانیت اس پر نہ جانے کیسے اعتبار کرتی رہی ہے؟ جمہوری نظریہ ہمارے جسم اور ہمارے شعور کی ساخت کو ذرا بھی پیش نظر نہیں رکھتا۔ اس کا اس ٹھوس حقیقت سے کوئی بھی تو رشتہ نہیں جسے فرد کہا جاتا ہے۔ انسان ضرور برابر ہیں لیکن افراد ہرگز باہم مساوی نہیں۔ اُن کے حقوق کی برابری ایک دھوکا ہے۔ ایک جھلّا اور ایک صاحبِ نظر انسان قانون کے نزدیک برابر نہ ہونے چاہئیں۔ بے وقوف، نالائق، بے دھیان، توجہ اور کام کی اہلیت سے محروم لوگوں کو اعلیٰ تعلیم کا کوئی حق نہ ہونا چاہیے۔ اس کی کوئی تُک نہیں کہ انھیں بھی اسی طرح ووٹ دینے کا اختیار حاصل ہو جس طرح پختہ کردار افراد کو جنسیں بھی مساوی نہیں ہیں۔ (ان کے الگ الگ فطری تقاضے اور دلچسپیاں ہیں — ح ر) ان امتیازات کو نظر انداز کرنا بہت خطرناک ہے۔ جمہوری اُصول نے اعلیٰ سطح کے افراد کی تعمیر میں حصّہ نہ لے کر تہذیب کی تخریب میں حصّہ لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے برعکس صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ انفرادی امتیازات کا لحاظ کیا جائے۔ نئے معاشرے میں چھوٹے بڑے، متوسط اور عام اور ہر طرح کے لوگوں کی ضرورت ہے لیکن ہمیں اعلیٰ سطح کے لوگوں کی پرورش اُسی طرح سے کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے

جس طرح ہم علی سطح کے لوگوں کی کرتے ہیں۔ جمہوری نظریہ نے انسانوں کو ہر طرح برابر بنا کر گویا یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ کمزوروں کی کثرت ہوتی چلی جائے۔ ہر جگہ کمزوروں کو مضبوطوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ ان کی مدد کی جاتی، حفاظت کی جاتی، بلکہ انھیں سراہا جاتا ہے۔ پاگلوں، مجرموں اور اپاہجوں کی طرح وہ عوام کی ہمدردی کا مرکز بن جاتے ہیں۔ مساوات کا اسطورہ، علامت کی محبت، ٹھوس حقیقت سے نفرت، یہ ہیں وہ عناصر جو شخصیت کی تخریب کے سب سے بڑے مجرم ہیں۔ چونکہ کمتروں کی سطح بلند کرنا ممکن نہ تھا اس لیے انسانوں میں جمہوری مساوات پیدا کرنے کا یہی ایک ذریعہ رہ گیا کہ سب کو انتہائی نچلی سطح پر لے آئیں۔ یوں شخصیت کا خاتمہ ہوا"
(باب: فرد، ۱۰)

(۲) نئی جمہوریت فرد کو جس اخلاقی آب و ہوا میں جینے پر مجبور کرتی ہے وہ اس سے مطابقت پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ جس رفتار سے طب، حفظانِ صحت اور تعلیم کے میدانوں میں پھیلاؤ آیا ہے دماغی سطح اتنی بلند نہیں ہوئی۔ جب سے جمہوریت چلی ہے بدمزاجی، غیر ذمہ داری اور آسائش کی تلاش انسانی طرزِ عمل کے رہنما اصول بنتے چلے گئے ہیں اور تحمل، قوتِ کار، بلکہ ذہانت بھی، گھٹتی چلی گئی ہے۔ امریکہ نے عوامی تعلیم پر جو کثیر روپیہ خرچ کیا ہے اس کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ ذہنی صحت کی قومی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق بے شمار بچے جماعتوں میں نصاب سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے (اب ان کو "پڑھانے" کے لیے نصاب کو مزید آسان کیا جائے گا اور یوں سمجھدار بچوں کو نالائق بچوں کی سطح پر لایا جائے گا — ح ر) ہربنس کی مشہور تحقیقات کے مطابق امریکی فوج کے افسروں اور جوانوں میں چھیالیس فی صد ایسے تھے جن کی ذہنی

عمر تیرہ سال سے نیچے تھی۔

"(جمہوریت کی بدولت) آزاد ہونے والا انسان کسی طرح بھی اُس شاہین کے مماثل نہیں جو آسمان کی رفعتوں کو چیرتا چلا جاتا ہے۔ اس کی مثال تو اس کتے جیسی ہے جو بھٹ سے نکل آیا ہے اور بازار میں در بدر ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔ جمہوری انسان اس کتے کی طرح واقعی جو چاہے کر سکتا ہے اور جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ لیکن اسے اس کتے کی طرح گم کردہ راہ ہی سمجھا جائے گا کیونکہ اسے یہ علم نہیں کہ وہ جانا کہاں چاہتا ہے اور اردگرد جو خطرات منڈلا رہے ہیں وہ ان سے اپنی حفاظت کیونکر کرے گا"۔ (پہلا باب)

اس عبرت انگیز حشر سے ہمیں صرف ایک چیز بچا سکتی ہے اور وہ ہے کسی مستقل اقدار کے حامل نظامِ حیات پر ایمان ـــ کسی ایسے ہمہ گیر فلسفۂ حیات پر اتفاق جو افراد کی اعلیٰ ترین رفعتوں کی پرورش و حفاظت کرے اور پوری ملّت کو انتشار سے بچائے رکھے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دامن میں نئے ادوار کے نئے تقاضوں کی مستقیم تکمیل کی گنجائش بھی رکھے۔ کیا اسلام کا نام یاد دلانے کی ضرورت باقی ہے؛ ہاں، اسلام جو مستقل بھی ہے اور ہر دم تازہ بھی ـــ جس کے آفاق میں کائنات کے روز و شب پھیلتے آفاق یوں سمٹ جاتے ہیں جیسے کسی خالق کے وجود میں اس کی نت نئی تخلیق۔

رفاہی مملکت اور ہم

کون نہیں چاہتا کہ انسانوں کو ان کی بنیادی ضروریات ـــــ روٹی، کپڑا، مکان میسر ہوں۔ لیکن اگر انسان ان بنیادی ضروریات ہی کو اپنی منزل سمجھ لیں، ان کی کمی اور بیشی ہی کو وہ برتری اور کمتری کا معیار سمجھ لیں تو پھر ایسی گمراہی پھیلتی ہے کہ انسانی معاشرہ وحشی جانوروں سے بھرا جنگل بن کر رہ جاتا ہے۔

حکومتِ پاکستان کئی مرتبہ یہ خواہش برسرِ عام لا چکی ہے کہ پاکستان ایک رفاہی ملک بن جائے۔ بڑی خوش آئند بات ہے کہ ہمارے ہر شہری کو کھانے کے لیے روٹی، تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا اور رہنے کے لیے گھر کی چار دیواری نصیب ہو جائے۔ وہ بیمار ہو تو اسے دوا مل جائے، وہ پڑھ لکھ جائے، وہ کام کے لائق ہو تو اسے کام مل جائے۔ رفاہی مملکت کے یہ فائدے تو کسی بھی معاشرے کے لیے بُرے نہیں، پھر ہم جیسے پسماندہ لوگوں کے لیے تو یہ ایک نعمت ہیں بلکہ ہم تو اُس کے بعد اُس دن کی راہ دیکھیں گے جب ہمارے یہاں بھی دوسرے رفاہی ملکوں کی طرح بوڑھوں کو وظیفے ملیں گے، کسی کارندے کو کام سے جواب مل گیا تو جب تک اسے دوبارہ کام نہیں ملتا حکومت اُسے گزارا وقات کے لیے رقم دے گی، بیواؤں اور یتیموں کے لیے غریب خانے ہوں گے، تعلیم مُفت ہوگی۔ گھروں میں آسائشی سامان، ریڈیو، فرنیچر، ریفریجریٹر، ایرکنڈیشنر ـــــ ہوگا۔ گھر اور کار خریدنے

کی (آسان قسطوں پر) سہولت ہوگی۔

ہمارے یہاں یہ عام دستور ہے کہ یورپ سے نظریات درآمد کیے جاتے ہیں۔ جب چیزیں وہاں اچھی بنتی ہیں تو ظاہر ہے وہاں کے نظریات بھی اچھے ہی ہوں گے مگر ہوتا یہ ہے کہ چیزیں تو نئے ماڈل کی تازہ بتازہ ہمیں پہنچ جاتی ہیں لیکن نظریات کی درآمد نسبتاً سست رفتاری سے ہوتی ہے مگر جب کوئی نظریہ ہمارے یہاں پہنچ جاتا ہے تو پھر ہم اُس سے اُس وقت تک چمٹے رہتے ہیں جب تک وہ ہمارے خون کی آخری بوند تک نہیں نچوڑ لیتا۔ اس ضمن میں ہم اچھا بُرا کچھ نہیں دیکھتے اور کمال سُپردگی سے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ جمہوریت کا صداقت کے مقابلے میں مفاہمت پر مبنی نظام ہو، یا ملّت کو پارہ پارہ کرنے والی قوم پرستی، ہمیں یہ خدا اور اُس کے قانون سے کاملاً دور کر دینے کے لیے کافی ہیں بلکہ ہماری تو یہ کوشش ہوتی ہے کہ اگر ہو سکے تو خُدا اور اس کے قانون کو فیشن ایبل مغربی تصوّرات سے بھڑا دیا جائے اور جس طرح بھی ہو ان تصوّرات کی حمایت میں اللہ کی آیات اُتھل پتھل کر دی جائیں خواہ دس بیس یا سو دو سو سال بعد یہ تصورات پرٹے پٹائے مغرب کے گلے میں لعنت کی طرح لٹکے ہوں اور خود مغرب ان سے ذہنی طور پر بری ہو چکا ہو۔ اور اللہ کی آیات مفت میں جھوٹی پڑ جائیں۔ آج سے پچیس تیس سال پہلے جب کمیونزم کا تصور ہمارے یہاں نیا نیا درآمد ہوا تھا اُس وقت سے اب تک کئی ترقی پسند مولوی اس کوشش میں رہے ہیں کہ کمیونزم کے اصولوں کو عین اسلام ثابت کیا جا سکے۔ یہی حال جمہوریت کا ہے کہ اسلام کو جمہوریت کا مترادف کہنے میں بڑے بڑوں کو باک نہیں۔ حالانکہ جمہوریت کا ایک سیدھا سا اصول یہ ہے کہ

جس طرف زیادہ رائیں ہوں ان کی بات تسلیم کی جائے خواہ وہ غلط ہی ہوں اور جو لوگ اقلیت میں ہوں، خواہ وہ حق پر ہوں وہ بلا چون وچرا غلط کاروں کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل پیرا ہوں۔ پھر زیادہ آراء کی یہ حالت ہے کہ اگر دو سے زیادہ جماعتیں ہیں تو زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ اکثریت والی جماعت مجموعی طور سے مخالف جماعتوں سے کم آراء کی مالک ہو۔ اس صورتِ حال کا سدِ باب کرنے کے لیے فرانس میں جمہوریت کے پھیلائے ہوئے انتشار کو سمیٹنے کی خاطر جنرل دی گال کو تقریباً آمرانہ اختیارات دیے گئے ہیں۔ اسی ضمن میں امریکی صدر کو اتنے اختیارات حاصل ہوتے ہیں کہ آج وہ آزاد دنیا کا سب سے طاقت ور انسان کہلاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ نئے امریکی صدر کینیڈی نے اپنی وزارت بناتے ہوئے مخالف جماعت کو بھی نمائندگی دینی ضروری سمجھی ہے۔ اسی سلسلے میں جمہوری نظام کی سب سے بڑی مثال، برطانیہ میں؛ حکومت اب لوگوں کے اتنے بہت سے معاملات میں دخل دے رہی ہے کہ وہاں جمہوریت اور سوشلزم آپس میں گڈمڈ نظر آتی ہیں یا دوسرے لفظوں میں برطانیہ اب ایک رفاہی مملکت ہے۔

مغربی نظریات پر اندھا دھند ایمان لے آنے کی ہمارے یہاں ایک اور مثال تعلیم و تربیت ہے۔ جنگِ عظیم کی بنا پر اور جنگِ عظیم کے اثرات کے طور پر مغرب میں نوجوانوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی اور بچوں کی تربیت پر صدیوں سے کڑی کڑی نظریں ردِ عمل کے طور پر اٹھالی گئیں۔ بچے کو مادر پدر آزادی مل گئی کہ وہ جو کرنا چاہتا ہے کرے، اس کے لیے یہی بہتر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب مغرب کے نوجوان جس بے رخی اور بے خیالی سے ہم کنار ہیں اس سے اہلِ مغرب پناہ مانگ رہے ہیں۔

لڑکے لڑکیاں جو گل کھلا رہے ہیں وہ اب ہمارے یہاں بھی ڈھکا چھپا نہیں۔خوش وقتی نوجوانوں کا اصل اُصول بن چکی ہے، خواہ اس کی خاطر قتل ہوں، بوڑھوں کو راہ چلتے لُوٹا جائے، جنسی بے راہ روی حدیں پھلانگ جائے۔ اب مغربی نوجوانوں کو تو یہ کہہ کر بخشا جاسکتا ہے کہ اہلِ مغرب نے دو عظیم جنگیں لڑی ہیں؛ وہ تھک گئے ہیں؛ دو گھڑی عیش کرنا چاہتے ہیں، ماں باپ جن معاشرتی بندھنوں اور تکلفات میں جکڑے ہوئے تھے وہ چاہتے ہیں کہ اُن کے بچے تو چار دن آزادی سے اُڑ سکیں لیکن ہمارے یہاں اس "خوش وقتی" کا آخر کیا جواز ہے؟ ایمان کے مقابلے میں کفر اختیار کرنے میں تو پھر کا فر ایک طرح سے ایمان کی حقیقت تسلیم کر رہا ہوتا ہے کیونکہ ردِّعمل میں اصل بنیاد تو نظروں میں رہتی ہے جس سے روگردانی کی جارہی ہوتی ہے مگر ہمارے یہاں جس بے ضمیری اور بے حسی سے "خوش وقتی" اختیار کر لی گئی ہے وہ کسی لادین PAGAN معاشرے ہی کا خاصہ ہو سکتی ہے۔

اس ساری بات کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے ذہن کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہیں کہ جب ہر انسانی نظریہ دس بیس یا سو دو سو سال میں مُنہ کے بل گر جاتا ہے تو انسانی نظریات کو قریب آنے کی اجازت ہی کیوں دی جائے اور نئے خیالات سے دُور رہنے کا کام تو ہم مسلمانوں نے کئی صدیاں کیا ہی ہے اور اپنی جگہ ہمیں اس جمود کو توڑنا بھی ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اب اپنے ذہنوں اور زندگیوں کو ہم مغربی نظریات کا تابوت بنالیں کہ جب یہ مغرب میں اپنی موت مرجایا کریں تو ہمارے یہاں ان کے شان دار مقبرے تعمیر ہوا کریں۔ ہمارا راستہ تو یہ ہونا چاہیے کہ ہم اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں پہ تمام تر انسانی غور و فکر کو پرکھیں

اور جو باتیں ہمیں اللہ کے راستے پر دورِ حاضر میں ثابت قدمی سے سرگرم سفر رکھ سکیں اُنھیں قبول کریں اور اگر ہمیں یہ احساس ہوجائے کہ اب اس راستے کے لیے یہ زادِ راہ کافی نہیں تو خود بھی نئے ذہنی و جسمانی ساز و سامان کی تلاش کریں اور ہماری ہم عصر قوموں نے جو نئے ذہنی و جسمانی ہتھیار ایجاد کیے اور آزمائے ہیں ان میں سے بھی اپنے حالات کے مطابق انتخاب کریں اور اپنے مزاج کے اعتبار سے ان میں جہاں ضروری ہو ترمیم و اضافہ بھی کریں۔ یہ تو انسانی مقدر ہے کہ اُسے وحی کی روشنی صرف اصولوں کی حد تک دی گئی ہے اور چند معاملات کو چھوڑ کر خُدا نے تفصیلات کا معاملہ انسانوں پر چھوڑ دیا ہے۔ اب اہلِ شعور تو زیادہ سے زیادہ ذہن و تخیل کی وادیوں کی سرگردانی ہی کر سکتے ہیں اور حقیقت کو چھوٹی چھوٹی قسطوں ہی میں تلاش کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ کام بہت مشکل ہے مگر انسان بھی مشکل کاموں سے مُنہ پھیرے تو مشکل کام کیا پہاڑ کیا کریں گے۔ اس کا کام تو یہی ہے کہ زندگی سے مُنہ موڑے، زندگی کے سفر میں بچھی ہوئی ریت کو چھانتا چلا جائے اور اس ریت سے برآمد ہونے والی حقیقت کے سونے کو اپنے سینے پر آویزاں کرتا رہے۔

رفاہی حکومت کا معاملہ بھی یہی ہے کہ جب تک ہم اس معاملے میں حقیقت کی تلاش نہ کریں گے بہت سا کھوٹ خواہ مخواہ ہماری زندگیوں میں در آئے گا۔ ٹائن بی نے کہا تھا کہ اہلِ مشرق خوش قسمت ہیں کہ مغرب نے جہاں جہاں مار کھائی ہے وہ ان مقامات سے بچ سکتے ہیں۔ اس بات میں اگرچہ یہ دعویٰ بھی چھپا ہوا ہے کہ دورِ حاضر میں مشرق کے لیے یہی راستہ ہے کہ مغرب کے پیچھے پیچھے

چلیے، وہاں یہ صداقت بھی موجود ہے کہ اگر ہم مغرب کے کچھ سیاسی اور اقتصادی نظریات کو اپنی معاشرتی ترقی کے لیے مدد و معاون پاتے ہیں تو ہمیں ان نظریات کی خامیوں سے بھی پوری آگاہی ہونی چاہیے تاکہ ہم حتی الامکان ان کے بُرے نتائج سے بچ سکیں۔

ایک عام سیاستدان کا طریقہ کار یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاشرے کی فوری ضروریات پر زور دیتا ہے اور عام معاشروں کا بھی یہی دستور ہے کہ ناک سے آگے انھیں کچھ نظر نہیں آتا، بس یہی کوشش ہوتی ہے کہ پیش آئندہ معاملہ کسی طور حل ہوجائے خواہ اس کے بعد پہلے سے بھی بُرے حالات پیدا ہوجائیں۔ لیکن ہمارے صدر ایوب ان معنوں میں سیاست دان نہیں ہیں۔ اُنھوں نے بے شک بہت سے ایسے سیاسی معرکے سر کیے ہیں ہمارے نام نہاد سیاست دان برسوں جن کے وعدے کرتے رہے تھے لیکن پھر بھی انھیں محض سیاست دان نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں میں اُن کے حیاتیاتی تجربے کا ذکر کرنا چاہ رہا ہوں۔ کم از کم وہ تو یہ جانتے ہیں کہ پیش قدمی کرتے ہوئے راستے کی ہر دیوار کی گھات میں دشمن کے چھپے ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ بے شک پیش قدمی ضروری ہے، معاشرے کی ترقی ضروری ہے لیکن ترقی کی گھاتوں میں نہاں تاریک پہلوؤں پر بھی نظر ضروری ہے۔

مغرب کے جن ملکوں میں رفاہی حکومت قائم ہے وہ لوگوں کی اپنی محنت اور خواہش کا نتیجہ ہے۔ اس ضمن میں مغربی جرمنی کی اس مثال پر غور کیجیے کہ ٹریڈ یونینوں کے باوجود وہاں کسی کارخانے میں ہڑتال نہیں ہوتی کیونکہ چھوٹے سے چھوٹا کارندہ بھی یہ جانتا ہے کہ ہڑتال سے قومی آمدنی میں کمی واقع ہوگی اور اس کا اثر ہر فرد پڑے گا۔

جب تک لوگوں میں یہ احساس نہ ہو کہ تمام تر ذمہ داری حکومت پر نہیں بلکہ ان پر بھی ہے اُس وقت تک کوئی اچھا نتیجہ متوقع نہیں۔ رفاہی حکومت اوپر سے مسلط نہیں کی جاسکتی، یہ تو اندر سے، لوگوں میں سے اُبھرنی چاہیے — لوگوں کو، عوام کو یہ احساس ہو کہ زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ کوشش اور محنت سے حاصل ہوں گی اور ان کی خاطر انھیں ابتداً رات دن ایک کرنا ہوگا۔

تاریخِ اسلام میں حضرت عمرؓ وہ ایک فرد ہیں جنھوں نے ایک طرح کی رفاہی حکومت قائم کی تھی کہ اس میں ہر شہری کو وظیفے ملتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی اِس انقلاب آفریں روش کو مسلمان آج تک یاد کرتے ہیں۔ کچھ تو اس لیے کہ ہائے اب ایسا نہیں ہوتا اور کچھ اس لیے کہ ہائے ایسا کیوں ہوا، حضرت عمرؓ کے بعد جو کچھ مسلمانوں پر، خصوصاً اہلِ عرب پر بیتی ہے اور آج تک بیتتی چلی جارہی ہے ذرا اس کے بارے میں حضرت عمرؓ کے مشہور سوانح نگار، محمد حسین ہیکل کی کتاب — عمرؓ فاروقِ اعظم کی چند سطریں ملاحظہ فرمائیں :

حضرت عمرؓ نے وظیفوں کی تعیین کے متعلق مہاجرین و انصار سے مشورہ کیا اور ان لوگوں نے حق میں رائے دی۔ پھر فاتحینِ اسلام سے مشورہ فرمایا اور اُنھوں نے بھی اس سے اتفاق کیا سوائے حکیم بن حزام کے، جو مکہ کے سرداروں اور صائب الرائے لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ انھوں نے کہا: "امیرالمومنین! قریش اہلِ تجارت ہیں۔ اگر آپ ان کے وظیفے مقرر کردیں گے تو وہ تجارت چھوڑ بیٹھیں گے، پھر آپ کے بعد کوئی ایسا فرماں روا آئے گا جو ان کے وظیفے بند کردے گا اور تجارت اُن کے ہاتھ سے نکل چکی ہوگی۔"

ابن حزام کے ان فقروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا غیب کے پردے ان کی نگاہوں سے ہٹا دیے گئے تھے اور یہ بات اُن کے دل میں القاء کی گئی تھی ۔۔ وظائف نے عربوں کو کاہل بنا دیا اور وہ روزی کے لیے دوڑ دھوپ کرنے سے بے پرواہ ہو گئے ۔ اس کے عجب حالات بدلے اور فتوحات کا سلسلہ رکا اور غیر عرب اسلامی حکومت میں شامل ہو گئے ۔۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب اسلام کا دارالسلطنت مدینہ سے دمشق اور دمشق سے بغداد منتقل ہوا ۔ تو جزیرۃ العرب کے باشندوں کے وظائف بند کر دیئے گئے ۔ آسائش اور بے عملی کی گود میں پرورش پانے والی نسل نہ تجارت کی طرف لوٹ سکی ، نہ روزی کے لیے جدوجہد کر سکی جس کے نتیجے میں حجاز ایسا ویران اور بنجر ہوا کہ آج تک نہ پنپ سکا ۔"

رفاہی حکومت کے سلسلے میں ہمارے لیے دو باتیں انتہائی اہم ہیں ۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور دوسری بات یہ کہ پاکستان کے حالات صرف پاکستان سے مخصوص ہیں ، دوسرے ممالک سے اس کے حالات کتنے ہی مماثل ہوں یہ ہو بہو ویسے نہیں کہ ہم ان ملکوں میں رائج سیاسی اور معاشرتی اداروں کو ہو بہو درآمد کر لیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں بھوک کے عذاب سے بچنے کی تدبیر کرنی ہی چاہیے کہ اللہ نے مومنوں کے لیے خوف کے ساتھ ساتھ بھوک بھی پسند نہیں کی ۔ پھر خدا کا رفیق بننے کے لیے ، ذہن و تخیل کو اللہ کی نشانیوں کی تلاش میں دوڑانے کے لیے بنیادی یا فطری ضرورتیں پوری ہو چکی ہوں تو اچھا ہی ہوتا ہے ۔ خود رسول کریم کو اللہ نے روٹی کے پیچھے مارے مارے پھرنے سے فراغت دے رکھی تھی ۔۔۔ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ۔ یوں بھی اللہ نے اپنی ایک پسندیدہ دعا میں آخرت میں

بھلائی مانگنے کے ساتھ ساتھ دینوی بھلائی مانگنے کی دعوت بھی دی ہے۔
(رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ)
لیکن جس طرح اِس دعا میں دینوی بھلائی کے ساتھ اُخروی بھلائی کا دامن بندھا ہُوا ہے اُسی طرح اگر ہم دینوی بھلائی کا پروگرام بنائیں تو اُس وقت تک وہ بھلائی کا پروگرام نہیں کہلا سکتا جب تک اُس کا نتیجہ اور منزل اُخروی بھلائی نہ ہو یا یُوں کہیے کہ جب تک اُس کا انجام آئندہ بھی بہتر ثابت نہ ہو۔

جہاں تک پاکستان کے مخصوص مسائل کا تعلق ہے ہمیں اپنے کسی بھی رفاہی پروگرام میں سب سے پہلے درجات مقرر کرنے چاہئیں کہ ہمیں کونسی چیز پہلے چاہیے اور کونسی بعد میں، اور جو چیزیں ہمیں چاہئیں ان کا معیار کیا ہوگا۔ فرض کیجیے ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس سائیکلیں، موٹر سائیکلیں، رکشتے، کاریں اور بسیں ہونی چاہئیں کیونکہ ہمارے کام کے اوقات بچیں گے، طلبہ وقت پر سکولوں میں پہنچیں گے دفتر وقت پر لگ سکیں گے، لوگوں کے پاس تفریح کا وقت نکل آئے گا۔ بالکل بجا، یہ چیزیں منگوا یا تیار کر لی جاتی ہیں۔ اب سب سے پہلے تو یہ ہوگا کہ سڑکوں پر حادثات کی رفتار بڑھ جائے گی۔ کرسمس اور نئے سال کے تہواروں پر ایک امریکہ میں تین چار سو آدمی ٹریفک کے حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حادثات کی روک تھام کے لیے ہمیں سڑکیں چوڑی کرنی پڑیں گی۔ اس ضمن میں محکمہ تعمیرات کو نئی بھرتی کرنی پڑے گی، ٹریفک پولیس میں اضافہ کرنا پڑے گا۔ غرض ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا خرچ کا — اور یُوں وہ رقم جو اصلاً دُوسرے رفاہی کاموں مثلاً تعلیم وغیرہ کے لیے رکھی ہوگی اس میں بعد ازاں کمی کرنی پڑے گی۔

ہمیں اپنا پروگرام بناتے ہوئے یہ نہ بھولنا چاہیے کہ محض چیزوں ——استعمال کی چیزوں کی فراوانی سے کام نہ چلے گا، چیزوں کا کیا ہے وہ تو انسان کو زیادہ دیر نہیں بھا سکتیں—— کیا وہ لوگ جو گزوں لمبی کاروں میں نکلتے ہیں اور فرلانگوں لمبی کوٹھیوں میں رہتے ہیں زیادہ اچھے شہری یا زیادہ خوش افراد ہیں۔ ذرا باہر کے باافراط افلوائنٹ معاشروں پر نظر دوڑائیے۔ کیا وہاں لوگ چیزوں سے مطمئن ہیں۔ ہرگز نہیں۔ چیزیں وہاں بے معنی بنتی جا رہی ہیں۔ لوگ وہاں اب چیزیں نہیں چاہتے چیزوں کے نئے ماڈل چاہتے ہیں۔ وہ گھر نہیں چاہتے، نت نئے ڈیزائن کا گھر چاہتے ہیں۔ وہ کار نہیں چاہتے نئے سال کی کار چاہتے ہیں۔ فرنیچر نہیں چاہتے نئے اسلوب کا فرنیچر چاہتے ہیں۔ اور نئی چیزیں روز بنتی ہیں۔ کپڑوں کے فیشن تو محض بدنام ہو گئے ہیں ورنہ دوسری ہر چیز کا فیشن بھی اب روز بدلتا ہے اور جن لوگوں کے پاس نئے بدلے ہوئے فیشن کی چیزیں نہیں ہوتیں ان سے زیادہ دکھی کوئی نہیں ہوتا خواہ دو دن پہلے کے فیشن کی ہزاروں چیزوں سے ان کے شاندار گھر اٹاٹ بھرے ہوں۔ تو کیا ہم بھی چیزیں چاہتے ہیں؟ اس مقام پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہاں کوئی حرج نہیں۔ لیکن کیا ان کے مقابلے میں کچھ خلاؤں کو پُر کرنا ضروری نہیں مثلاً ہم جیسے اَن پڑھ معاشرے کے لیے تو سب سے پہلے تعلیم ضروری ہے۔ وہ تعلیم نہیں جس کے نتیجے میں لوگ خواہ بڑی سے بڑی ڈگری لے لیں لیکن اُن کی خود غرضی اور ہوس میں ایک ڈگری کی بھی کمی نہیں واقع ہوتی۔ پچھلے دنوں مشہور پاکستانی سائنس دان پروفیسر عبدالسلام نے اخبار نویسوں کو بتایا ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ پاکستانی سائنس دان پاکستان میں آنے سے گھبراتے ہیں کیونکہ اُن کے شایانِ شان تنخواہیں

یہاں نہیں ملتیں۔ تو کیا ہم ایسی ہی تعلیم چاہتے ہیں کہ جب ہم ہزاروں لاکھوں روپے کسی فرد کی تعلیم پر خرچ کر چکیں تو محض چند ٹکوں کی خاطر وہ اپنے ملک کے کسی کام نہ آئے، یا تو ملک میں واپس ہی نہ آئے یا پھر آکر کسی بیرونی مشن کا ملازم ہو جائے خواہ وہاں اُسے اپنے علم کا ایک ریزہ بھی استعمال کرنے کا موقع نہ ملتا ہو۔

رفاہی حکومت ضرور قائم کیجیے لیکن مسلمان رہتے ہوئے اور اسے اُوپر سے مسلط کرنے کے بجائے خود عوام کے اندر سے ابھاریے تاکہ وہ صرف لینا ہی نہیں قوم اور ملک کو کچھ دینا بھی یاد رکھیں۔

قیادت کی تعمیر

۱

بادشاہت کا خاتمہ ہوا تو اہلِ دُنیا قوم پرست رہنماؤں کے ہتھے چڑھ گئے۔ پہلے اگر قیادت ورثے میں ملتی تھی تو اب اس کا معیار یہ طے پایا کہ جو کوئی زیادہ گلا پھاڑ کر قومی آزادی یا برتری کا نعرہ لگائے گا اُسے زیادہ اُونچی مسند پر بٹھا دیا جائے۔ قوم پرستی جو اپنے دامن میں جمہوری قدریں لے کر چلی تھی دیکھتے ہی دیکھتے نسلیت، فاشیت اور ایک مزید بٹا کھا کر اشتراکیت کا روپ دھار گئی۔ جب یہ بخار ان ملکوں میں کچھ ٹھنڈا ہوا جہاں یہ اپنی معراج کو پہنچا تھا یا دو عظیم جنگیں لڑتے ہوئے ان ملکوں نے اگر یُونہی ستانے کی خاطر اس تھار جذبے کو اک ذرا جھٹکی دے دی تو اس وبا کے جراثیم اُن کی نوآبادیات کا رُخ کر گئے۔ آزادی! آزادی! ہر طرف یہی پکار مچ گئی۔ قوم پرستی غلام ملکوں کے لیے آزادی کی جاں فزا نوید تو لائی لیکن اس کی جذباتی کشش نے ایک گل ایسا کھلایا کہ آزادی اپنی جھولی میں جو حقوق لاتی ہے انھیں تو قومی رہنماؤں نے ہم وطنوں کے سامنے خوب بڑھا یا چڑھایا لیکن آزادی کے ساتھ سلامتی کی کٹھن منزل کا نہ اُن رہنماؤں نے خود کوئی اندازہ کیا نہ ہم وطنوں کو اس کے لیے تیار کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ ہوا یہ کہ آزادی تو بہت سے ملکوں نے حاصل کر لی لیکن اسے سنبھالا اکثر سے نہ گیا۔ اس کا

یہ مطلب نہیں کہ ان ملکوں کو آزادی ملنی نہ چاہیے تھی، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ان ملکوں کو ایسی قیادت کی تعمیر کرنی چاہیے تھی جو آزادی کے ساتھ ساتھ سلامتی کے قیام میں بھی حصہ لیتی ــــ خرابیوں اور کمیوں کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ ان کی اصلاح کا ڈھنگ بھی جانتی اور وہ بھی محض نظریاتی طور سے نہیں بلکہ عملی سطح پر۔

جس طرح مغرب سے قوم پرستی کی رَو مشرق میں پہنچی اسی طرح مغرب کے ثقافت اور معیارِ زندگی کے تصورات بھی مشرق کی نظروں میں سمانے لگے لیکن آزادی کے نقارخانے میں معاشرتی اور اقتصادی تقاضے طوطی کی آواز بنے رہے۔ پھر آزادی ملنے کے بعد جب ذرا سکون ہوا تو یہ تقاضے ایک دم سامنے آئے اور اچانک ایک تشویش ناک احساس اُبھرا کہ ہم تو مغرب سے صدیوں پیچھے ہیں۔ پہلی بات بیشک یہ تھی کہ ہر مسئلے میں مغرب کی پیروی لازم نہ سمجھنی چاہیے تھی لیکن دوسری بات یہ تھی کہ اپنے مسائل کو دورِ حاضر کی للکار کے مطابق حل کرنے کی اہمیت اپنی جگہ ضروری تھی اس لیے محض قوم پرستانہ جذبات بھڑکانے کی صلاحیت رکھنے والی قیادت کے لیے ناکامی کا منہ دیکھنا لازم تھا ــــ خواہ مغرب کی اندھا دھند پیروی کی جاتی یا نہ کی جاتی۔ لے دے کے یہ قیادت یہ جتن کرتی رہی کہ ملکی ذرائع کا بیشتر حصہ دفاع پر خرچ کر کے آزادی کو برقرار رکھے۔ لیکن سلامتی تو ولولہ انگیز تقریروں اور جوش آفریں بیانوں کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ اس کے لیے "محض سیاست داں" رہنما کافی نہ تھے جو رائج تعصبات کو لباسِ عمل پہنا کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب کوئی دن میں قوم فوزو فلاح کی رفعتوں کو چھوا چاہتی ہے۔ اس کے لیے تو سیاسی مفکروں کی ضرورت تھی جو پورے سیاسی عمل کی نقاب کشائی بھی کرتے۔ یہ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے

کہ جو کچھ ہوتا آیا ہے اس کی وجہ اور ڈھب کیا ہے اور جو کچھ آئندہ ہمارے اپنے یہاں، ہمارے ہمسایہ ملکوں میں بلکہ پوری دنیا میں متوقع ہے اس کی کیا صورتیں ممکن ہیں اور اس روشنی میں وہ حالیہ مسائل کے بارے میں بھی فیصلہ کرتے۔

جب انسان محض ہنگامی رو کے تحت کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اکثر اسے بعد میں پچھتانا ہوتا ہے۔ بے شک وجدانی بلکہ جذباتی فیصلے بھی زندگی میں مقام رکھتے ہیں اور عقل ہی سب کچھ نہیں ہوتی لیکن ہر فیصلے کی صحت کا اندازہ عقل ہی کرتی ہے۔ اسی طرح جب کوئی قوم یا ملک کسی ہنگامی رو کے تحت اپنے فیصلے کرتا ہے اور مستقبل کے امکانات اور ماضی کے دستور کو پیشِ نظر نہیں رکھتا یا یوں کہیے کہ جو کچھ انسانی تجربہ اسے سکھا سکتا ہے وہ اس سے بہرہ ور نہیں ہوتا اور محض وقتی ضرورتیں پوری کرنے کے چکر میں اسیر ہو جاتا ہے تو اس کی سلامتی یا اس کی مادی، فکری، روحانی نشو و نما رک جاتی ہے، اس کے یہاں حرکت تو بے شک بہت ہو، لیکن یہ حرکت اُسے آگے نہیں بڑھاتی، اوپر نہیں اٹھاتی، بس ایک دائرے میں گھماتی رہتی ہے۔ یہ قوم یا ملک وجود تو رکھتا ہے زندگی سے البتہ محروم رہتا ہے۔

جب یہ صورتِ حال ہو تو اکثر یوں ہوتا ہے کہ آج جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے کل ہمیں اس کا ذکر بھی ناگوار گزرنے لگے۔ آج اگر زراعت پر فخر کیا جاتا ہے تو کل ہم آنکھیں بند کر کے صنعت کاری کی دُھن میں لگ جاتے ہیں۔ آج اچانک تجارت پر پابندیاں لگادی جاتی ہیں کہ تاجر لوگ ملکی ضروریات کا خیال نہیں کرتے تو کل تاجروں کی معصومیت پر ہمارا ایمان ایسا تازہ ہوتا ہے

کہ انھیں ہر طرح کی ڈھیل دے دی جاتی ہے۔ آج یہ نعرہ لگایا جاتا ہے کہ پیداوار بڑھاؤ لیکن یہ نہیں سوچا جاتا کہ پیداوار آخر کیوں بڑھائی جائے۔ کیا فالتو پیداوار اپنے ساتھ بیکار کے مسائل نہیں لاتی۔ کل یہ نعرہ لگایا جاتا ہے کہ کم کھاؤ، کم خرچ کرو لیکن یہ نہیں سوچا جاتا کہ اس سے جو طرزِ عمل پروان چڑھے گا وہ آئندہ کن نتائج کا حامل ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وقتی فیصلے کیے ہی نہ جائیں کہ مستقبل میں نہ جانے ان کے کیا اثرات مترتب ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقتی فیصلے ایک وسیع پس منظر و پیش منظر کی روشنی میں ہونے چاہئیں بلکہ اس ضمن میں جہاں ماضی اور مستقبل کا خیال رکھا جاتا ہے وہاں حال کا جائز خیال بھی ضرور رکھنا چاہیے؛ یہ نہیں کہ حال ہمیشہ روایات اور آنے والی نسلوں کی بہبود کے دیوتاؤں کی بھینٹ ہی چڑھتا رہے۔ قیادت اسی کا نام ہے کہ زمان کی تینوں طاقتوں: ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان ایک مستقیم راہ تلاش کی جائے جس پر چلتے ہوئے قوم یا ملک حال میں نت نیا قدم اُٹھاتے ہوئے بھی ماضی اور مستقبل کے مطالبوں سے یکساں فاصلے پر رہے اور ساتھ ہی ساتھ اس لازمانی ہستی، خدا، سے بھی منحرف نہ ہو۔ یہی وہ معیار ہے جس کی جستجو اور نشاندہی افلاطون نے اپنی جگہ "جمہوریہ" میں کرنے کی کوشش کی تھی اور یہی وہ معیار ہے جس کا سُراغ لگانے کی فکر اپنی جگہ دورِ حاضر کا منتشر ذہن بھی کر رہا ہے۔

۲

اب ذرا ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے یہاں قیادت کا کیا تصوّر ہے اور اس کا کیا معیار ہے؟

قوم کی حیثیت سے ہم ایک ایسے موڑ پر کھڑے ہیں جہاں ہماری قیادت کی باگ ڈور سرکاری افسروں کے ہاتھ میں ہے۔ یوں بھی ہمارے یہاں تعلیم کی جو پست سطح ہے اس کا نتیجہ یہی ہے کہ جو نوجوان پڑھ لکھ کر ذمہ داری کے کھلے میدان میں قدم دھرتے ہیں انھیں سرکاری ملازمتیں دبوچ لیتی ہیں۔ پھر اتنے بہت سالوں بعد ہم آزاد ہوئے ہیں جو مزہ اور طنطنہ افسری میں ہے وہ دوسرے شعبوں میں کہاں۔ اس لیے ہماری قیادت میں سرکاری افسروں کا ایک اہم درجہ ہے۔ اور اب بنیادی جمہوریتوں کے تانے بانے میں تو سرکاری افسروں کو باقاعدہ قیادت میں شرکت کا موقع دے دیا گیا ہے۔ اس طرح اپنے یہاں قیادت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری۔ اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ کوئی ہمارے یہاں ہی کا مسئلہ نہیں کہ سرکاری قیادت کو اہمیت دی جا رہی ہے؛ دنیا بھر میں ہر جگہ حکومت کا کاروبار اس قدر وسعت اختیار کر گیا ہے کہ سرکاری قیادت کو نظرانداز کر کے سلامتی کی تدبیر کرنا محال ہو چکا ہے بلکہ اب تو قیادت کو تین حصوں میں بانٹنے کا رواج ہو گیا ہے:

(۱) قانون ساز جماعت جو انتخابات کے ذریعے سامنے آتی ہے۔

(۲) انتظامیہ جو قوانین کو عملی جامہ پہناتی ہے اور

(۳) عدلیہ جو افرادِ معاشرہ کے ساتھ ساتھ انتظامیہ کو بھی قانون کے تحت رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔

جہاں تک پیشہ ور سیاست دانوں کا تعلق ہے ہم آزادی کے ابتدائی برسوں میں بھی ان کی کامیابی و ناکامی کا بہت مشاہدہ کر چکے ہیں۔ ہمارے یہاں جب

"اہل سیاست" کا سکہ چلتا ہے تو کرسی نشین پارٹی کو تو محکمۂ اطلاعات، تعلقات عامّ اور ٹی وی کی سہولتیں" بطور جہیز" مل جاتی ہیں لیکن مخالف پارٹیوں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ دفتر میں ڈھائی کرسیوں، چائے کے خالی برتنوں اور دو چار روزناموں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اتنا بھی نہیں کہ کسی بھلے سے روزنامے کی مکمل فائل ہی ہو، ضروری مسائل پر مرتب مسالے یا کسی طرح کی "حوالہ لائبریری" کی بات تو بعد میں آتی ہے۔ قانون ساز اسمبلیوں میں قومی مسائل پر جس "سنجیدگی" اور "دقتِ نظر" سے بحثیں ہوتی وہ بھی کوئی نہاں بات نہیں جس طرف پارٹی کا لیڈر اسی جانب من حیث الجماعت ہاتھ کھڑے ہو رہے ہیں، یا پھر واک آؤٹ کیے جا رہے ہیں۔ شاید ہی کسی شریف آدمی کو یہ خیال آتا ہو کہ میرے سپرد اپنی قوم کی قیادت ہے، مجھے اپنے علاقے، اپنے ملک اور بدلتی ہوئی دنیا کا جائزہ لے کر ایسے قوانین مرتب کرنے میں حصّہ لینا چاہیے جو آج اور آئندہ میری قوم کی مادی، فکری، روحانی نشو و نما کے لیے مناسب ماحول پیدا کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ ہمارے یہاں تو اتنا بھی نہیں ہوتا کہ جن علاقوں سے یہ سیاست داں منتخب ہو کر اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں وہ وہاں کے مسائل ہی سے آشنا ہوں کہ اس طرح وہ اپنی اپنی جگہ اپنے علاقوں کی بہتری کے لیے کوشش کر سکتے ہیں۔ صدر کینیڈی نے دنیا بھر کے آرزومند نوجوانوں میں امریکہ کا صدارتی انتخاب جیت کر، یہ امید پیدا کر دی ہے کہ ان کے لیے بھی زندگی میں بڑے سے بڑا موقع اپنا دروازہ کھول سکتا ہے۔ لیکن کینیڈی نے ایک سینیٹر کی حیثیت سے آٹھ سال اپنے دفتروں کے دروازے ضرورت مندوں پر جس طرح کھولے رکھے، جس طرح اپنے علاقے کے لیے اسمبلی میں مہم جاری رکھی اور پھر جس طرح ملکی مفاد اور

علاقائی مفادمیں مفاہمت کا راستہ تلاش کیا اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا یقیناً دُنیا کی اسمبلیوں نے ایسے بڑے بڑے ہیرو پیدا کیے ہیں کہ ان میں کینیڈی کا کوئی خاص مقام نہیں لیکن یہ ایک سامنے کی مثال ہے اور ہمارے لیے یہ معنی رکھتی ہے کہ ہم اگر زندہ قیادت ابھارنا چاہتے ہیں تو ان لوگوں کو خواہ وہ امیر ہوں یا غریب، اپنے منصب اور اس کے لوازمات سے آگاہی ہونی چاہیے ورنہ وہی ڈھاک کے تین پات والا معاملہ رہے گا۔

اس ضمن میں جہاں تک بنیادی جمہوریتوں کا تعلق ہے عام اندازہ یہ ہے کہ سب سے ابتدائی اور انتہائی سطحوں پر تو نیا جوش و خروش پایا جاتا ہے لیکن درمیانی سطحوں پر ابھی تک یہ حال ہے کہ چیئرمین، تحصیلدار کی آمد پر اسے اپنے علاقے کے مسائل سے آگاہ کرنے، مشورہ کرنے، تجویزیں پیش کرنے کے بجائے اس کے لیے مُرغ ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ ڈپٹی کمشنروں میں جو تازہ نسل ہے وہ تو پھر کبھی کوئی نیا تجربہ کرنے کی جرأت کرلیتی ہے لیکن جو ذرا پرانے گھاگ ہیں وہ خواہ الجھنوں میں پڑنے کے لیے تیار نہیں۔ اب اس کی اعلیٰ سطح کا احوال بھی سُن لیجیے: مغربی پاکستان میں بنیادی جمہوریتوں کی صوبائی کونسل کا پہلا اجلاس ہوا تو صوبے بھر کے غیر سرکاری اراکین نے جتنی تجویزیں پیش کیں وہ انھیں واپس لینی پڑیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سرکاری اراکین یہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر ان کی کوئی تجویز تسلیم کرلی گئی تو گویا یہ ہماری کوتاہی کا ثبوت ہوگی کہ ہم سے یہ بات چھپی ہوئی تھی۔ اُدھر غیر سرکاری اراکین اپنی حمایت میں کوئی دلیل پیش کرنے کے بجائے جس سدھے ہوئے انداز میں اپنی تجویزیں واپس لے رہے تھے اس سے گمان ہوتا تھا کہ ان تجویزوں کے پیچھے زیادہ

سے زیادہ اگر کوئی مطالعہ ہے تو کسی روزنامے میں ایڈیٹر کے نام خطوط کے کالم، جن میں یار لوگ لکھنے کی مشق کرنے کی خاطر ہر بات کو چٹکیوں میں اڑا کر رکھ دیتے ہیں۔ چنانچہ اس اجلاس میں بھی ہر بات چٹکیوں میں اُڑا دی گئی۔ اب دوسرے اجلاس کی رُوداد کا ایک حصہ پاکستان ٹائمز کی زبانی سنئے:

"افتتاح کے روز بحث کا جو انداز قائم ہو گیا بعد میں بھی اس میں کوئی فرق نہ پڑا۔ حالانکہ مسائل خاصے اہم تھے مگر اراکین کے پیش نظر صرف یہ بات تھی کہ وقت کے اندر اندر سب مسائل نبٹ جائیں۔ قومی اہمیت کے مسائل بھی اجلاس میں گرمی نہ پیدا کر سکے۔ حیرت ہے کہ کسی بھی تجویز کی تائید نہ ہو سکی اور سرکاری اراکین کی وضاحت پر ہر تجویز واپس لے لی گئی۔ معاملات کی نوعیت ایسی تھی کہ ان پر عوامی مفاد کے پیش نظر پوری روشنی ڈالی جاتی لیکن سرکاری اراکین نے جو بھی معلومات اس ضمن میں پیش کیں غیر سرکاری اراکین نے کافی سمجھ کر بات آگے بڑھانی لاحاصل جانی۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اراکین کو ان مسائل سے گہری واقفیت نہیں، نہ اُنھوں نے کوئی تیاری کی ہے اور نہ انھیں زیادہ دلچسپی ہی ہے۔ اس کی سب سے واضح مثال وقفۂ سوالات تھا کہ پندرہ منٹ میں غیر سرکاری اراکین کے تقریباً پچاس سوالوں کے جوابات سرکاری اراکین کی طرف سے پیش کر دیئے گئے۔ صاف ظاہر تھا کہ سوال کرنے والوں کو سوال کی معنویت اور جواب کے مختلف پہلوؤں کی کوئی خبر نہ تھی ورنہ ایک ایک مسئلے کے کئی کئی ضمنی پہلوؤں پر بھی سوالات پوچھے جاتے۔ جن تین چار غیر سرکاری اراکین نے ضمنی پہلوؤں پر سوال کیے بھی وہ بھی ایک سوال کی حد سے آگے نہ بڑھ سکے اور یہ سوال بھی مبہم الفاظ میں کیے

گئے تھے۔"

ارسطو کا چٹکلا ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک سیاسی جانور ہے
کوئی معاشرہ معاشرتی تنظیم کے بغیر کام نہیں کر سکتا اور سیاسی نظام بھی معاشرتی
تنظیم کا لازم حصہ ہے۔ بے شک کسی فلسفی کی نگاہ میں طوائف الملوکی یا انار کی
سیاسی نظام کی جگہ لے لیکن تاریخی تجربہ انسان کو یہی بتاتا ہے کہ یہ کھیل زیادہ
دن نہیں رچایا جا سکتا، کسی نہ کسی طرح کا سیاسی نظام قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔ اصل
میں سیاست کو سیاست دانوں کی تنگ نظری اور نااہلی ایک قابل نفرت چیز بنا
دیتی ہے۔ حالانکہ خرابی سیاست یا سیاسی نظام کی نہیں سیاست دانوں کی ہوتی
ہے۔ سیاسی نظام کو سرے سے ختم کرنے کی سوچنے کے بجائے ایسی قیادت
ابھارنے کی تدبیر کرنی چاہیے جو عوامی مفاد اور شخصی آزادی کے تحفظ کے پیش نظر
حکومت کے کاروبار کو صحیح خطوط پر چلا سکے بلکہ یوں کہیے کہ سیاسی نظام کا
کام چونکہ ایک آزاد معاشرے میں عوامی مفاد کے ساتھ ساتھ فرد کی آزادی کا تحفظ
ہوتا ہے اس لیے اسے ہمیشہ اپنی سرگرمیاں ان حدود کے اندر ہی رکھنی چاہئیں
بے شک عوامی مفاد کا تصور بعض معاملات میں غیر واضح رہتا ہے لیکن مجموعی طور سے
اس کے پیش نظر کسی معاشرے میں کوئی ایک جماعت دوسری جماعتوں کے مفادات
کو پس پشت ڈالنے سے باز رہتی ہے۔ پھر آزاد معاشروں میں سیاسی نظام ہی سب
کچھ نہیں ہوتا جیسا کہ فاشی یا اشتراکی معاشرے میں ہوتا ہے بلکہ یہاں انسانی عمل
کے میدان کے کم سے کم رقبے کو سیاسی نظام کے تحت رکھنے کی کوشش ہوتی ہے
تاکہ افراد معاشرہ کی بہت سی سرگرمیوں کو آزادانہ پھولنے پھلنے کا موقع ملتا رہے۔

صحت منداور بیدار مغز قیادت کے ذمّے یہی کام ہوتا ہے کہ سیاسی نظام یا حکومت کا کاروبار مفادِ عامہ اور انفرادی آزادی کے تحفّظ کی حدود سے تجاوز نہ کرنے پائے اس کے لیے محض یہی کافی نہیں ہوتا کہ ملک میں جمہوریت رائج ہو، اسمبلی میں بحث مباحثے کی اجازت ہو یا تقریر و تحریر کی آزادی ہو، یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی جائز حدود سے تجاوز ممکن ہے کیونکہ جب تک ملکی قیادت اپنے حقوق کا صحیح استعمال نہ سیکھے گی اور جب تک وہ اپنی اہم ذمّہ داریوں کے مطابق کام کرنے کی اہل نہ ہوگی اُس وقت تک اُس کے فیصلے دُور رس نتائج کے حامل نہیں ہوسکتے اور نہ معاشرتی اقدار کی سلامتی عمل میں آسکتی ہے۔

۳

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے آج کے دور میں قیادت کا ذکر کرتے ہوئے سرکاری افسروں کا ذکر نہ کرنا غلط ہوگا، خصوصاً ہمارے یہاں کے حالات میں تو سرکاری افسروں کی اہمیت بے حد زیادہ ہے کیونکہ (۱) ہمارے پیشہ ور سیاستدان کم از کم ایک مرتبہ بُری طرح پٹ چکے ہیں، نئی سیاسی قیادت ابھی اُبھری نہیں اور بنیادی جمہوریتوں نے اس ضمن میں خاطر خواہ نتائج نہیں پیدا کیے (۲) سرکاری افسر اپنی تعلیم، سماجی تحفّظ، اختیارات اور ایک صدی کی تاریخ غلامی کے پس منظر میں اپنے خصوصی مرتبے کے تحت پورے معاشرے میں سب سے زور دار طبقہ ہیں (۳) موجودہ دَور میں حکومت کا کاروبار اتنا پیچیدہ ہو گیا ہے کہ سرکاری افسروں ہی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس پیچیدہ مشین کے داؤ پیچ سے ماہرانہ طور سے واقف ہوں چنانچہ سیاسی نظام میں فیصلہ کرنے والی جماعت، قانون ساز مجلس

کے اراکین اور سربراہِ حکومت کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ سرکاری افسروں سے مشورہ کریں بہت سی تجاویز کو قانونی شکل دیں کیونکہ سرکاری افسر ہی بہترین طور سے یہ بتا سکتے ہیں کہ کوئی بات عملی طور سے کس حد تک ممکن یا محال ہے۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ بات بے حد اہم ہے کہ سیاسی نظام میں سرکاری افسروں کی اہمیت کو اس کے مناسب مقام پر ہی رکھا جائے، ورنہ ملک میں افسر شاہی نظام چل نکلے گا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ افسر شاہی میں کیا قباحت ہے اور اگر کوئی قباحت ہے تو وہ کون سی تدابیر ہیں جو سرکاری افسروں کو اپنی حد سے متجاوز نہ ہونے دیں؟

کسی کو یہ بات پسند ہو یا ناپسند، سرکاری افسروں کی تعداد باہر کی طرح ہمارے یہاں بھی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے ہی نہیں کہ حکومت نئے نئے منصوبے بناتی رہتی ہے اور اس کے دائرۂ عمل میں پچھلے چالیس پچاس سال سے رفاہِ عامہ اور تعلیم کے وسیع میدانوں کا اضافہ ہو گیا ہے اور زراعت، صنعت، تجارت، قدرتی ذرائع کی ضرورت نے مختلف نئے اداروں کو جنم دے دیا ہے۔ بلکہ اس لیے بھی کہ دفاع کے سلسلے میں حکومت کا کام کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ آبادی میں اس قدر اضافہ ہو گیا ہے کہ جو کام حکومت شروع سے کرتی آئی ہے ان میں توسیع لازم آ گئی ہے۔ تو کیا یہ صورتِ حال خطرناک ہے؟ صرف اس صورت میں کہ یہ طبقہ جو اپنے مقام کے اعتبار سے عوام کا خادم ہے ان کا آقا بننے کی ٹھان لے یا بن بیٹھے۔ افسروں کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ مشورہ دیں اور فیصلوں کو لباسِ عمل پہنائیں لیکن جب وہ فیصلے کرنے بیٹھ جاتے ہیں تو

ان قباحتوں کا آغاز ہوتا ہے جو افسر شاہی سے منسوب کی جاتی ہیں۔ یہ قباحتیں مختصراً یوں بیان کی جاسکتی ہیں :

(۱) افسر لوگ عام انتخابات پر سایہ ڈالیں گے (۲) افسر لوگ عوام کو ملکی اور قومی مسائل کے بارے میں صحیح معلومات بہم نہ پہنچائیں گے۔ (۳) افسر لوگ عوام کی رضا کے خلاف ایسے پروگرام اور پالیسیاں مرتب کریں گے کہ سالمیت کی فضا باقی نہ رہے گی۔ (۴) افسر لوگ سیاسی جماعتوں کو مناسب و موزوں پروگرام مرتب کرنے میں تائید و تعاون سے محروم رکھیں گے۔ (۵) افسر لوگ اپنی حدود سے متجاوز ہو کر حکومت پر عوام کے اعتماد کو ضعف پہنچائیں گے۔ (جارلس ایس ہائنمین ـــ "جمہوریت میں افسر شاہی")

یقیناً سرکاری افسروں کی کوئی جماعت اگر نیت کرے اور ان ہتھکنڈوں پر عمل پیرا ہو جائے تو ملک میں جمہوریت کا پنپنا محال ہو جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ یہ جماعت باہم پیوستہ ہو اور ماتحت لوگ ان سے پورا پورا تعاون کریں۔ پھر یہ جماعت چاہے تو خود حکومت پر قبضہ کرلے یا کسی ایک سیاسی جماعت کی پشت پناہ بن جائے اور یوں سیاسی نظام کے لیے اور ملکی سلامتی کے لیے ایک خطرہ بن جائے۔

جہاں تک اس خطرے کے سدِ باب کا تعلق ہے پہلی اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اہلِ ملک میں سیاسی نظام کی کوئی پائدار روایت موجود ہو یا پھر اس کی داغ بیل ڈالی جائے۔ جب تک افراد و معاشرہ میں شخصی آزادی اور معاشرتی اقدار کے تحفظ کا احساس پیدا نہیں ہوتا تب تک ملک خواہ بھاڑ میں چلا جائے

رکسی کو کچھ پروا نہیں ہوتی اور اگر ان اقدار پر عام ایمان ہو تو افسر لوگ بھی جو عوام ہی میں سے اُبھرتے ہیں، انھیں بھی ان اقدار کی بے حرمتی کرتے ہوئے خوف محسوس ہوتا رہتا ہے۔ اس ضمن میں یہ اہتمام بھی ضروری ہے کہ سرکاری افسر معاشرے کے کسی ایک طبقے کی نمائندگی نہ کرتے ہوں یعنی وہ نہ تو کسی ایک علاقے ہی سے ہوں، نہ کسی ایک فرقے ہی سے ہوں، نہ صرف غریب یا متوسط یا امیر لوگوں ہی میں سے چُنے جائیں۔ اس طرح انھیں بآسانی ایک محاذ کھڑا کرنے کی سہولت نہ ہوگی۔

اسی طرح، اگرچہ اپنی جگہ اس کی ضرورت بھی ہوتی ہے کہ مختلف سرکاری محکموں میں اتحاد و الحاق کر دیا جائے لیکن اگر الحاق کی یہ رَو اس حد تک بڑھ جائے کہ ملک میں بس چند ایک بڑے بڑے محکمے ہوں تو چند بااثر اور بارسُوخ افسر بآسانی مل جل کر افسر شاہی کی فضا پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لیے افسر شاہی کے سدِّباب میں اختیارات کی تقسیم اہم حصہ لیتی ہے اور مرکز اور صوبائی حکومتوں کے نظام، پھر کمشنریوں اور اضلاع کی تقسیم در تقسیم سے افسروں کو باہم سیاسی نوعیت کے اختیارات سنبھالنے کی سازش کرنے کے مواقع کم ملتے ہیں۔

لیکن سب سے مؤثر ذریعہ تو یہی ہے کہ جو لوگ عوام کی نمائندگی کرتے ہیں، قانون ساز اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں وہ اپنے کام سے پُوری طرح آشنا ہوں اور ملکی اور علاقائی مسائل پر اُن کی اتنی گہری نظر ہو کہ افسروں کو خود ہی اپنے اصل مقام سے متجاوز ہونے کی مہلت نہ ملے۔ اسی طرح اگر عدلیہ اپنے آپ کو دستور سے وفادار رکھے اور ملک میں قانون کی حکومت ہو تو پھر شخصی آزادی اور معاشرتی

اقدار کسی کے ہاتھوں میں بھی کھلونا نہیں بن سکتیں۔

۴

اگر ہم اپنے ملکی منظر پر ایک خاص زاویے سے نگاہ ڈالیں تو اس کے دو ترکیبی عنصر سامنے آئیں گے (۱) ہماری بیشتر آبادی اَن پڑھ ہے اور آبادی کے اِس حصّے کو عوام کہا جا سکتا ہے۔ (۲) ایک مختصر سی جماعت (ہندو فی صد) پڑھے لکھوں کی ہے جسے ارباب اختیار یا اہل حکومت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ تقسیم یقیناً بہت عمومی ہے لیکن ہمارے تعلیم یافتہ ہم وطن چونکہ اکثر و بیشتر حکومت کی ملازمتوں ہی میں کھپ جاتے ہیں اس لیے یہ تقسیم ایسی غلط بھی نہیں۔

جہاں تک تعلیم کی نوعیت اور مزاج کا تعلق ہے وہ ہمارے یہاں ہی نہیں، کل تک، باہر، بظاہر ترقی یافتہ ممالک میں بھی، عملی زندگی سے بے تعلق چلی آ رہی تھی۔ یہ تو محض پچھلے چند سالوں کی بات ہے کہ وہاں تعلیم کو عملی زندگی کے تابع کیا گیا ہے اور یہ بات اپنی جگہ اُس اوّلیں اور ہمہ گیر رجحان کا بس ردّ عمل ہے اور جیسا کہ ہر ردّ عمل کی تقدیر ہے کہ اس کی لپیٹ میں آکر پہلے دستور کے فائدوں کی صف بھی اُلٹ جائے ویسا ہی حال وہاں کے تعلیمی پروگراموں کا ہے جو رُوس کی کاریگرانہ پیش قدمیوں کے تعلق سے زیادہ شدّت کے ساتھ کاروباری انداز اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ تعلیم جس کی عمارت کبھی کلاسیکی ادب کی بنیادوں پر اٹھائی جاتی تھی جس کا کام کبھی ذہن کو جِلا دینا اور روح کو جگمگا دینا تھا اب اس کے سپرد یہ خدمت ہے کہ ذہن کُند ہوتے ہوتے محض ہتھیارہ رہ جائے یا روح سوتے سوتے جسم کی چار دیواری سے ہجرت کر جائے اس کی پروا نہیں لیکن وہ جسمانی آسائش

اور مادی برتری کی سبیل ضرور کرے۔ چنانچہ تعلیم کا سارا زور باہر اب اس بات پر صرف ہو رہا ہے کہ انسان کو ایک کارآمد مشین بنا دیا جائے، جو مشینیں ایجاد کیا کرے اور جسے اپنے راشن پانی کی ایسی فکر نہ ہوا کرے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارے یہاں اگرچہ تعلیم کے ساتھ ابھی یہ سلوک نہیں ہوا لیکن پھر بھی پرانے تعلیمی نظام کا کوئی مسلمہ فائدہ ہماری زندگیوں میں گندھا ہوا نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر عملی تعلیم کو ہم نے عملی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی ایک راہ وا پائی تھی اور یہ تھی حکومت کی ملازمت۔ چنانچہ ہم یہ تعلیم پاکر بھی اس تعلیم کے فائدوں سے محروم رہے کیونکہ اس سے ہمارا تعلق ناجائز تھا۔ بہرحال یہ فائدہ ضرور ہوا کہ جب ملک آزاد ہونے لگا تو ہمیں یہ فکر نہ تھی کہ دفتروں میں کام کیونکر ہوگا۔ ہمارے پاس پڑھے لکھوں کی ایک جماعت حاضر موجود تھی یہ الگ بات ہے کہ اس جماعت کو رائج تعلیمی نظام کی بنا پر عملی زندگی کا خاک تجربہ نہ تھا اور رفاہی مزاج کی تعلیم کو سراسر مادی فائدوں کی خاطر حاصل کرنے کی بنا پر یہ جماعت ذہنی اور روحانی نشوونما سے بھی محروم تھی۔ ہمارے یہاں فی الحال یہی جماعت برسرِ اقتدار ہے۔

جب ہندی مسلمانوں کی حیثیت سرزمینِ ہند میں محکوموں کی نہ تھی تو ان میں تعلیم کے اعتبار سے باہم یہ تفاوت نہ تھا۔ تعلیم ایسی کمیاب بھی نہ تھی، اور مختلف جماعتوں میں اس کی سطح ایسی اونچی نیچی بھی نہ تھی۔ پھر جب انگریز اس ملک پر پوری طرح حاوی ہو گیا اور انگریزی تعلیم معاشرتی حقوق و اختیارات کا ایک ذریعہ بن گئی تو تعلیم یافتہ یا پڑھے لکھوں اور غیر تعلیم یافتہ یا ان پڑھوں

بلکہ "انگریزی پڑھے ہوؤں" اور "انگریزی نہ پڑھے ہوؤں" کی تفریق نے سر اُٹھایا۔ ابتداءً انگریزی خوانوں سے نفرت بھی کی گئی اور یہ نفرت اپنی جگہ اب بھی موجود ہے لیکن اب، بعد میں، اس نفرت پر مرعوبیت کا سایہ ایسا پڑا ہے کہ یہ نفرت اندر ہی اندر رہ کر کھُل کھیلنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ اب وہ جماعت جسے عوام کا لقب دیا جاتا ہے پڑھی لکھی جماعت کے سامنے جھکتی بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس احساس کی بنا پر ان لوگوں سے بدگمان بھی ہے کہ انھیں ہمارے مسائل کا کوئی اندازہ نہیں۔ ان لوگوں کو اُس تجربے کی کوئی قدر نہیں جو صدیوں سے ہمیں زمین سے براہِ راست متعلق ہونے کی بدولت حاصل ہے، یہ لوگ محض اس لیے ہمارے حاکم بن بیٹھے ہیں کہ انگریزی کے چار بول پڑھ گئے ہیں اور ہم اس لیے ان کی اطاعت کر رہے ہیں کہ ہمیں وہ چار بول نہیں آتے۔ انگریزی نہ پڑھے ہوئے عوام کو اپنے بُرے بھلے علم پر بھی بھروسا نہیں رہا کیونکہ یہ علم انھیں معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں دلاتا۔ اس طرح تجربے اور علم کی ایک وسیع مقدار بالکل بیکار ہو کر رہ گئی ہے اور جس طرح جسم کا کوئی حصّہ مفلوج ہو جائے تو جسم پر بوجھ بن جاتا ہے اسی طرح یہ بے کار تجربہ اور علم ہماری قومی زندگی کے لیے گھُن بن گیا ہے۔

یہ وہ تفریق ہے جسے اگر ہم اپنے یہاں نئی قیادت اُبھارنے کی تدبیر کرتے ہوئے نہ مٹا سکے تو ہمارا کام بگڑ جائے گا جب تک ہم اپنے پڑھے لکھوں میں عملی مسائل سے گہری واقفیت پیدا نہیں کرتے اور جب تک ہمارے پڑھے لکھے اپنے اَن پڑھ لیکن تجربہ کار ہموطنوں کے اعتماد کے حصول میں ناکام رہتے ہیں اس وقت تک ہمارے یہاں سلامتی کی فضا نہیں اُبھر سکتی۔ جس طرح ایک صحت مند گھرانے میں مرد

اور عورت مل جُل کر زندگی کا سامان کرتے ہیں کہ مرد فتوحات کرتا ہے ، نئی نئی باتیں سوچتا ہے اور عورت مفتوحات کا انتظام و انصرام کرتی ہے ، خیالات کو عمل سے ہم کنار کرتی ہے۔ اسی طرح ہم جب تک یہ اہتمام نہیں کرتے کہ ہمارے پڑھے لکھوں کے خیالات اور ہمارے عوام کی صلاحیتوں میں رفاقت پیدا ہو اس وقت تک یہی ہوتا رہے گا کہ پڑھے لکھے بدلتی ہواؤں کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے خیالات کے اسیر ہو کر رہ جائیں گے ، انھیں نت نیا خیال اپنے دام میں اٹکائے گا ، وہ آج جو کچھ سوچیں گے کل اسی کی نفی کرتے پھریں گے ، آج جسے بُرا بھلا کہیں گے کل اسی کا کلمہ پڑھتے نظر آئیں گے اور عوام جو پڑھے لکھوں کے علم سے اتنے مرعوب ہیں وہ ان کے گرگٹ رنگ منصوبوں کے اُلٹ پھیر میں شل ہو کر رہ جائیں گے یا پھر ان سے ڈھکی چھُپی نفرت کی بنا پر ان کی تجاویز کو تسخی ان سُنی کرتے رہیں گے۔

اگر ہم ملک میں کسی نظامِ حکومت یا دوسرے لفظوں میں سیاسی نظام کے قائل ہیں اور چاہتے ہیں کہ پُوری قوم اپنے اپنے حصّے کے فرائض انجام دے ، ملکی تعمیر میں ہر شہری حصّہ لے ، اس کی قوتِ فکر و عمل ملک کی بہتری کے لیے صرف ہو تو ہمیں اپنے ان دونوں طبقوں — پڑھے لکھوں اور اَن پڑھوں — میں اعتماد کی رُوح پھُونکنی ہوگی ۔ فی الحال تو ہمارے پڑھے لکھے یہ سمجھتے ہیں کہ اَن پڑھ طبقہ جاہلِ مطلق ہے ، وہ یہ بھُول جاتے ہیں کہ یہ طبقہ صدیوں کے عقائد اور تجربے کا محافظ ہے۔ وہ عوام کی اپج کے مطابق چلنے کا ذکر تو بہت کرتے ہیں لیکن ان کے مزاج کی افتاد کا بعور جائزہ لینا ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ ان کے خیال میں عوام ایسے گئے گزرے ہیں اور ان کے پاس جو کچھ ہے وہ ایسا فرسودہ ہے کہ نئے دَور میں ان چیزوں کی پھُوٹی کوڑی

کی بھی اہمیت نہیں۔ اُدھر عوام یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ پڑھے لکھے ہیں، انھیں دُنیا میں عزت و مرتبہ حاصل ہے، طاقت حاصل ہے اس لیے ہم جیسے غریبوں کے مقابلے میں جو کہتے ہیں وہی برحق ہے لیکن ان کی باہمی دُوری انھیں ان "برحق" باتوں پر عمل سے روکے رکھتی ہے۔

اِس صورت میں اگر ہمارے یہاں کوئی سیاسی نظام بُعد نہیں مٹاتا تو اس کی قسمت میں شکست ہی شکست ہے، خواہ اسے دُنیا بھر کے ماہرین قانون کے مشورے سے استفادے کا شرف حاصل ہو یا اس میں کسی ایک یا تمام اہل حکومت کی بہترین نیّت شامل ہو۔

اِس صورت کا سامنا کرنے کے لیے یہ لازم ہے کہ فکر اور عمل کے سرچشموں، پڑھے لکھوں اور اَن پڑھوں، کو ایک دُوسرے کی صلاحیتوں اور مقام کا صحیح صحیح احساس دلایا جائے۔ جو کچھ عوام کے پاس عقائد اور تجربات کی صورت میں محفوظ ہے اس کا اس نظر سے جائزہ لیا جائے کہ اسے کس طرح نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؛ عوام کے عقائد کا مذاق اُڑانے کے بجائے ان عقائد کو کیونکر نئی ضرورتوں کا احاطہ کرنے کا اہل ثابت کیا جا سکتا ہے؛ عوام کے عملی تجربے کو کیسر ملیامیٹ کرنے کے بجائے کیونکر اس تجربے کی حوصلہ افزائی کی جا سکتی ہے اور اس میں کیونکر وسعت کا سامان کیا جا سکتا ہے؟ یہ باتیں صرف اسی صورت ممکن ہیں کہ عوام پڑھے لکھوں سے دُوری محسوس نہ کریں، نہ تو مرعوبیت کے جذبات کے تحت احساس نامرادی میں غلطاں رہیں، نہ اپنی قوتوں کو نئے خیالات کے آگے دیوار بنانے پر صرف کرتے رہیں۔ اگر ایک مرتبہ ہم نے عوام کو خود اپنے اوپر اعتماد کرنا سکھا دیا تو پھر وہ اپنے ان فائدوں

کی بات سُننے کے لیے بھی تیار ہو جائیں گے جو ان کے عقاید بدلنا چاہتے ہیں، اُنھیں نئے تجربات پر آمادہ کرنا چاہتے ہیں، اُنھیں نئی زندگی سے ہم کنار کرنا چاہتے ہیں۔ عزتِ نفس ہی عوام کو وہ آزادی بخش سکتی ہے جو کسی صحیح فیصلے پر دل سے کاربند ہونے کے لیے ضروری ہے۔

۵

یہ بات اب عام ہو چکی ہے کہ "حکومت کرنی چاہتے ہو تو اطاعت کرنی سیکھو" لیکن بہت سی عام باتوں کی طرح یہ بات بھی بہت زندہ معنی رکھتی ہے اگرچہ بہت سی عام باتوں کی طرح اس پر بھی فرسودگی اور عمومیت کا سائبان تن گیا ہے۔ اطاعت کو آپ خدا کے فرمان أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ کی کسوٹی پر کَس کر قبول کریں یا رُوسو کے معاہدۂ عمرانی کو بنیاد بنا کر اپنے یہاں جگہ دیں جب تک یہ قدر معاشرے میں جاری وساری نہیں ہوتی تب تک ایسی قیادت اُبھر ہی نہیں سکتی جسے اپنے اور اپنے عوام پر اعتماد ہو اور جس پر عوام دل و جان سے بھروسا کریں۔

اطاعت کا مطلب غلامی نہیں ہے لیکن اطاعت کے اُصول کی بدقسمتی یہی ہے کہ اطاعت کو اکثر غلامی کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ خاص طور سے پچھلے دو سو سال کی تاریخ میں قوم پرستانہ جذبات کے اُبال نے بغاوت کی جس طرح بلائیں لیں اس سے اطاعت روز بروز ماند پڑتی گئی۔ باغی ہونا اور کہلانا فیشن میں داخل ہو گیا۔ غیر ملکی سیاسی، اقتصادی تسلط کے خلاف ہوتے ہوتے لوگ معاشرتی اقدار، شخصی اخلاق بلکہ ذاتی نشوونما تک سے باغی ہو گئے۔ سماج کو گالیاں دینا صرف افسانہ نگاروں اور شاعروں

ہی کا خاصہ نہ رہا عامیوں کی بغاوت بھی ان کے ہم کاب ہوگئی۔ سماج اپنے رہنے سہنے سے غفلت و بے پروائی بھی نشانِ امتیاز ٹھہری۔ لاأبالی پن عشق و عاشقی کا جھنڈا مفرّ ہُوا۔ گھر کی پُرانی دیواریں اندھی انانیت کے سیلاب میں ڈھے گئیں اور ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ سے مسجد کے بجائے قلعہ بنا کر اس میں محصور ہو گیا۔ انسانی رشتے یا تو بامعنی نہ رہے یا ان کے معنی کاروبار سے خلط ملط ہوگئے۔ ماں باپ کے بارے میں لوگوں کو یہ کہتے پایا گیا کہ ہمارے ملازم ہیں کیونکہ ابھی اُنھوں نے پاجامے یا شلوار یا تہبند کی جگہ پتلون کے آگے ٹانگیں نہ پساری تھیں یا انگریزی کے دو اکھشر نہ رٹے تھے یا عورت کی غُلامی کی نشانی، چٹیا، نہ کٹوائی تھی۔ پوتوں نے جب بابو کو داداؤں کی ڈاڑھی نوچتے دیکھا تو وہ بھی باپوں کی مونچھیں پیشاب سے مونڈنے کی تیاری کرنے لگے۔

ہم یہ تو کہہ دیتے ہیں کہ اصلی جمہوریت کا ہمارے یہاں سے جنازہ اُٹھ گیا کبھی ہم نے یہ بھی سوچا کہ یہ وفات حسرت آیات واقع کیونکر ہُوئی۔ جمہوریت کی بھی جڑیں اطاعت ہی کے پانیوں سے سیراب ہوتی ہیں۔ دس آدمی سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں، اکثریت ایک فیصلہ کرتی ہے، اقلیت اس فیصلے کے حق میں نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے آگے سر جھکا دیتی ہے جب اس فیصلے پر عمل درآمد ہوتا ہے تو وہ اس کا بائیکاٹ نہیں کرتی، اس میں اس طرح، اس تن دہی سے حصّہ لیتی ہے کہ اکثریت و اقلیت یا موافق و مخالف کا فرق نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہمارے یہاں جمہوریت کا مطلب یہی رہا ہے کہ اگر آپ کو دوسروں سے اختلاف ہے تو دوسرے اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں، آپ ان سے تعاون نہیں کریں گے۔ آپ کا تعاون صرف اسی کے لیے

ہو گا جو آپ کا ہمنوا ہے یا جو آپ کے مفادات کے تحفظ کی گارنٹی دیتا ہے۔

ہم آئے دن اخباروں میں، جلسوں میں، ریڈیو پر قومی و ملکی تعمیر کی اپیلیں پڑھتے اور سُنتے ہیں "قوم کو چاہیے . . . . ." لیکن قوم ہے کہ زمین جنبد نہ جنبد گل محمد۔ اب بھلا کوئی خواہ مخواہ ٹوڈی بچہ کیوں کہلوائے جس معاشرے کو خدا کی اطاعت سے چلتے ہوئے جسم کے فطری تقاضوں کی اطاعت تک سے بغاوت کا بخار چڑھا ہوا ہے وہ حکومت کو یا قیادت کو کیا خاطر میں لائے گا۔

جس طرح اطاعت کو غلامی سے گڈمڈ کیا جاتا ہے اسی طرح اسے تقلید کا ہم معنی بھی گردانا جاتا ہے۔ یہ حقیقت واقعی جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ غلامانہ صفات نے ہمیں صدیوں سے جابر سلطانوں کے ظلم و ستم کا شکار بنائے رکھا ہے اور ہم ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیاں بنے رہے ہیں، ہم نے چوں تک نہیں کی۔ اسی طرح تقلید نے بھی ہمیں صدیوں واہیات توہمات میں جکڑے رکھا ہے۔ لیکن انسان کا اختیار ہے کہ وہ رحمتوں کو زحمتیں بنا لے یا زحمتوں کو رحمتیں سمجھ لے۔ وہ اطاعت جو اس کی خودی کی جلا کے لیے صیقل کا حکم رکھتی تھی اس کے اختیار کی گردن میں لعنت کا طوق بن گئی، اس نے اسے ایک طرف غلط معنی پہنا کر غلامی اور تقلید کی شکل دے دی اور دوسری طرف ردِ عمل کے زیرِ اثر اس سے مادر پدر آزاد ہو گیا۔ لیکن اس سے اطاعت کے اصول کی اصل معنویت تو ختم نہیں ہو جاتی۔

اطاعت کا اُصول زندگی کی بنیادوں میں شمار ہوتا ہے جس نے اللہ کے سامنے سرِ نیاز جھکایا زندگی اسی کی ہے کہ صرف اسی صورت انسان خوف و حزن سے آزاد ہو سکتا ہے۔ جسے خُدا کی بندگی قبول ہے، جو خدا کو اپنا مولیٰ بناتا ہے اُسے کسی کی غلامی

کی ضرورت نہیں لیکن خدا کی بندگی میں باہم مشورے کی قدر شامل ہے، خدا کی بندگی میں اولوالامر کی اطاعت شامل ہے، ویسے ہی جیسے اس میں ماں باپ کا احترام بھی شامل ہے، حاجت مندوں کا احساس بھی شامل ہے، اپنی ضرورت سے زاید کو دوسروں پر خرچ کرنا بھی شامل ہے، پورا تولنا، وعدے کا پاس کرنا، صداقت کو شعار بنانا بھی شامل ہے۔ اگر اللہ اس اطاعت سے محروم رکھے تو بھی اطاعت کا اصول زندگی میں جاری وساری محسوس کیا جاسکتا ہے، قوانین فطرت کے تحت ایک چیز جس طرح دوسری چیز کی اطاعت کرتی ہے وہ ڈھکی چھپی بات نہیں جب تک آپ انارکی یا طوائف الملوکی کو زندگی کا اصل اصول نہ قرار دے لیں اطاعت کی قدر آپ سے اپنا حق ضرور مانگے گی اور جب تک اطاعت اپنی صحیح شکل میں کارفرما نہیں ہوتی معاشرے میں صحیح قیادت نہ اُبھر سکتی ہے نہ پنپ سکتی ہے۔

زراعت پر زور

آج کل اقتصادیات دانوں کے یہاں ڈبلیو، ڈبلیو، روسٹو کی کتاب —— اقتصادی ترقی کی منزلیں (سٹیجز آف اکنامک گروتھ) — کا بڑا شہرہ ہے۔ روسٹو کی کتاب کا ذیلی عنوان — ایک غیر کمیونسٹ مینی فیسٹو — ہی چونکانے والا نہیں، اس کا نفسِ مضمون بھی خاصا خیال انگیز ہے۔ اہلِ مغرب اِس کتاب سے اس لیے بھی خوش ہیں کہ روس کو روسٹو کے دلائل جھٹلانے کی زحمت کرنی پڑی ہے۔ بات یہ ہے کہ روسٹو نے دورِ حاضر کی تاریخ کھنگال کر، ہر طرح کے معاشروں میں اقتصادی ترقی کی مختلف منزلوں کا سُراغ لگایا ہے اور اقتصادی ترقی کو محض اقتصادی مسائل تک محدود سمجھنے کے بجائے (کارل مارکس کے برعکس) اس کا رشتہ غیر اقتصادی معاملات سے متعلق ثابت کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب اقتصادی طور سے پس ماندہ ممالک کے لیے ترقی کا ایک ایسا لائحۂ عمل بن جاتی ہے جس میں سوشلزم یا کمیونزم کے بغیر بھی وہ نتائج حاصل ہوسکتے ہیں جو روایتی معاشروں کو بھرپور اقتصادی خوشحالی کی سطح پر پہنچا دیں۔

میرا مقصد روسٹو کی کتاب کا تعارف کرانا نہیں، اس میں بیشتر باتیں مغربی دُنیا سے متعلق ہیں۔ پھر ہمارے یہاں تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ ایٹم یا پوری دُنیا کے مسائل سے ہمیں کیا لینا دینا، اس لیے میں اپنی بات کو اس کتاب کے ضمن میں صرف یہیں تک

محدود رکھو ں گا کہ ہم جیسے روایتی معاشرے کو ' جو ترقی کے لیے مائل بہ پرواز ہے ' روسٹو کی کتاب کونسی دو چار باتیں بتا سکتی ہے ۔

اگر ان دو چار باتوں کو ایک ہی بات میں سمیٹنے کی کوشش کی جائے تو یہ نتیجہ یُوں لکھا جا سکتا ہے ، جس رفتار سے آبادی میں اضافہ ہوتا ہے اگر قومی دولت اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ صَرف میں آتی رہے تو ترقی کی منزلیں طے ہوتی چلی جائیں گی ۔ دوسرے لفظوں میں کسی روایتی معاشرے مثلاً پاکستان میں جہاں فی الحال اندازاً پانچ فی صد قومی دولت ہی فائدہ بخش کاموں میں لگائی جاتی ہے ، اگر یہ شرح بڑھ کر دس یا اس سے زائد ہو جائے تو اقتصادی ترقی کے ضمن میں روسٹو کی اصطلاح کے مطابق "پرواز" کی بنیادی شرط پوری ہو جاتی ہے ۔ مگر بات کو آسان بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس میں کچھ قباحتیں بھی رہ جاتی ہیں ۔ چنانچہ اس آسان نسخے کی سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ قومی دولت کے صَرف کی شرح میں اضافہ اکیلا کچھ نہیں کر سکتا ، اس کے ساتھ لوگوں کا سماجی طرزِ عمل بھی بدلنا ضروری ہے ۔ طرزِ عمل کی اس تبدیلی کا مطلب محض اتنا نہیں کہ لوگ کچھ نفسیاتی یا عمرانی طور سے کچھ تبدیلیوں کے قائل ہو جائیں اور عملی طور سے وہ اپنا طرز روایتی ہی رکھیں ۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ لوگ نئی علمی سائنس ، نئے اوزاروں ، نئی مشینوں ، پیداکاری کے نئے طریقوں ، نئے کاروباروں کے نئے خطروں ، نئے حالات اور نئے مسائل سے نئے رشتے قائم کرنے کے لیے تیار رہوں ۔

پاکستان کے تقریباً نوّے فی صد باشندے اپنی روزی زراعت یا زراعتی پیداوار کے رشتے سے حاصل کرتے ہیں مگر ہمارے یہاں آج بھی ایسے حضرات کی

کمی نہیں جو زراعت کی ترقی کو بیکار جانتے ہیں اور بڑی صنعتوں کے قیام کو قومی ترقی کے لیے امرت دھارا سمجھتے ہیں۔ قیام پاکستان کے پہلے چند سالوں میں ہم سے یہی بنیادی غلطی ہوئی کہ سوء قسمت سے ہمارے پاس زراعتی پیداوار کے جو امکانات اور سہولتیں تھیں ہم ان سے تو بے پروا ہو گئے اور صنعت کاری کی جادوئی چھڑی کی تلاش میں رو ٹی پانی سے بھی گئے۔ اس سلسلے میں غلام محمد براج کی مثال کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے کہ کروڑوں روپے کے صرف سے آبپاشی کا ایک عظیم منصوبہ لباسِ عمل پہنتا ہے مگر برسوں اُن زمینوں کی بانٹ ہی وجود میں نہیں آتی جنھیں اس منصوبے کے ذریعے سیراب ہونا تھا۔ چنانچہ وہ پاکستان جو اپنے قیام سے پہلے خوراک کے معاملے میں خود کفیل تھا اپنے قیام کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے امریکی گندم کھا کھا کر پیٹ کے درد میں مبتلا نظر آنے لگا۔ بہر حال صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو خیر باشد، اس لیے آج ایک مرتبہ پھر ہمیں زراعت سے اپنا ناتا جوڑنے اور اس ناتے کی بنا پر زراعت کا آؤ آدر کرنے کی توفیق ہو رہی ہے تو اس میں احساسِ شکست کے بجائے ہمارے لیے طمانیت کا مقام ہے کہ ہمارا اجڑا ہوا گھر اسی صورت میں بس سکتا ہے اور اسی صورت اس گھر کی دیواریں ہم اُونچی اٹھا کر ہے مرجع خلق بنا سکتے ہیں، جائے امن و امان و خوشحالی بنا سکتے ہیں۔

یہ بجا ہے کہ شروع شروع میں زراعتی یا روایتی طبقے خود بخود اقتصادی ترقی کے خطوط پر چلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اس لیے مرکزی حکومت کی ذمہ داری کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے، اسے بہت سے بنیادی اور نتائج خیز کام کرنے پڑتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ حکومت ذرائع پیداوار پر قبضہ کرے، اس کے برعکس حکومت کا کام

تو بس یہ ہونا چاہیے کہ ملک میں ایسی تجارتی منڈیوں کا جال بچھ جائے جہاں معروف اصولوں کے تحت لین دین ہوتا ہو۔ ٹیکسوں کی نوعیت ایسی ہو کہ لوگ نئے نئے لیکن ملکی ترقی کے لیے اہم کاموں میں روپیہ لگانے کو گھسے پٹے میدانوں کی نسبت زیادہ فائدہ بخش جانیں، آبپاشی اور مالیات سے لے کر تعلیم تک حکومت ہر شعبۂ زندگی میں ایسی پالیسی مرتب کرے کہ لوگوں میں بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے سے گریزاں رہنے کے بجائے مل جل کر قدم بڑھانے کی ضرورت کا عملی احساس پیدا ہو، ایسے سماجی معنویت کے حامل ترقیاتی منصوبوں کو عمل میں لایا جائے جن سے بیشک فوری طور سے مالی منفعت نہ ہو لیکن جو بالآخر مادی فوائد کے ساتھ ساتھ ملک میں تعلیم اور شعور کی وسعت و رفعت کا باعث ہوں۔ اس سلسلے میں ذرائع آمدورفت کی ترقی سب سے اہم حیثیت رکھتی ہے۔ پھر روایتی معاشروں میں مرکزی حکومت ہی ابتداءً ایسی رہنمائی مہیا کر سکتی ہے کہ زراعت اور قدرتی ذرائع کی پیداکاری میں فوری طور سے اضافہ ہو پائے۔ یہ رہنمائی جب تک میسّر نہیں آتی ترقی کا خواب ادھورا ہی رہے گا اور قدرتی ذرائع کی وسعت ہی اقتصادی ترقی کی تکمیل کی کلید ہے۔

روستو کہتا ہے:

> اقتصادی ترقی کی تیسری منزل "پرواز" کے لیے بے شک ایک معتبر کاروباری جماعت کی ضرورت پڑتی ہے جسے ملکی دولت کے بہاؤ اور صنعت کاری کے رجحانات پر خاصا اختیار حاصل ہو لیکن دنیا کے اکثر ممالک میں اس منزل کا آغاز زراعتی طریقوں میں فوری تبدیلی اور منڈیوں کی تنظیم ہی سے ہوا ہے۔ اکثر یہ ہوا ہے کہ صاحبِ زمین کسانوں نے "فرداً فرداً" یہ کام انجام دیا۔

اس کا مطلب ہے کہ اس منزل پر پہنچنے کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ کسانوں کی ایک ایسی جماعت اُبھرے جو اس بات کے لیے تیار بھی ہو اور اس کی اہل بھی ہو کہ زراعت کے جو نئے نئے طریقے نکلیں وہ انھیں برتے، اجتماعی کھیتی باڑی کو عمل میں لائے آمد و رفت کی سہولتوں سے فائدہ اُٹھائے، منڈیوں کی تنظیم اور قرضوں کی فراہمی سے فیض یاب ہو۔ کسانوں کی ایک چھوٹی سی با مقصد جماعت اقتصادی ترقی کا آغاز کرنے میں دُور رس حصّہ لے سکتی ہے، لیکن صرف اسی صورت میں کہ طرزِ عمل میں ہمہ گیر انقلاب پیدا ہو چکا ہو۔

جب تک کسی روایتی معاشرے میں زراعت یا قدرتی ذرائع ترقی نہیں کر پاتے تب تک ترقی کی تکمیل کا راستہ نہیں کھلتا۔ عام حالات میں اس کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ خوراک وافر مقدار میں پیدا ہو رہی ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ پٹ سن، کپاس، اون یا کھالوں کی پیداوار میں اضافے سے بھی وسیع حلقوں میں خوشحالی کا آغاز ہو سکتا ہے، بعض حالات میں جنگلاتی پیداوار بھی یہ کام کر سکتی ہے۔ معدنی ذخائر مثلاً کوئلہ یا گیس وغیرہ کی نکاسی سے بھی ترقی کو تازیانہ لگ سکتا ہے۔ اس صورت میں ملکی دولت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور لوگوں کے پاس وافر روپیہ ہوتا ہے جسے وہ دوسرے فائدہ بخش کاموں میں لگا سکتے ہیں اور یوں قومی دولت کے صَرف کی شرح میں اتنا اضافہ ہو جاتا ہے کہ "پرواز" کی منزل کا آغاز ہو جائے۔ اس ضمن میں ایک مزے دار بات یہ ہے کہ صنعت کاری کے لیے محض صنعت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صنعت کو اپنی رفتار اور معیار قائم کرنے کے لیے کچھ عرصہ

درکار ہوتا ہے۔ اس دوران میں حکومت سماجی نوعیت کے کاموں مثلاً ذرائع آمدورفت وغیرہ پر بے شمار رقم خرچ کر چکتی ہے، پھر آبادی میں خاصا اضافہ ہو چکتا ہے، سب سے بڑھ کر صنعت کاری کے لیے سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے، ان سب ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ زراعت اور قدرتی ذرائع کی پیداوار بڑھا کر دولت حاصل کی جائے، خود زراعت کو جدید ایجادات — نئے اوزاروں، نئی کھادوں وغیرہ سے لیس کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت پڑے گی کہ کسانوں میں زرعی پیداوار بڑھانے کا رجحان بڑھے تاکہ وہ نئے سازوسامان خریدنے اور استعمال میں لانے کے اہل ہو جائیں۔

شروع شروع میں جب ملکی دولت کی مقدار ابھی وہی ہوتی ہے جو پہلے تھی اور ساتھ ہی ساتھ صنعت کاری کے ذریعے ملکی دولت کے صرف میں وسعت کی کوشش کی جا رہی ہوتی ہے اور ادھر روز افزوں آبادی کے کھانے پینے کی سبیل بھی کرنی ہوتی ہے تو زراعت ہی کے بھروسے یہ دن جھیلے جا سکتے ہیں۔ خاص طور سے جب کہ صنعت کاری کے لیے جو مشینیں وغیرہ باہر سے منگوائی جاتی ہیں ان کے حصول کے لیے زرِمبادلہ بھی اکثر زراعت یا قدرتی ذرائع ہی کے ذریعے سے فراہم ہوتا ہے۔ جو بیرونی قرضے یا امدادیں حاصل ہوتی ہیں انھیں بھی آخر کسی نہ کسی دن لوٹانا ہوتا ہے، اُن کے لیے بھی بیش از بیش پیداوار باہر بھیجنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اسی بنا پر یہ لازم ہے کہ قومی دولت کا صرف وسیع تر ہوتا چلا جائے اور یہ بات اس عبوری دور میں اسی صورت ممکن ہے کہ ملکی زمین اور دوسرے قدرتی ذرائع جن کی پیداوار بڑھنے کا امکان ہو، تازہ ترین ایجادات کے استعمال

سے مستفید ہوتے رہیں یا دوسرے لفظوں میں ان کی پیداوار میں اضافہ ہوتا رہے۔
"پرواز" کی منزل — جب ملک اس حد تک صنعت سے مرصع ہو جاتا ہے کہ قومی دولت کا صرف بتدریج اور باقاعدہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس سرمایہ کاری سے حاصل ہونے والا النفع بھی دوسرے منفعت بخش کاموں میں لگتا رہتا ہے —
زراعت کی ایک اور لحاظ سے بھی محتاج ہے۔ پاکستان جیسے ملک میں، جہاں نوّے فی صد لوگ دیہات سے متعلق ہیں، اگر زراعت کا معیار بڑھے، زمین سے روزی حاصل کرنے والوں کے پاس زراعتی ترقی کی بنا پر وافر دولت ہو تو یہ لوگ ملک میں قائم ہونے والی صنعتوں کے بہترین خریدار ثابت ہو سکتے ہیں اور صنعتی استحکام کے لیے بے حد ضروری بات ہے۔ اب اس وقت اگر ملک میں لاکھوں کارخانے ہوں اور ملک کی بیشتر آبادی کے پاس قوتِ خرید ہی نہ ہو تو ان کارخانوں کی پیداوار کہاں کھپے گی؟ اور تو اور اگر زراعت جدید خطوط پر چل نکلے تو اسی کے سہارے بہت سی نئی صنعتیں جاری ہو سکتی ہیں، ملک میں ٹریکٹر سازی، کیمیاوی کھادوں، ڈیزل انجنوں، پمپوں، پائپوں، طرح طرح کے نئے اوزاروں وغیرہ کے کارخانے کھل سکتے ہیں۔
پھر اگر زراعت کا معیار بلند ہو جائے تو بے شمار سماجی نوعیت کے منصوبوں کے لیے خوش حال کسانوں سے ٹیکسوں کی صورت میں روپیہ حاصل کیا جا سکتا ہے اس طرح یہ بھی ممکن ہے کہ صنعت کے میدان میں ابتداء لازماً روزمرّہ کے استعمال کی اشیاء بنانے سے نہ کی جائے بلکہ ہم چاہیں تو بڑی بڑی صنعتوں شلاً لوہا سازی یا مشین سازی سے بھی ابتدا کر سکتے ہیں۔

اگر زراعت کا معیار بلند ہو جائے تو لوگوں کے پاس اس طرح جو زاید از ضرورت روپیہ ہو گا وہ اسے دوسرے فائدہ بخش کاموں میں لگا سکیں گے۔ وہ حکومت کے بونڈ خرید سکیں گے۔ اس روپے سے خود چھوٹی چھوٹی صنعتیں قائم کر سکیں گے۔ اس ضمن میں زرعی اصلاحات خاص طور سے اہم ہیں۔ پاکستان میں ان اصلاحات سے جاپان اور روس کی طرح یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ بڑے بڑے زمینداروں کو جو رقم بطور معاوضہ ملے گی وہ اسے قانوناً زراعت میں تو نہ لگا سکیں گے اور زمین چھن جانے کی بنا پر اس روپے کو محض عیش و آرام میں اُڑا دینے کے بجائے اسے کسی دُوسرے فائدہ بخش کام ہی میں لگانا چاہیں گے۔

اس طرح اگر ہم یہ کہیں کہ صنعتی ترقی کی تکمیل ہمارے یہاں اسی حد تک ہو سکے گی جس حد تک ہماری زراعت ترقی کرے گی تو یہ بات بالکل بجا ہو گی۔

اِس استدلال کی روشنی میں ہمیں ایک مرتبہ پھر اپنی سب سے بڑی صنعت' زراعت پر بھرپور توجہ کرنی چاہیے کہ یہی باقی صنعتوں کی ماں ہے (یہ فقرہ ان لوگوں کی بھی تسلی کر سکتا ہے جنھیں صنعت کا نام لیے بغیر چین نہیں ملتا) زراعت کو نئی ترکیبوں سے ہم کنار کرنے اور اہل زراعت کے طرزِ عمل کو بدلنے کے لیے ہم جو بھی کریں وہ تھوڑا ہے۔ اگر اس طرح وہ نتائج نہ بھی مرتب ہوں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تو کیا یہ بات اپنی جگہ کم ہے کہ ہماری نوّے فی صد آبادی کا معیارِ زندگی بلند ہو جائے گا اگرچہ بظاہر کوئی وجہ نہیں کہ اس تبدیلی سے اقتصادی ترقی کی نئی شاخیں نہ پھُوٹیں۔

آبادی، خوشحالی اور خانہ خرابی

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (الرحمٰن: ۱۰)

کہتے ہیں حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تو اس وقت دُنیا میں کوئی بیس کروڑ انسان بستے تھے۔ کہیں سولہ سترہ صدیوں میں جا کر یہ آبادی دُگنی ہوئی۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ پچھلی ایک ہی صدی میں دُنیا کی آبادی بڑھ کر دُگنی ہو گئی ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ انسانی آبادی آغازِ انسانیت سے عیسوی دَور تک ہزار ہا سال میں جس تعداد کو پہنچی تھی، حضرت عیسیٰ کے بعد کچھ ہی سو سال میں یہ تعداد بڑھ کر دُگنی ہو گئی، پھر یہ رفتار اس حد تک بڑھی کہ کئی صدیوں کے بجائے ایک ہی صدی میں یہ منزل آ گئی اور اب یہ عالم ہے کہ آئندہ پچاس سال میں یہ ایک مرتبہ اور دُگنی ہو جائے گی بلکہ ہم جیسے "زرخیز" ملک تو اس رفتار کو بھی تسلی بخش نہیں سمجھتے، اگر حالات بدستور رہے تو آج کل ہماری آبادی میں جس شرح سے اضافہ ہو رہا ہے (۲٫۳۷ فی صد سالانہ) اس کے اعتبار سے یہ چالیس سال ہی میں دُگنی ہو جائے گی۔ یعنی اس وقت اگر ہم دس کروڑ ہیں تو بیسویں صدی کے اختتام تک ماشاء اللہ ہم بیس کروڑ ہو چکے ہوں گے۔

اقتصادیات کی سیدھی سادی تعریف یہ ہے کہ ضروریات جو غیر محدود ہوتی ہیں اور ذرائع جو محدود ہوتے ہیں ان دونوں میں کیونکر ہم آہنگی پیدا کی جائے جب کسی معاشرے میں یہ ہم آہنگی مفقود ہو ــ ذرائع ضروریات کا ساتھ نہ دے رہے ہوں تو

اس معاشرے کو اقتصادی اعتبار سے بدحال سمجھنا چاہیے اور جب معاملہ دوسرا ہو ـــــ ذرائع وافر ہوں اور ضروریات پوری ہو رہی ہوں، تو یہ معاشرہ خوش حال کہلائے گا۔ خوشحالی اور بدحالی زمانے کے پلٹوں کے ساتھ ساتھ معاشروں پر حکمرانی کرتی چلی آئی ہیں۔ جب بھی انسان نے نئے اوزار اور انداز اختیار اور ایجاد کیے اسے پھیلنے اور پھولنے پھلنے کے مواقع میسر آتے رہے جب انسان جانوروں کی طرح اپنے دست و بازو سے شکار کر کے پیٹ پالتا تھا تو وہ تعداد میں بہت کم تھا۔ فطرت کی طاقتیں اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں اور وہ ان میں جکڑا ہوا تھا۔ پھر اس کے ذہن پر تخلیق کے دروازے کھلنے لگے اور اس نے شکار کے لیے ہتھیار بنا لیے۔ اس نے انسانی تاریخ کی سب سے بڑی دریافت کر لی کہ زراعت کے ذریعے وہ خود بھی خوراک پیدا کر سکتا ہے۔ اس نے بستیاں بنا کر اپنے گھروں کو اپنے دشمنوں ـــــ آندھیوں، طوفانوں، سیلابوں، درندوں سے محفوظ کر لیا۔ معاشروں کی تعمیر کر کے، کاموں کی تقسیم کر کے اس نے جینے کے عمل کو آسان بنا دیا۔ لیکن اس کی تاریخ کے ہر موڑ پر بدحالی بھی گھات لگائے رہی جب موقع ہوا قحط، وبا، جنگ کی صورت میں بدحالی انسان پر شبخون مارتی رہی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان آج سے ہزارہا سال پیشتر ہی آبادی کی ان رفعتوں کو چھو لیتا جو آج اس کا سر چکرائے دے رہی ہیں۔ اسی لیے تو کچھ دل جلوں نے یہ کہہ رکھا ہے کہ یہ مصیبتیں ہی اصل میں انسان کی بہترین رفیق تھیں، یہ نہ ہوتیں تو انسان کبھی کا حشرات الارض میں شمار ہو رہا ہوتا۔ بہر حال ان مصیبتوں نے جہاں انسانی آبادی کو تھوڑی بہت لگام دی وہاں یہ کام بھی کیا کہ محدود ذرائع کے پیشِ نظر صرف اچھی انسانی معاشروں کو پنپنے کی

مہلت دی جو اس لائق تھے۔ اس طرح انسان ایک نوع حیات کے اعتبار سے ارتقا کرتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ اسے اپنی بقا کے لیے اپنے ذہن پر زور دینا پڑتا رہا کہ کوئی ایسی تدبیر ڈھونڈے جس سے رزق اور کارکردگی کے نئے چشمے پھوٹ بہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انسانی ذہن کی پہلی کروٹ کی ابتدا ہی اس طرح ہوئی ہو کہ انسان دوسرے چوپایوں کے برعکس صرف پچھلے دو پیروں پر چلنے کا اہل ہو گیا تھا۔ اپنی جگہ یہ اہلیت کسی مجبوری کی بنا پر ہوگی، لیکن اسی مجبوری نے اس پر اختیار کے سیکڑوں راستے کھول دیے۔ ایک مرتبہ اُس نے اس مجبوری کا سامنا کرنے کے لیے اپنے ہاتھوں کو آزاد کر لیا تو یہ ہاتھ جن خاص ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے آزاد ہوئے تھے اُن کے ساتھ ساتھ سیکڑوں دوسرے موجود اور مستقبل میں متوقع کاموں کے لیے بھی آزاد ہو گئے۔ اسی طرح انسانی زندگی کے ہر مشکل موڑ پر جن لوگوں نے اس مشکل کا سامنا کیا اُن پر آسانیوں کے فائدے عام ہوتے رہے۔ اسی لیے تو اللہ نے کہا ہے: فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ (الانشراح، ۵) —— اور اس خیال سے کہ یہ بات اہم ہے اور اس خیال سے کہ حال کے ساتھ ساتھ یہ بات مستقبل میں بھی صحیح ثابت ہو، تاکید اً پھر کہا ہے: إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ (یقیناً ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے)

اللہ نے زمین کو اپنی مخلوق کے لیے بنایا ہے اور وہ رزق دینے والوں میں بہترین رازق ہے اور وہی سب جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ انسان کو صرف اتنا ہی ملتا ہے جس قدر وہ کوشش کرتا ہے: لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (النجم: ۳۹) انسان نے جب بھی کوشش کی ہے اس پر

رزق کی نئی صورتیں کھلتی رہی ہیں۔ مالتھس نے جب انسانی آبادی کی بڑھتی ہوئی رفتار سے خوفزدہ ہو کر اہل دُنیا کو اس کے نتائج سے ڈرایا تھا تب سے اب تک اُس کے خیالات کئی مرتبہ غلط اور کئی مرتبہ صحیح ثابت ہو چکے ہیں۔ وجہ یہی ہے ——— کبھی محدود ذرائع کے پیشِ نظر قومیں اور ملک باہم اُلجھتے اور ایک دوسرے کے ذرائع چھینتے دکھائی دیے ہیں اور کبھی وہ صنعتی، تجارتی اور زراعتی وسعت کی بدولت اپنے سے کئی گنا زیادہ آبادی کی پرورش کا بوجھ اٹھانے کی اہلیت رکھتے نظر آئے ہیں۔

آج ایک مرتبہ پھر دُنیا اس مقام پر کھڑی ہے کہ ذرائع محدود محسوس ہو رہے ہیں اور آبادی جس رفتار سے بڑھ رہی ہے اُس نے لوگوں کو تشویش میں ڈال رکھا ہے۔ تشویش کا پس منظر یہ ہے کہ پچھلے ڈیڑھ دو سو سال کے عرصے میں کیا خوشحال اور کیا بدحال، تقریباً سب ملکوں میں حفظانِ صحت، وباؤں کی روک تھام، زچہ و بچہ کی حفاظت کے بہتر انتظام نے شرح اموات میں حیرت انگیز کمی کر دی ہے۔ اب ہُوا یہ ہے کہ خوشحال معاشروں میں تو معیارِ زندگی کو بلند رکھنے کے پیشِ نظر کسی نہ کسی سطح پر خاندانی منصوبہ بندی کا تصور کار فرما ہے۔ کچھ اور نہیں تو انسدادِ حمل کی قانونی پابندیاں ڈھیلی ہے۔ لوگ شادی ذرا دیر میں کرتے ہیں، کچھ لوگ شادی کرتے ہی نہیں۔ اس طرح شرح پیدائش میں بھی کچھ کمی ہو گئی ہے۔ لیکن اکثر پس ماندہ ممالک میں شرحِ پیدائش اور شرحِ اموات کا توازن بگڑ گیا ہے۔ پھر ایشیا اور افریقہ کے ان ممالک میں آزادی کی رَو اور قوم پرستانہ جذبات کے تحت، یہ رجحان بھی پرورش پا گیا ہے کہ ملکی ذرائع سے استفادہ کرنے کا اہلیا

حق اہلِ ملک کا ہے اور اس میں وہ حق بجانب بھی ہیں۔ اس طرح وہ خوشحال معاشرے جو اپنی خوراک ان پسماندہ ممالک سے حاصل کرتے تھے، کیونکہ یہ ان کی نوآبادیات کا مقام رکھتے تھے: اب اپنی خوراک کا کوئی اور ذریعہ ڈھونڈنے پر مجبور ہیں۔ پس ماندہ ممالک کی بڑھتی ہوئی آبادی یہ مہلت نہیں دے گی کہ وہ خالصتاً صنعتی معاشروں کے لیے خوراک برآمد کر سکیں۔ اُلٹا یہ خدشہ ہے کہ جس رفتار سے پس ماندہ ممالک کی آبادی بڑھ رہی ہے اگر حالات یہی رہے تو وہ خود اپنے لیے بھی خوراک پیدا نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ اس وقت بھی یہ عالم ہے کہ دُنیا کی آدھی آبادی پیدائش سے وفات تک پیٹ بھر کے روٹی نہیں کھا سکتی۔ اگر آبادی اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو کوئی عجب نہیں کہ باقی کی آدھی آبادی کو بھی جان کے لالے پڑ جائیں۔ اس ضمن میں آج کل روس میں اپنی زراعتی کارکردگی سے جو بے اطمینانی پائی جاتی ہے وہ خاص طور سے لائقِ توجہ ہے۔ پس ماندہ ممالک تو ایک طرف رہے، روس جیسی آمریت بھی اس احتمال سے خوفزدہ ہے کہ ضروریات کے مطابق خوراک پیدا نہ ہوئی تو کیا ہوگا۔ البتہ پسماندہ ممالک میں خوراک کا مسئلہ ایک اور اعتبار سے بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ ان میں ہر قیمت پر صنعت کے فروغ کا شوق اس حد تک اُبھر آیا ہے کہ زیادہ تر زورِ اسی طرف ہو رہا ہے اور زراعت پر پہلی سی بھی توجہ نہیں دی جا رہی (یہ بہت ہی حال کی بات ہے کہ کچھ پسماندہ ممالک میں زراعت کی تعمیرِ نو کا پروگرام جاری ہوا ہے)

یوں تو مالتھس کے بعد سے، بعض اوقات اس کے نظریات کی عملی تردید کے باوجود، کئی معاشروں میں کسی نہ کسی حد تک ضبطِ ولادت کے مختلف اصولوں پر

عمل ہونے لگا تھا اور افراد اور معاشروں نے معیارِ زندگی کی برتری کے لیے ایک حد تک، اسے شعوری سطح پر اختیار کرنے میں باک نہیں سمجھا لیکن پچھلے چند سالوں سے ضروریات اور ذرائع کے تال میل کا یہ طریقہ ایک تحریک کی صورت میں واضح ہو رہا ہے اور یہ بات زور پکڑ رہی ہے کہ آبادی کے سیلاب کے آگے بند باندھنے کے لیے، اور پس ماندہ ممالک کی بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی کے پیشِ نظر ان کے معیارِ زندگی کو اور بھی گرنے سے روکنے کی خاطر ضبطِ ولادت کو قانون کی حیثیت دے دی جائے۔

لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ضبطِ ولادت کے بجائے یا یوں کہیے کہ آبادی کو کم کرنے کے بجائے ذرائع کو بڑھانے کی تدبیر کرنے پر زور دیتا ہے۔ اس طبقے کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ زمین کے وسائل انسان کی آئندہ نسلوں کے لیے ناکافی نہیں۔ انسان اگر کوشش کرے اور باہمی جنگ و جدل پر جو اندھا دھند دولت خرچ ہو رہی ہے اسے رفاہی کاموں میں لگانے لگے تو اہلِ دنیا کی بدحالی کو خوش حالی میں بدلا جا سکتا ہے: زمین کا بیشتر حصہ ابھی زیرِ کاشت نہیں لایا گیا۔ خاص طور پر زراعتی ملکوں میں بھی کروڑوں ایکڑ زمین ایسی پڑی ہے، جسے تھوڑی سی کوشش سے خوراک پیدا کرنے کے لائق بنایا جا سکتا ہے۔ سمندر طرح طرح کے گوشت سے بھرے ہوئے ہیں۔ زمین پر تالابوں میں مچھلیاں پالی جا سکتی ہیں۔ پھر اچھے بیجوں، اچھے اوزاروں اور اچھی کھادوں کی مدد سے فی ایکڑ زراعتی پیداوار میں کئی گنا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ فصلوں کی بیماریوں، کیڑے مکوڑوں اور چوہوں وغیرہ کے ذریعے ضائع جانے والی خوراک کی

روک تھام کرکے تقریباً اتنی ہی خوراک بچائی جا سکتی ہے جتنی فی الحال دُنیا بھر میں پیدا ہورہی ہے۔ ایٹمی توانائی سے فصلوں کی صحت اور اناج کے معیار کو اعلیٰ بنایا جا سکتا ہے۔ سیم، تھور اور مٹی کی بربادی کو ختم کر کے کروڑوں ایکڑ زمین دوبارہ زیرِ کاشت لائی جا سکتی ہے۔ پھر مصنوعی خوراک پیدا کرنے کے لامحدود کیمیائی وسائل موجود ہیں۔ اور تو اور اب نئی دُنیاؤں کے راستے اہلِ زمین پر کھل رہے ہیں تو یہ امکان بھی سامنے آ رہا ہے کہ اگر زمین پر آبادی کا بوجھ بڑھ گیا تو بھی کچھ انسان دوسرے حیات پرور سیاروں کو ہجرت کر سکتے ہیں۔

خود ہمارے یہاں آبادی کا مسئلہ بے حد اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ہمارے اقتصادی منصوبے جس حد تک ہمارا معیارِ زندگی اُونچا اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں یا قومی دولت میں جس حد تک اضافہ کرتے ہیں ہماری شرحِ پیدائش اس پر خطِ تنسیخ پھیر دیتی ہے۔ چنانچہ اب یہ بات ناگزیر ہو گئی ہے کہ اگر ہمیں اپنا معیارِ زندگی بلند کرنا ہے تو ہم اپنی آبادی کو اسی حد تک بڑھنے دیں جس حد تک ہمارے ذرائع اس کی اجازت دیتے ہیں۔ موجودہ حالات میں تو یہ ہو رہا ہے کہ اگر قومی دولت میں کچھ اضافہ ہوتا ہے تو اس عرصے میں اتنے نئے پیٹ معرضِ وجود میں آ جاتے ہیں کہ یہ اضافہ ان کی نذر ہو جاتا ہے اور معیارِ زندگی وہیں کا وہیں رہتا ہے جہاں تھا۔ اس ضمن میں نئے ماہرینِ معاشیات نے یہ حل تجویز کیا ہے کہ کسی طور پسماندہ معاشروں کو یہ تدبیر کرنی چاہیے کہ ان کی قومی دولت کا کم از کم دس بارہ فی صد حصہ منفعت بخش کاموں میں لگ جائے۔ اس طرح جو نفع ہو وہ مزید منفعت بخش کاموں لگتا رہے تو آبادی میں اضافے کی عام شرح (اڑھائی سے تین فی صد سالانہ) کے باوجود یہ معاشرے ترقی یافتہ معاشروں کی سطح پر پہنچنے کے

سفر پر نکل کھڑے ہوں گے (ملاحظہ ہو: اس کتاب کا ایک مضمون، زراعت پر زور) چلیے یہ مان لیا، لیکن کیا آبادی کو لامحدود طور سے بڑھنے دیا جا سکتا ہے ؟ کیا چند ہی صدیوں میں انسان حشرات الارض کی طرح کثیر نہ ہو جائیں گے، جس طرح زر کی افراط اسے بے قدر کر دیتی ہے کیا آدم کی افراط اسے ارزاں نہ کر دے گی۔ لیکن یہاں پھر یہی کہا جا سکتا ہے : جب اس بات کا وقت آئے گا تو انسانی زندگی ایک اور موڑ مڑے گی، جو لوگ اس مشکل وقت میں پنپ سکتے ہوں گے وہی باقی رہیں گے اور وہ اپنے لیے کوئی ایسی راہ تلاش کر لیں گے جو اس وقت ان کی ضروریات کے لیے ذرائع کے نئے میدان اُن پر کھول دے۔ یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب کوشش کرنے والے انسان، ڈھونڈنے والے انسان، ایک قدم اٹھائیں گے تو دائم رحمت کرنے والا اخدا انھیں نئی دُنیائیں عطا کر دے گا۔

لیکن کیا اس مسئلے کا صرف یہی پہلو ہے — مادی پہلو ؟ کیا آبادی کے مسئلے، لامحدود ضروریات اور محدود ذرائع کے مسئلے کے اور پہلو نہیں۔ اور یہیں سے وہ بات شروع ہوتی ہے جو میں آپ کے سامنے خاص طور سے رکھنا چاہتا ہوں۔

ہم انسان ہیں اور وہ بھی مسلمان۔ انسانی زندگی محض مادّی ضروریات سے عبارت نہیں۔ بھرپور انسانی زندگی کے لیے تین باتیں عام طور سے لازم ہیں، (۱) شخصی بقا (۲) اجتماعی بقا (۳) روحانی نشو ونما۔ جب تک ان تینوں بنیادی ضرورتوں میں مناسب توازن وجود میں نہیں آتا انسانی زندگی خام رہتی ہے۔ اب اگر یہ تینوں ضرورتیں خدا کے قانون کے مطابق پوری نہیں کی جاتیں تو انسان مُسلمان نہیں کہلا سکتا۔ اس مقامِ نظر سے آبادی کے مسئلے کو دیکھا جائے تو سارا

معاملہ خوراک اور شرحِ اموات و پیدائش تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس مسئلے کے کچھ اور رُخ بھی اُجاگر ہوتے ہیں، بلکہ خود مادی پہلو کی معنویت بھی بدل جاتی ہے۔

بے شک یہ زمین اللہ نے اپنی مخلوق کے لیے بنائی ہے اور وہ سب کا پالنے والا بھی ہے اور اس کی یہ حیثیت ہمیشہ قائم ہے لیکن آج جن انسانوں کو اس زمین پر اختیار حاصل ہے کیا وہ اسے اس طرح استعمال کر رہے ہیں کہ اس سے خدا کی مخلوق کی پرورش ہو۔ کیا وہ اس میں اُن لوگوں کا حصہ بھی جانتے ہیں جو ان میں سے نہیں — وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِيْنَ ○ (الحجر: ۲۰)

کیا وہ دوسروں کو حصہ دینے کے سلسلے میں عدل قائم رکھتے ہیں، کم تو نہیں تولتے — وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ○ (الرحمٰن: ۹)

اس کے برعکس کہیں یہ حالت تو نہیں کہ اس خیال سے کہ اگر زیادہ پیداوار منڈیوں میں آگئی تو بھاؤ گر جائیں گے اس لیے وہ خوراک اور صنعتی پیداوار کی نہ صرف ذخیرہ اندوزی کر لیتے ہوں بلکہ کھلیانوں کے کھلیان جلا دیتے ہوں اور غلے کے جہازوں کو سمندر میں خالی کر دیتے ہوں — خواہ کروڑوں انسان پیٹ بھر روٹی کو عمر بھر ترستے رہیں۔ یاد رکھنے والوں کو یاد ہو گا کہ ایسا ہوا ہے اور اب بھی ہوتا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے اس مسئلے کا محض ایک مادی پہلو ہی نہیں، دوسرے پہلو بھی ہیں۔ اگر مادی وسائل فراواں بھی ہوں تو کیا آبادی کو بے لگام چھوڑا جا سکتا ہے؟ اگر ایک شخص کے پاس وافر دولت ہے تو کیا اب اُسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ تین چار شادیاں کرے اور پندرہ بیس بچے پیدا کرے؟ بے شک وہ بیوی بچوں

کا پیٹ پالنے کی ہر طرح اہلیت رکھتا ہے لیکن کیا بیوی بچوں کے ضمن میں اس کا محض یہی فریضہ ہے کہ وہ انھیں روٹی پانی مہیا کرتا رہے، ان کے دوسرے اخراجات بہم پہنچاتا رہے؟ کیا اس کے ساتھ ساتھ اُس کے ذمے یہ فریضہ نہیں کہ وہ اپنے لوگوں کو خدا کے راستے پر چلنے کا حکم دے؟ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ (مریم: ۵۵) کیا اُس کے ذمے یہ فریضہ نہیں کہ وہ اپنی اولاد سے کہے کہ دیکھو، خدا نے تمھارے لیے یہ راستہ چن لیا ہے، آپ عمر بھر تمھیں اس پر چلنا ہوگا — يٰبَنِيَّ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (البقرة: ۱۳۲) پھر کیا اس کے فرائض انسانی سطح پر یہ فریضہ نہیں کہ وہ اپنے بال بچوں کے اخلاق کے ساتھ ساتھ اُن کی تعلیم و تربیت میں بھی دلچسپی لے؟ اُس کے ذمے صرف یہی کام تو نہیں کہ وہ سکول کی فیس ادا کر دیا کرے، اس کے ذمے اپنے بچوں کو باپ کی حیثیت سے وہ گرمی دینا بھی تو ہے جو اگر بچوں کو نہیں ملتی تو عمر بھر اس کا سایہ ان کی ذات پر پڑتا رہتا ہے۔ وہ شفقت، وہ آدرشی مرکزیت، وہ مردانگی جو جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے باپ کی طرف سے بچوں کو ملنی چاہیے اگر بچے اس سے محروم رہیں تو باپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ بچے بالغ ہونے پر بھی یتیم نظر آتے ہیں اور کیا یہ سب کچھ ذاتی توجہ کے بغیر ممکن ہے اور یہ ذاتی توجہ معاشرے میں دوسرے فرائض کے ساتھ ساتھ کتنے بچوں کو دی جا سکتی ہے؟ یہی باتیں ایک باپ کو خاندان کے قوام کی حیثیت دیتی ہیں۔

یہ بات یہیں تک نہیں، آگے بھی جاتی ہے۔ اگر دس بیس پچاس آدمیوں کے

پاس ہی مادی وسائل وافر نہ ہوں بلکہ پورے معاشرے میں ان وسائل کی ریل پیل ہو
—— ہر شخص کے پاس اچھی ملازمت یا کاروبار ہو، اچھا گھر ہو، فراغت ہو تو کیا
پھر آبادی کو بڑھنے دینا چاہیے کیونکہ نوزائیدوں کا ایسے معاشرے میں بڑا اچھا
استقبال کیا جا سکتا ہے —— ان کے لیے اچھے ہسپتال ہیں، اچھے سکول ہیں،
ان کے ماں باپ کے پاس ڈھیروں پیسے ہیں؟ یہاں انسانی زندگی کے تیسرے
عنصر کے تقاضے سامنے آتے ہیں کہ انسانیت اب ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی
ہے جہاں ذہنی اور روحانی زندگی کے بغیر انسان کا تصور نہیں کیا جا سکتا اس لیے
اگر پورے معاشرے میں بھی مادی وسائل کی کمی نہ ہو تو یہ خصوصیت اکیلی ڈکیلی کافی
نہیں۔ کیا ہمارے سامنے مادی طور سے برتر معاشروں کی ابتری کی تصویر نہیں؟
وہاں نوجوانوں کے جو مسائل ہیں کیا وہ کسی سے ڈھکے چھپے ہیں کہ انھیں جنم دے کر
بالکل کھلی دنیا میں ٹامک ٹوئیے مارنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے؟ کیا ان
خوشحال معاشروں کی خانہ خرابی خود ان پر نہیں کھل چکی کہ وہاں نئی نسلوں میں جرائم
سے ظالمانہ دلچسپی کے ہاتھوں کیا گل کھل رہے ہیں؟ کیا یہ معاشرے اس لیے
آبادی میں اضافہ کرتے چلے جائیں کہ نوزائیدوں کے لیے ہر طرح کی مادی آسائشیں
موجود ہیں؟ اور کیا جب ہم بھی مادی ذرائع پر ان معاشروں کی حد تک قابو پا لیں گے
تو ہمیں بھی محض اسی بنا پر بے اخلاق، بے شعور، بے احساس نسلوں کو وجود میں
لانے کی کھلی چھٹی مل جائے گی۔

اب رہا ضبطِ ولادت کا معاملہ۔ اولاد پیدا کرنا ہر شخص پر فرض نہیں ورنہ شادی
کرنا بھی خدا نے فرض قرار دیا ہوتا۔ شادی کے سلسلے میں خدا کا حکم ہے کہ اگر تمھارے

پاس اس کی استطاعت نہ ہو تو صبر کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص زندگی بھر جنس کے معاملے میں صبر کرسکتا ہے کیونکہ یہ تو ہونے سے رہا کہ مسلمان ہوتے ہوئے وہ زنا کرتا پھرے اور اللہ کی عادت ہے کہ انسان پر اتنا بوجھ نہیں ڈالتا کہ وہ اٹھا نہ سکے۔ اس کا مطلب ہے صبر کی یہ صلاحیت ایسا عجوبہ نہیں۔ یہاں وہاں ایسے لوگ عام مل جاتے ہیں جو جنس کے معاملے میں صبر کرتے ہیں، عمر بھر شادی نہیں کرتے اور پھر بھی اُن کا دامن آلودۂ بے صبری نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں یہ بات سراسر لغو ہے کہ جنس اسی طرح کی بھوک ہے جیسے روٹی۔ اگر ایسا ہوتا تو جس طرح اللہ نے حرام کی گئی چیزوں کو انتہائی مجبوری کی حالت میں کھا لینے کی اجازت دی ہے تو جنس کے سلسلے میں بھی کہیں یہ کہہ دیا ہوتا کہ میاں! جب صبر نہ کرسکو تو پھر کچھ ہاتھ پلا مار لینا۔ اب اگر انسان عمر بھر صبر کرسکتا ہے تو چند سال تو ضرور صبر کرسکتا ہے۔ اگر ملک میں آبادی کا مسئلہ سر اٹھاتا ہے تو تعاون کی خاطر نوعمری میں شادی کے بجائے شادی کی عمر کو آگے بھی کھسکایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح جب شادی ہوجائے تو بچوں کی شرح پیدائش میں وقفہ ڈال کر بھی کمی کی جاسکتی ہے۔ —— میرا مطلب ہے اگر ضبطِ تولید کے بد بد طبی طریقوں یا سامان کے استعمال سے نفرت ہی ہو تو کیا بیچ بیچ میں کچھ صبر نہیں کیا جاسکتا؟ بچوں کی ماں کی خاطر نہیں تو بچوں ہی کی خاطر سہی کہ ہر بچے کو ماں اور باپ کی ذاتی توجہ، اُن کا لمس، قربت، تربیت اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس مقام پر ایک مسئلہ سر اٹھائے گا کہ اگر اچانک کبھی ہمیں ایسا مرحلہ پیش آگیا جس میں زیادہ سے زیادہ نفوس کی ضرورت ہو، مثلاً جنگ چھڑ سکتی ہے، مختلف مذہبوں

کے پیروؤں کی تعداد کے اعتبار سے دُنیا میں کئی معاملات کے فیصلے ہونے طے پاسکتے ہیں۔ اس وقت کیا ہم پچھتائیں گے نہیں کہ ہم خواہ مخواہ اپنی آبادی گھٹانے میں لگے رہے۔ میرے پاس اس کا مختصر سا جواب تو یہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت کے بارے میں اللہ کی کوئی ایسی اچھی رائے نہیں: وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ۝ (المائدہ: ۴۹) اور اصول یہ بتایا ہے کہ صاحبِ ایمان تھوڑے بھی ہوں تو زیادہ بڑی جماعتوں پر غالب آجاتے ہیں ــــ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ ـــــ اللَّهِ ط (البقرة: ۲۴۹) ــــ اور اسی آیت کا باقی حصّہ بھی سُن لیجیے ــــ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ اب اگر اس مختصر سے جواب سے تشفی نہ ہو تو اس مسئلے کو یوں دیکھنے کی کوشش کیجیے کہ اگر آبادی اسی طرح بڑھتی چلی جائے اور ذرائع محدود ہونے کی بنا پر پُوری آبادی پر اس طرح بٹ جائیں کہ لوگ پُوری غذا نہ کھاسکیں جو ایک صحت مند انسان کے لیے ضروری ہے تو اس طرح یہ ساری آبادی صحت کے اعتبار سے ایسی نحیف ہو جائے گی کہ اگر آبادی اتنی نہ بڑھتی اور نسبتاً تھوڑے لوگ اپنے ذرائع کو اپنی مناسب موزوں نشو ونما کے لیے استعمال کر سکتے تو یہ تھوڑی سی آبادی اپنی کارکردگی اور صلاحیتوں کے اعتبار سے وسیع تر آبادی کے مقابلے میں مجموعی طور سے بہتر رہتی بلکہ:

"کسی آبادی پر پُوری غذا نہ ملنے کے اثرات کی نوعیت محض جسمانی نہیں ہوتی بلکہ اس کے اثرات اس آبادی کے طرزِ عمل پر بھی پڑتے ہیں۔ یہ آبادی صرف جسمانی کارکردگی ہی میں پیچھے نہیں رہ جاتی، اس کی ذہنی

بھی ماند پڑنے لگتی ہے، یہ مربوط اور تخلیقی فکر کی اہل نہیں رہتی۔اس میں بے دردی، بے دلی اور چڑچڑاہٹ گھر کر جاتی ہے اور شدید ہوتے ہوتے یہ صورتِ حال یہاں تک اس پر مسلط ہو جاتی ہے کہ اخلاقی اقدار اور سماجی رشتوں کا احترام بھی باقی نہیں رہتا۔"

(ڈاکٹر فورمن سی رائٹ)

کیا خدا کی مخلوق کے یہی خط و خال ہیں جس کے لیے اُس نے یہ زمین بنائی ہے؟

خاندانی زندگی کی بنیادیں

عائلی قوانین کا پس منظر

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً۔ (النساء: ۱)

(اے عوام الناس! اپنے رب کا تقویٰ کرو جس نے تمھیں "نفسِ واحد" سے پیدا کیا اور اسی نفسِ واحد سے اس کا زوج پیدا کیا اور ان دونوں سے کثیر مردوں اور عورتوں کی افزائش کی)

خواہ یہ بات اسرائیلیات سے مسلمانوں میں در آئی ہو یا اسے ہماری ہی روایات نے جنم دیا ہو، ہمارے ہاں یہ عام تصور ہے کہ آدم (مرد) سب سے پہلے پیدا کیے گئے تھے اور ان کی زوجہ حوّا (عورت) بعد میں۔ بلکہ حوّا کی پیدائش کا مقصد آدم کی دل بستگی تھا

قرآن نے جو صورت پیش کی ہے وہ جُدا گانہ ہے۔ اس کی رُو سے اللہ نے نسلِ انسانی کی ابتداء نفسِ واحد سے کی ہے۔ نفسِ واحد سے مُراد آدم نہیں۔ آدم یا اوّلیں مرد اس نفسِ واحد کا ایک حصّہ یا دو زوجوں میں سے ایک زوج ہے۔ نفسِ واحد کا دُوسرا حصہ حوّا یا اوّلین عورت ہے جو اوّلیں مرد کے ساتھ ہی نفسِ واحد کے دو حصّوں میں بٹ جانے سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ ایک معروف

حیاتیاتی حقیقت ہے کہ نسل کشی کے لیے ہر منزل پر جنس لازم نہیں ہوتی۔ بہت سی انواعِ حیات اپنی افزائش کے لیے دو حصوں میں بٹ کر وہی مقصد حاصل کر لیتی ہیں جو دوسری بہت سی انواعِ حیات بعد ازاں جنسی اختلاط کے ذریعے (وضعِ حمل کے بعد یا انڈا دے اور اسے سے کر بچہ نکال کے) حاصل کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے مطابق، جس جرثومۂ حیات سے انسان کو پیدا کیا وہ ابتداءً اس طرح ٹوٹا کہ اس سے بعد ازاں مرد اور عورت دونوں کی ابتدائی ہیئت تشکیل پائی۔ بائبل کے بیان کی طرح حوا یہاں آدم کی پسلی سے نہیں پیدا ہوئی بلکہ اللہ نے تو ہر چیز ہی پیدا کی ہے اسے پیدا ہی جوڑا جوڑا کیا ہے وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (الذّٰریٰت: ۴۹) اور اس طرز پیدائش کو خود ہی واضح بھی کر دیا کہ یہ جوڑا ایک ہی جان (جرثومۂ حیات یا نفسِ واحد) سے پیدا ہوا۔ عربی میں زوج ایک ایسا لفظ ہے جو عورت اور مرد دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نفسِ واحد یا (اوّلین جرثومۂ حیات) اپنی جگہ نہ محض نر ہوتا ہے نہ محض مادہ۔ اس میں نر اور مادہ دونوں کی صلاحیتیں جمع ہوتی ہیں جس نفسِ واحد سے انسانی نسل پہلی پھوٹی وہ نفسِ واحد دو حصوں میں بٹ گیا۔ یہ دونوں حصے ایک دوسرے کے زوج تھے۔ دونوں ایک ہی وقت میں الگ الگ ہوئے تھے، دونوں ساتھ ہی ساتھ پیدا ہوئے تھے۔

اس بات کو یوں بھی کہا گیا ہے کہ انسان ابتداءً مٹی سے پیدا ہوا، نطفے سے پیدائش بعد میں شروع ہوئی:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ۔ (المؤمنون: ۱۳-۱۲)

اس موقع پر حیاتیات کے اُصولوں کے ساتھ ساتھ افلاطون کے مشہور مکالمے "مناظرہ" میں ارستوفینیس کی تقریر ذہن میں گھومتی ہے جس میں اُس نے محبت پر گفتگو کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ایک وقت تھا جب ایک ایسی سرکش نسل موجود تھی جو بیک وقت عورت بھی تھی اور مرد بھی۔ پھر زیس اور دوسرے دیوتاؤں نے باہم طے کیا کہ اس نسل کا زور توڑنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان لوگوں کو دو دو حصوں میں چیر دیا جائے۔ اس طرح یہ کمزور بھی پڑجائیں گے اور تعداد میں زیادہ ہو جانے کی بناء پر ہمارے لیے زیادہ قربانیاں بھی دیا کریں گے۔ جب انسان کا جسم دو حصوں میں کاٹ دیا گیا تو یہ دونوں حصّے باہم ملنے اور مل کر کھوئی ہُوئی وحدت اختیار کرنے کی آرزو میں گھلنے لگے۔ اسی کا نام محبت ہے۔ اب ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ان دونوں حصّوں یا زوجین میں جنسی اختلاط کا کوئی بندوبست نہ ہونے کی بنا پر نسل انسانی آہستہ آہستہ گھٹنے لگی۔ تب زیس کو ترس آیا اور اُس نے دونوں حصّوں کے جنسی اعضا سامنے کی طرف کر دیے، بیشتر ازیں وہ اُلٹی جانب تھے، تب سے دونوں میں جنسی اختلاط ممکن ہوگیا اور نسل انسانی کی افزائش شروع ہوگئی۔

اِس طرح تخلیق آدم کے بارے میں جو خیال اُبھرتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی پیدائش بھی تمام دوسری انواع حیات کی طرح ایک جرثومۂ حیات سے شروع ہُوئی ابتداءً یہ نوع غیر جنسی انداز سے نسل کشی کی اہل تھی۔ پھر ایک منزل ایسی آئی کہ جنسی جذبات اور عضویات کا آغاز ہوگیا۔ اب نسل کشی نطفے کے ذریعے ہونے لگی۔ میرے خیال میں یہی وہ منزل ہے جہاں آدم اور حوا جو باہم زوجین تھے انھیں شجر ممنوعہ کے قریب نہ پھٹکنے کا حکم دے کر اللہ نے جنسی اختلاط سے باز رہنے کا حکم دیا ہے۔

اس سے پیشتر نسلِ انسانی میں غیر جنسی افزائشِ نسل ہوتی ہوگی اور اب ایک ایسی منزل آگئی ہوگی جہاں اُن کے اندر جنسی جذبات اور عضویات کی نشو و نما کے بعد جنسی اختلاط ممکن ہوگیا ہوگا اور یوں وہ اپنی نسل کو نطفے کے ذریعے سے آگے بڑھا سکتے ہوں گے۔

اب چونکہ اللہ نے انسان کو چیزوں کے اسماء سکھا دیے تھے، انسان چیزوں کی معنویت و ماہیت سمجھ کر اُن کی تعریف مقرر کرنے یا نام رکھنے کا اہل ہوگیا تھا، اس لیے اُسے اختیار و ارادہ کی کٹھن ذمہ داری سونپی جاسکتی تھی۔ جب انسان کسی چیز یا فطری مظہر کا نام رکھ سکے، اس کی تعریف مقرر کرسکے تو یہ چیز یا مظہر گویا اس کے لیے تسخیر ہوجاتا ہے۔ یہی نہیں تسخیرِ کائنات کے نشان کے طور سے تو تمام ملائکہ کو، تمام مادی اور غیر مادی صلاحیتوں کو انسان کے اختیار میں دے دیا گیا تھا۔ صرف ابلیس جو سرکشی کا نشان تھا اُس نے آدم کے سامنے جھکنے سے انکار کیا تھا۔ یہیں سے نسلِ انسانی پر واضح کردیا گیا کہ انسانی زندگی کے میدان میں اب اطاعت گزاری اور سرکشی کی کشاکش کا آغاز ہوگیا ہے۔ تب انسان کو اللہ نے سنوار کر، اس میں اپنی رُوح پھونک کر، اُسے سوجھ بوجھ کا مالک بنا کر اس کشاکش میں اپنا راستہ چننے کا اختیار دے دیا۔ اختیار کی صلاحیت کو آزمانے کے لیے اللہ نے خود ہی معرکہ آرائی کا ایک مقام پیدا کیا، انسان کو جنسی اختلاط سے منع کرکے، شجرِ ممنوعہ سے دُور رہنے کی تلقین کرکے، انھیں جنسی اختلاط کے امکان کی گویا خبر دی کہ تم یوں بھی کرسکتے ہو لیکن ایسا کرنا نہیں۔ سرکشی تو انسان کے آگے سجدہ ریز نہ ہوئی تھی اور پھر یہی سرکشی کی صلاحیت ایک طرح سے اُس کے اختیار و ارادہ کا نشان بھی تھی اور یہی مشیتِ ایزدی بھی تھی کہ انسان اپنی اس صلاحیت کو اب بروئے کار لانا شروع کردے ـــــ اس کا پُورا اہتمام کیا گیا تھا کہ با اختیار انسان

جب شجر اختلاط کا پھل کھائے تو وہ نطفے کے ذریعے اپنی نسل بڑھا سکے۔ یہی ابدی بقا کا وہ راستہ تھا جس کا لالچ شیطان نے انسان کو دیا تھا۔ کیونکہ کسی خاندان کی نشوونما ہوتی ہی تب ہے کہ دو مختلف افراد، نر اور مادہ آپس میں جنسی اختلاط کریں اور ان دونوں کے ملاپ سے بچہ پیدا ہو، جس کی تخلیق میں دونوں نے حصہ لیا ہو، جس میں دونوں کا آب ورنگ جھلکتا ہو، اور یہ سلسلہ چلتا رہے۔

اِس صورتِ حال کو یُوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ اللہ نے تو انسان کو شجر ممنوعہ سے باز رکھا تھا اس لیے اُس نے باز نہ رہ کر سرکشی کی اور اگر شجر ممنوعہ سے مراد جنسی اختلاط ہے تو گویا جنسی اختلاط اُس نے خدا کی مرضی کے بغیر کر لیا۔ بجا ہے کہ انسان کو اس بات سے روکا گیا تھا۔ لیکن انسان کو اگر . . . .

. . . . ۔ اختیار و ارادہ کی صلاحیت ملی ہے تو وہ ملائکہ کی طرح محض حکم بردار بن کر نہیں رہ سکتا۔ وہ چیزوں کو اُلٹائے پلٹائے گا، پھاٹے پھٹکے گا، مار کھائے گا، صعوبتیں سہے گا، دوسرے لفظوں میں غور و فکر کرے گا، تحقیق و تلاش کرے گا۔ چُنانچہ جب اسے یہ اشارہ مل گیا کہ وہ جنسی اختلاط کر سکتا ہے اور اسے یہ بھی سجھا دیا گیا کہ اس طرح وہ خاندانی زندگی کی داغ بیل ڈال سکتا ہے تو اُس کے دل میں اس پھل کو چکھنے کی آرزو چٹکیاں لینے لگی۔ جس طرح جب کسی مسئلے نے حل ہونا ہوتا ہے، کسی حقیقت نے وا ہونا ہوتا ہے تو انسانی ذہن میں اس کی بابت ایک نیا سوال اُبھرتا ہے اور اسی سوال میں اس کا جواب بھی مضمر ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ یا اچانک انسانوں پر کھل جاتا ہے، اسی طرح جب انسانی زندگی کو کسی نئی منزل میں داخل ہونا ہوتا ہے تو اس کے وجود میں ایک نئی آرزو موجزن ہو جاتی ہے۔

خاندانی زندگی کی منزل کے لیے جنسی فعل یا نطفے سے نسل کشی کی ابتدا لازم تھی۔ یہ اب طے تھا کہ ایسا ہوگا۔ اسی لیے انسانوں (یا آدم) کو اس بات کی خبر دے دی گئی تھی لیکن اسے اس سے روکا بھی گیا تھا۔ اس رکنے میں بھی انسانی زندگی کا ایک ابدی اُصول کار فرما تھا۔ انسانوں کو اللہ نے بہت سی اجازتیں دی ہیں لیکن چند باتوں سے روکا بھی ہے۔ اگر انسان رُک جائے تو اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان کچھ دیر رُک جاتا تو اس میں اس کا فائدہ ہوتا۔ بائبل میں ہے کہ جب آدم اور اُس کی بیوی نے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لیا (یا جنسی اختلاط کر لیا) تو خدا نے عورت سے کہا "میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا، تو درد کے ساتھ بچے جنے گی" (پیدائش ۳:۱۶) ہو سکتا ہے انسان "چند ہزار سال" اور جنسی اختلاط کے ذریعے سے نسل کشی کا آغاز نہ کرتا تو آج عورتوں کو دوسرے بہت سے جانداروں کی ماداؤں کی طرح حیض، حمل اور وضع حمل میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں وہ نہ آتیں۔ ان کا جنسی نظام ایسے مرحلے پر پہنچ جاتا کہ یہ دشواریاں آسان ہو جاتیں۔

بائبل کا ذکر آگیا ہے تو ایک نہایت اہم وضاحت بھی ہوتی چلے۔ یہ تصور عام ہے کہ آدم کو حوّا نے بہکایا تو اُس نے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لیا۔ دوسرے لفظوں میں عورت ہی نے مرد کو بہکایا اور یہ تصور یہاں تک عام ہو چکا ہے کہ یہ معنی باقاعدہ ہمہ گیر مقبولیت حاصل کر چکا ہے ـــــ "انسانی زندگی میں عورت ہی مرد کو گمراہ کرتی ہے۔" قرآن نے یہ الزام آدم کی زوجہ پر ہرگز نہیں لگایا بلکہ کہا ہے:

وَقُلْنَا يَآدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ

شِئْتُمَا ص وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ - (البقرة : ۳۶، ۳۵)

(اور ہم نے آدم سے کہا" تو اور تیری زوجہ جنت میں رہو اور تم دونوں (صیغہ تثنیہ) اس میں سے جہاں سے چاہو جی بھر کے کھاؤ اور تم دونوں (باقاعدہ تثنیہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے) اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم دونوں (دوبارہ تثنیہ کا صیغہ ہے) حد سے گزرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے، پھر ان دونوں کو (یہاں بھی صیغہ تثنیہ ہی کا ہے) شیطان نے اس سلسلے میں پھسلایا اور ان دونوں کو (یہاں بھی تثنیہ ہی کا صیغہ ہے) اس (حالت) سے نکال دیا جس میں وہ دونوں تھے۔"
(یہاں بھی تثنیہ کا صیغہ ہے)

اب اسی آیت کا بقیہ حصہ ملاحظہ فرمائیے کہ جب ان دونوں نے یہ پھل کھا لیا تو کیسے اللہ کا ان سے خطاب اسی آیت میں تثنیہ سے بدل کر جمع کے صیغے میں شروع ہو جاتا ہے —— آخر وہ کونسا پھل تھا کہ جس نے انھیں دو سے اٹھا کر بڑھا کر جمع (عربی میں جو ہمیشہ دو سے زائد ہوتے ہیں) میں بدل دیا؟

وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ - (البقرة : ۳۶)

(اور ہم نے کہا جاؤ تم (جمع کا صیغہ) آپس میں دشمن بن جاؤ اور تمھارے لیے زمین میں ایک وقت تک رہنے کی جگہ اور سامان ہے) ایک آیت چھوڑ کر پھر کہا گیا ہے کہ تم سب کے سب (اب تو باقاعدہ جمیعًا کا لفظ استعمال ہوا ہے) اس منزل سے نکل جاؤ۔

میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ شیطان نے آدم کو ابدی بقا کا لالچ دیا تھا۔
قرآن نے کہا ہے :

فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝ (طٰهٰ : ۱۲۰)

(پس شیطان نے اُسے وسوسے میں ڈالا۔ اس نے کہا" اے آدم! کیا میں تجھے ہمیشگی کے درخت اور لازوال بادشاہی کا راستہ دکھاؤں") یہ ہمیشگی کا درخت اور لازوال بادشاہی کا راستہ کیا تھا؟ کیا یہ مقام سیب کھانے سے (اسرائیلیات کے مطابق) یا گندم کھانے سے (ہماری روایات کے مطابق) حاصل ہو سکتا تھا؟ یہ تو قرآن کے مطابق نطفے کے ذریعے نسل کشی ہی کا راستہ تھا جو خاندانی زندگی کی داغ بیل ڈالنے یا دوسرے لفظوں میں ہمیشگی اور بادشاہی کے قیام کا ایک ڈھنگ تھا۔ انسان نے اس خواہش کو جلد بازی سے پورا کرنا چاہا تھا اسی لیے اس کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ بیشک اب خاندانی سلسلہ چل نکلے گا اور یوں نسل در نسل ایک انسان اپنی اولاد کے رُوپ میں ہمیشگی پاسکے گا اور یہ نسلی سلسلہ گویا ایک بادشاہی ہو گا لیکن جنسی اختلاط کو قبل از وقت شروع کرنے کی سزا کے طور سے خاندانی دشمنیوں کا آغاز بھی ہو جائے گا۔ خاندانی دشمنیاں (بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ) خالصتاً بنی نوع انسان سے مختص ہیں، کسی دوسری نوع حیات میں خاندانی دشمنی نہیں پائی جاتی۔

قرآن حکیم نے قصۂ آدم کو جس طریقے سے بیان کیا ہے وہ تمثیلی نوعیت رکھتا ہے اور قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں بیان ہونے والے واقعات اور

مثالیں (خواہ وہ مثال کسی پیغمبر کی ہے یا مجھ کی) تمام انسانوں کے لیے غور و فکر اور رُشد و ہدایت کے لیے نشانیاں ہیں۔ قصۂ آدم میں ہمارے لیے جو رہنمائی ہے وہ یوں بیان کی جا سکتی ہے:

(۱) انسان کی تخلیق ابتداً مٹی سے ہوئی۔ تمام دوسری انواعِ حیات کی طرح وہ بھی شروع میں نفسِ واحد تھا جو بعد میں دو زوجوں میں بٹ گیا۔ پھر ایک منزل ایسی آئی (اور تخلیقِ خداوندی کی ہر منزل ہمارے حساب سے ہزاروں سالوں کی ہوتی ہے) — كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (السجدة: ۵) کہ دو زوج آپس میں جنسی اختلاط کے لائق ہو گئے اور خاندانی زندگی کی بنا پڑی۔

(۲) قصۂ آدم ہی سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ خاندانی زندگی کے قیام میں چونکہ انسان نے جلد بازی کی تھی اس لیے اسے یہ سزا دی گئی کہ باہم دشمنیاں پیدا ہو گئیں۔ لیکن اللہ نے چونکہ آدم کو اس فروگزاشت پہ بعدازاں معاف کر دیا تھا اس لیے اگر ہم خاندانی زندگی میں خدا کے قوانین کا اتباع کریں تو ہم پر خاندانی زندگی کی برائیوں کے بجائے (جن میں نسلی امتیاز سے لے کر قومیت پرستی تک شامل ہیں) امن و امان کا راستہ کھل سکتا ہے۔ قرآن میں ہے:

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (البقرة: ۳۸، ۳۷)

(پھر آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھ لیے اور اللہ اس کی جانب ملتفت ہوا۔ بے شک وہ دائم رحم کرنے والا، ملتفت ہونے والا ہے۔ پھر اللہ

نے کہا، تم سب کے سب اس منزل سے نکلو، یقیناً تمھیں میری جانب سے ہدایت پہنچے گی، اور تم میں سے جن لوگوں نے ہدایت پائی انھیں نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ محزون ہوں گے)

(۳) قصۂ آدم ہی سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عورت اور مرد باہم رفیق ہیں۔ دونوں ایک ساتھ پیدا کیے گئے ہیں اور دونوں ایک ہی "نفس" سے بھیجے ہیں، یا یوں کہیے کہ دونوں کا خمیر ایک ہے۔ ان میں سے ایک دوسرے سے، کمتر یا برتر نہیں۔ شجر ممنوعہ کا پھل کھانے میں عورت کا ہاتھ نہیں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ قرآن نے عورت کو کسی مقام پر بھی مرد سے کمتر نہیں ٹھہرایا۔ وحی جیسی نعمت سے بھی عورت کو دور نہیں رکھا۔ موسیٰ کی والدہ پر وحی کی گئی کہ فرعون کے محل میں جا کر بچے (موسیٰ) کو دودھ پلائے (القصص: ۷) مریم کو فرشتے کے ذریعے سے بتایا گیا کہ اللہ نے تجھے تمام قوموں یا جہانوں کی عورتوں میں سے ایک خاص کام کے لیے چنا ہے۔ (آل عمران: ۱۴) پھر اللہ کی جانب سے اچھے کاموں کے اجر کے سلسلے میں اکثر یہ ترکیب استعمال ہوتی ہے۔ مِن ذَکَرٍ اَوْ اُنثیٰ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ اور سورہ آل عمران میں اس ترکیب کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ بَعْضُکُمْ مِنْ بَعْضٍ (۱۹۵) یعنی نر اور مادہ میں درجے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے ہی سے پیدا ہوئے ہیں ایک جیسے، ایک ہی نوع ہیں۔ اس سلسلے میں سورہ احزاب کی ۳۵ ویں آیت خاص طور سے اہم ہے جس میں تمام انسانی خوبیوں کو مردوں اور عورتوں دونوں میں یکساں اختصاص کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور دونوں کو اللہ کے بہترین انعامات کا یکساں مستحق قرار دیا گیا ہے

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا۔

اس آیت کے مطابق اگر مرد جی جان سے مسلمان ہو سکتے ہیں تو عورتیں بھی ہو سکتی ہیں؛ اگر مرد مومن کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں تو عورتیں بھی کر سکتی ہیں - اگر مرد اللہ کے اطاعت گزار ہو سکتے ہیں تو عورتیں بھی ہو سکتی ہیں- اگر مرد صداقت کو اپنا شعار بنا سکتے ہیں تو عورتیں بھی بنا سکتی ہیں، اگر مرد صبر کا مظاہرہ کر سکتے ہیں تو عورتیں بھی کر سکتی ہیں' اگر مرد دلوں میں خدا کا خوف رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی رکھ سکتی ہیں، اگر مرد فیاض ہو سکتے ہیں تو عورتیں بھی ہو سکتی ہیں، اگر مرد روزہ گزار ہو سکتے ہیں تو عورتیں بھی ہو سکتی ہیں، اگر مرد اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کر سکتے ہیں تو عورتیں بھی کر سکتی ہیں (بلکہ مرد کے لیے بھی اپنی شرمگاہ' اپنی عصمت کی حفاظت اتنی ہی لازم ہے جتنی عورت کے لیے۔ یہ نہیں کہ مرد تو جو جا ہے جھک مارتا پھرے لیکن عورت سے اگر کوئی لغزش ہو جائے تو وہ گردن زدنی ٹھہرے' مرد اپنی عصمت کی حفاظت نہیں کریں گے تو ایک دن وہ عورتوں کی عصمت کے بھی ایسے قائل نہ رہیں گے اور یہ صورتِ حال اب تقریباً' ہمارے یہاں رائج سکہ بنتی جارہی ہے) اگر مرد اللہ کو بہت یاد رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی رکھ سکتی ہیں —— اور جو کوئی، عورت ہو یا مرد، ایسا کرے گا اللہ اس کی مغفرت کرے گا اور اسے عظیم اجر سے نوازے گا۔

خُدا نے عورتوں کو نہ صرف حقوقِ وراثت و ملکیت دیے ہیں بلکہ انہیں روپیہ کمانے کی اجازت بھی دی ہے ۔۔۔ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء: ۳۲)

ذرا اس مقام پر بائیبل کی چند سطریں بھی دیکھتے چلیں:

نیکوکار بیوی کس کو ملتی ہے کیونکہ اس کی قدر مرجان سے بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کے شوہر کے دل کو اس پر اعتماد ہے اور اسے منافع کی کمی نہ ہوگی۔ وہ اپنی عمر کے تمام ایّام میں اس سے نیکی ہی کرے گی۔ وہ اُون اور کتان ڈھونڈتی ہے اور خوشی کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے کام کرتی ہے۔ وہ سوداگروں کے جہازوں کی مانند ہے۔ وہ اپنی خورش دُور سے لے آتی ہے۔ وہ رات ہی کو اٹھ بیٹھتی ہے اور اپنے گھرانے کو کھلاتی ہے اور اپنی لونڈیوں کو کام دیتی ہے۔ وہ کسی کھیت کی بابت سوچتی ہے اور اسے خرید لیتی ہے اور اپنے ہاتھوں کے نفع سے تاکستان لگاتی ہے . . . . . وہ مضبوطی سے اپنی کمر باندھتی ہے اور اپنے بازوؤں کو مضبوط کرتی ہے۔ وہ اپنی سوداگری کو سُودمند پاتی ہے۔ رات کو اس کا چراغ نہیں بجھتا۔ وہ تکلے پر اپنے ہاتھ چلاتی ہے اور اس کے ہاتھ اٹیرن پکڑتے ہیں۔ وہ مفلسوں کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتی ہے۔ وہ اپنے گھرانے کے لیے سردیوں سے نہیں ڈرتی۔ کیونکہ اس کے خاندان میں ہر ایک کے پاس اُودی لباس ہے۔ وہ اپنے لیے نگارین بالاپوش بناتی ہے۔ اس کی پوشاک مہین کتانی اور ارغوانی ہے۔ اس کا شوہر

پھاٹکوں میں مشہور ہے جب وہ مُلک کے بزرگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ وہ مہین کتانی کپڑے بنا کر بیچتی ہے اور پٹکے سوداگروں کے حوالے کرتی ہے۔ عزت اور حرمت اس کی پوشاک ہیں اور وہ آئندہ ایام پر ہنستی ہے۔ اس کے مُنہ سے حکمت کی باتیں نکلتی ہیں۔ اس کی زبان پر شفقت کی تعلیم ہے۔ وہ اپنے گھرانے پر بخوبی نگاہ رکھتی ہے اور کاہلی کی روٹی نہیں کھاتی۔ اس کے بیٹے اُٹھتے ہیں اور اسے مُبارک کہتے ہیں۔ اس کا شوہر بھی اسکی تعریف کرتا ہے کہ بہت سی بیٹیوں نے فضیلت دکھائی لیکن تُو سب پر سبقت لے گئی۔

حُسن دھوکا اور جمال بے ثبات ہے لیکن وہ عورت جو خداوند سے ڈرتی ہے ستودہ ہو گی۔ اس کی محنت کا اجر اسے دو اور اس کے کاموں سے مجلس میں اس کی ستائش ہو۔ (امثال ب ۳۱)

عورت اور مرد کے حقوق کے سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ خدا نے مردوں کو ایک سے زیادہ شادیاں کرکے اور طلاق کی اجازت دے کر سب کیے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ انبیاء کرام کی سنت ہمیشہ سے ایک ہی شادی کی چلی آ رہی ہے۔ خود رسول اللہ صلعم نے حضرت خدیجہ کی زندگی بھر دوسری شادی نہ کی۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ آپؐ کی نسل حضرت خدیجہ ہی کی اولاد سے چلی۔ حضرت ابراہیم کی دو بیویاں مشہور ہیں لیکن قرآن نے دو کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ البتہ خود اللہ تعالےٰ نے ہنگامی حالات کے تحت ایک سے زاید شادی کی اجازت دی اور وہ بھی عدل کر سکنے کی شرط کے ساتھ۔ قرآن حکیم میں صرف ایک جگہ ایک

آیت میں ایک سے زائد شادی کی اجازت بیان ہوئی ہے اور یہ آیت کوئی الگ آیت نہیں بلکہ یوں شروع ہوتی ہے :

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۔

(اور اگر تمھیں خوف ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کرسکو گے تو (ان یتیم) عورتوں میں سے جو تمھیں پسند ہوں اُن سے نکاح کرلو، دو یا تین یا چار (کی حد تک)

— اور یہ آیت یوں آگے چلتی ہے :

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۔ (النساء : ۳)

(لیکن اگر تمھیں خوف ہو کہ انصاف نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی کرو یا ان میں سے کسی سے کرلو جو تمھارے قبضے میں ہیں، یعنی جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں میں سے — اور اغلب یہی ہے کہ تم انصاف نہ کرسکو گے)

ظاہر ہے یہ حکم ایسے جنگی حالات یا دوسرے ایسے ملکی حالات تک محدود ہے جب عورتیں مردوں سے تعداد میں زیادہ ہوجائیں اور معاشرے میں بداخلاقی پھیلنے یا یتیموں کی مناسب پرورش نہ ہونے کے امکانات ہوں۔ جہاں تک لونڈی سے شادی کا تعلق ہے اس کی بھی باقاعدہ نکاح کے بغیر اجازت نہیں اور ان پر بھی وہی انصاف کا عام قانون نافذ ہوگا اور چونکہ خدا نے خود ہی کہہ دیا ہے کہ انصاف کرنا مشکل ہے۔ (مزید دیکھیے : النساء : ۱۲۹ - ۱۲۸) ان آیات کی رو سے دوسری

شادی کرنے سے پہلے پہلی بیوی کی اجازت بھی لازم ٹھہرتی ہے اور یہ شادی نفسانی خواہشات کی بنا پر نہیں بلکہ تقوٰی یعنی یتیموں اور بیواؤں کو معاشرے میں کھپانے کے لیے ہی ہو سکتی ہے ــــ اس لیے قانون کی حد تک شادی ایک ہی ٹھہرتی ہے - اب یہ کام کسی فرد کا نہیں کہ وہ جن حالات کو چاہے ہنگامی قرار دے کر ایک سے زاید شادیاں کرلے، یا جتنی لونڈیاں چاہے گھر میں ڈال لے - لونڈی کے لیے بھی مومنہ ہونا شرط ہے اور اس سے نکاح کی صرف اسی وقت اجازت ہے جب اس کے سرپرستوں سے اجازت لے لی جائے - لونڈیوں کو بھی معروف طریقے سے مہر ادا کرنے کا حکم ہے تاکہ وہ بھی محصنٰت بن کر (آزاد مسلمان عورتوں کی طرح حصارِ نکاح میں محفوظ) رہ سکیں اور آزادانہ شہوت رانی نہ کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں - (النساء : ۲۵)

جہاں تک تعدد ازواج کی حدود کا تعلق ہے جو لوگ اس حکم کو یتیموں اور بیواؤں (اور ملتے جلتے اُمور) تک محدود نہیں سمجھتے اور چار شادیوں کی اجازت عام جانتے ہیں، ذرا وہ قرآن کے اس بیان کو بھی ذہن میں رکھیں :

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ - (النساء : ۱۲۷)

(اور وہ عورتوں کے بارے میں فیصلہ چاہتے ہیں - اے نبی، آپ کہہ دیں، ان کے بارے میں اللہ تمھیں اپنا فیصلہ بتاتا ہے اور جو کچھ کتاب سے تمھیں پڑھ کر

سنایا جاتا ہے وہ ان یتیم عورتوں کے بارے میں ہے جنھیں تم ان کا حق نہیں دیتے، اور نہ ہی تم ان سے نکاح کرنے پر راغب ہوتے ہو اور ان بچوں کے بارے میں جو کمزور و بے سہارا ہیں۔ اور چاہیے یہ کہ تم یتیموں سے انصاف کرو

اب اگر قرآن کی موجودہ ترتیب رسول اللہ ہی کے ہاتھوں دی گئی ہے اور قرآن اس بات کا واضح گواہ ہے تو اس بیان سے پہلے کتاب میں آئے ہوئے یتیموں کے ساتھ انصاف کرنے والے حصّے اسی سورۃ النساء کے وہی حصّے ہیں جن کے ذریعے ایک سے زائد شادی کرنے کی مشروط اجازت ملی ہے۔

اس بحث کا ایک پہلو اور ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ حاصل ہے۔ آخر یہ درجہ کیا ہے۔ کیا اس درجے سے مُراد یہ ہے کہ مرد عورتوں سے برتر ہیں۔ اللہ نے اس درجے کی ایک مقام پر مفصل وضاحت کی ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ (النساء: ۳۴)

(مرد عورتوں کے قوّام ہیں اس لیے کہ اللہ نے بعض انسانوں کو بعض انسانوں پر فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں)

قوّام کا مطلب سیدھا سادا تو یہ ہو سکتا ہے کہ مرد چونکہ خاندانی زندگی کا بوجھ اُٹھاتے ہیں اس لیے وہ عورتوں کے قوّام ہیں اور اس طرف اسی آیت

میں مال خرچنے کا ذکر کر کے اشارہ بھی کر دیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے:
لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (النساء۳۲)
(اس کی تمنا نہ کرو جس سے اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی)
بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ کی ترکیب قرآن میں بار بار استعمال ہوئی ہے اور انہی الفاظ میں اُوپر والی آیت (النساء: ۳۴) میں یہ موجود ہے۔ اس سے ان معنی میں استعمال نہیں کیا جا سکتا کہ بعض یعنی مردوں کو بعض یعنی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مردوں کو قوّام بنایا ہے۔ اور یہ ایک ایسی فضیلت ہے جیسی وہ کئی دوسرے معاملوں میں بعض کو بعض پر دیتا ہے۔ اب کیا عورتوں کو مردوں پر یہ فضیلت حاصل نہیں کہ وہ بچے پیدا کر سکتی ہیں اور مرد نہیں کر سکتے۔ دورِ حاضر میں ماہرینِ حیاتیات نے حیاتیاتی انداز نظر سے عورتوں کو مردوں سے کہیں برتر ثابت کیا ہے (مثلاً ملاحظہ ہو: ایشلے مانٹیگو کی کتاب، عورتوں کی فطری برتری) اسی طرح کی مخصوص فضیلتوں کے بارے میں اللہ نے عورتوں اور مردوں کو منع کیا ہے کہ ان کی تمنا فضول ہے۔ لیکن پھر قوّام کا مطلب اگر محض اتنا ہی ہو کہ مرد عورتوں پر خرچ کرتے ہیں یا کنبے کی پرورش کا سامان کرتے ہیں تو کیا عورتیں اس لائق نہیں۔ کیا ہمیں وہ مائیں یاد نہیں جو چکیاں پیس پیس کر بھی بچوں کو پالتی ہیں۔ وہ عورتیں جن کے خاوند یا سرپرست مر جاتے ہیں، یا جن کی شادیاں ہی نہیں ہوتیں، کیا وہ مردوں کے مال پر گزارہ کرتی ہیں؟ پھر قرآن حکیم نے عورت کو کمانے سے منع نہیں کیا، وراثت اور ملکیت کے حقوق دیے ہیں، وہ اپنا مال مردوں کو دینے کی مختار ہے، وہ مہر کی رقم چاہے تو

مردوں کو بخش سکتی ہے، وہ آخر قوام کیوں نہیں ہو سکتی۔ اس فضیلت کے حق دار صرف مرد ہی کیوں ٹھہرتے ہیں؟

انسانی زندگی کا تانا بانا خاندان کے گرد گھومتا ہے۔ خاندان کی ابتداء عورت اور مرد کے ملاپ یا نطفے کے ذریعے نسل کشی سے ہوتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کسی خاندان کے لیے لازم ہے کہ وہ ایک مرد کے نطفے سے پھوٹے۔ عورت میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ کسی بھی مرد سے حاملہ ہو جائے۔ مرد میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ کسی بھی عورت کو حاملہ کر دے۔ ایک عورت کے کئی خاوند ہوں تو کوئی پہچان نہیں ہو سکتی کہ کونسا بچہ کس مرد کا ہے۔ لیکن مرد کی ایک یا خاص حالات میں چار تک بیویوں میں اس قباحت کا امکان نہیں مگر پہلی صورت میں خاندانی زندگی کا تانا بانا بکھر جائے گا۔ اسی تانے بانے کو ایک معین حیاتیاتی اور اخلاقی راستے پر ڈالنے کے لیے خدا نے انسانوں کیلئے شادی کو شرف قبول بخشا ہے اور اس رشتے کی صحت اور ہمواری کے لیے قرآن میں واضح احکام صادر کیے ہیں تاکہ خاندان کے باہمی رشتوں کی بنیادیں لڑکھڑا نہ جائیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مرد خاندان کے توازن کو قائم کرتے ہیں کیونکہ نکاح کی گرہ ان کے ہاتھ میں دی گئی ہے اور اولاد کو انھی کے نام سے پھولنا پھلنا ہے اور وہ سیدھے راستے پر گامزن رکھتے ہوئے عورتوں کے قوام ہونے کا درجہ حاصل کرتے ہیں۔ قوام کے ساتھ انصاف کی شرط خود خدا ہی نے لگائی ہے۔ (النساء : ۱۳۵ ، المائدہ : ۸)

یہ بحث لمبی ہوگئی ہے لیکن اس کی میری نظر میں شدید ضرورت تھی۔ انسانی زندگی میں چند خیالات نے ایسی ہمہ گیر اہمیت اختیار کر رکھی ہے کہ ان کا اثر نسل در نسل

انسانوں پر پڑتا چلا آ رہا ہے۔ قصۂ آدم میں اسرائیلیات کی رُو سے عورت کی گنہ گاری اور عیسائیت کی رُو سے ازلی گناہ ایسے تصوّرات ہیں جو دُور رس معاشرتی اور اخلاقی، نفسیاتی اور روحانی نتائج مرتب کرتے رہے ہیں، کر رہے ہیں اور کرتے چلے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس بحث کا آغاز بنیادی عقائد اور تصوّرات سے کیا ہے۔ ہمارے یہاں لاکھ عائلی اور خاندانی قوانین بنیں، ان میں لاکھ اصلاحیں ہوں، ان کے لیے لاکھ عدالتیں ہوں، جب تک ہم اپنے اندر جڑ پکڑے ہوئے تصوّرات پر گہری نظر ڈال کر ان میں سے کھرے کھوٹے کی پہچان نہیں کرتے تب تک ہم ان قوانین پر دل سے راضی نہ ہوں گے، ان کے خلاف احتجاج کریں گے، ردِ عمل کریں گے، ہماری خاندانی زندگی سے خوف اور حزن و ملال کی گھٹائیں نہ چھٹیں گی۔ اطمینان کی منزل تو اسی صورت نصیب ہوتی ہے کہ ذہن کے ساتھ ساتھ انسان کا دل بھی بھلائی کا طالب ہو اور یوں کتاب (یا قانون) اور حکمت گھل مل کر انسان کے انفرادی اور معاشرتی وجود کی رُوح رواں بن جائیں۔

حنیف رامے کی ایک اور کتاب



دب اکبر

(مضامین)

اس مجموعے میں حنیف رامے کے آٹھ سیر حاصل مضامین شامل ہیں :

" **دب اکبر** " انسانی زندگی میں دوستی کے اصول کی معنویت پر بحث کرتا ہے ۔

" **ایمان — سر چشمۂ عمل** " ایمان کی اولین اہمیت کو اجاگر کرتا ہے ۔

" **اسلام کی امید** " دین ، علم اور فن کی کڑیاں ملاتا ہے ۔

" **فن کی ولادت** " تخلیق کے عمل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے ۔

" **فن کار کا زینۂ پہچان** " فن کے مدارج بیان کرتا ہے ۔

" **فن کار اور معاشرہ** " فن کار اور معاشرے کے تعلق پر روشنی ڈالتا ہے ۔

" **سامری کا بچھڑا اور بندھے ہوئے ہاتھ** " سیاسی جماعتوں کے جواز کا سوال اٹھاتا ہے ۔

" **صف آرائی امن اور ہم** " امریکی خارجہ پالیسی اور پاکستان کے دفاع کے آتشیں مسئلے کا جائزہ لیتا ہے ۔

ان مضامین کا مطالعہ دین ، فن اور سیاست کے نئے آفاق پر مضبوط کمند ڈالنے کا حکم رکھتا ہے ۔

مکتبۂ جدید ، لاہور